بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعلق مع اللہ

مرتب

الفقیر اِلی اللہ تعالیٰ

بلقیس اظہر

جماعت عائشہؓ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعلق مع اللہ

مرتب:
الفقیر اِلی اللہ تعالیٰ
بلقیس اظہر
جماعت عائشہؓ

نمبر شمار	فہرست مضامین	صفحہ نمبر
1	ترجیح اوّل	3
2	ہدایت اور یقین کا تعلق	9
3	قدردان	12
4	اشرف المخلوقات	16
5	تعلق مع اللہ	21
6	اطاعت الٰہی	26
7	رضائے الٰہی	30
8	معرفت الٰہی	36
9	ذکر الٰہی (حصہ اوّل)	41
10	فضائل ذکر الٰہی (حصہ دوم)	46
11	قرب الٰہی	49
12	توفیق الٰہی	54
13	یادِ الٰہی	58
14	دیدار الٰہی	62
15	مظہر ذات الٰہی (کائنات)	66
16	فضلِ الٰہی	70
17	خشیت الٰہی	74
18	محبت اور مذہب	81
19	اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے	86
20	اسلام اور کفر	91
21	عابد اور معبود کے درمیان رشتہ (عبادت)	94
22	شب بیداری	97
23	تواضع	102
24	اخلاص	106

ترجیح اوّل

سب سے بڑی بدقسمتی اس وقت ایک مسلمان کی یہ ہے کہ وہ کم تر اور کم اہم معاملات کو بڑی ترجیح دیتا ہے اور اعلٰی ترین ترجیح کو کم تر درجے پر رکھتا ہے۔ ہم مسلمان ہیں مسلمان کا مطلب اللہ کو ماننے والا اور مومن اللہ کی ماننے والا ہوتا ہے۔ ہمارا مذہب اسلام ہے اسلام ایک آسان ترین مذہب ہے۔

1-اس میں کسی قسم کی ریاضت اور مجاہدہ کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلکہ حدیث مبارکہ میں ہے:-

ترجمہ:" کچھ لوگ نرم اور گرم بستروں پر بیٹھ کر اللہ کو یاد کریں گے اور جنت کے بالا خانوں میں پہنچ جائیں گے "۔(صحیح ابن حبان 309/1، حدیث 401)

اب ظاہر ہے کہ نرم اور گرم بستروں پر بیٹھ کر سوائے ذکر اللہ کے اور کون سی عبادت ہوسکتی ہے؟

2- اسلام ہمیں ترک دنیا کے لیے نہیں کہتا بلکہ ترک دنیا حرام ہے-

لا رھبانیت فی الاسلام۔۔۔۔اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔(فتح الباری 9:111، قرطبی الجامع الاحکام القرآن، 18:87)

لا سرورۃ فی الاسلام۔۔۔۔اسلام میں فاقہ نہیں ہے (یعنی فاقہ کرنا منع ہے)

سورۃ الذاریات، آیت نمبر 56 میں مقصد حیات بتادیا ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ "میں نے جن اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا"۔

ہم لوگ جس طرح یہ زندگی گزار رہے ہیں یہ ہندوؤں کا طریقہ ہے- ہندوؤں نے زندگی کو چار زمانوں میں بانٹ رکھا ہے یعنی زندگی کے چار دور بنائے ہیں ---پہلا دور 20 سال تک پڑھنا، پڑھنا لکھنا سیکھنا---اس کے بعد 20 سال سروس بیوی بچے کام کاج---اس کے بعد 20 سال بڑے عہدوں کی دوڑ، آگے نکلنے کے لیے کوشش---اب آخری زمانہ آگیا، اب جنگل پکڑلو، رام رام کرو، اب اپنے رام کو یاد کرلو۔

ہم مسلمان ہیں ہمیں شروع ہی سے اللہ کی ذات کو اول ترجیح دینی چاہیے-ترجیح کی بات یہ ہے کہ ہم ذات باری تعالی کو اول درجے پر رکھیں اور باقی تمام دنیا اور دنیا کی تمام چیزیں اللہ تعالی کی ذات کے توسط سے لیں تو یہ ٹھیک طریقہ ہوگا- جو آخرت کو اول ترجیح دے گا اللہ اس کے دنیا کے کام خود سنبھال لیتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک آدمی نے ایک گلی سڑی چیز صدقے کے طور پر دی۔ پاس سے ایک بزرگ گزر رہے تھے۔ انہوں نے کہا" دیکھو دوست اگر تم اللہ کے لیے بہترین چیز نہیں دے سکتے تو نہ دو، کم ازکم درمیانے درجے کی چیز تو دو"-اب اگر ہم اللہ تعالی کو ابتدائی عمر نہیں دے سکتے تو کم ازکم اپنی عقل وشعور والی درمیانی عمر تو دے دیں۔ جب سماعت نہ رہی، بال سفید ہوگئے، بدن میں طاقت نہ رہی، دنیا نے ہمیں ریٹائرڈ کردیا پھر سوچا کہ اللہ کے پاس ہی جانا ہے اب اللہ اللہ کرلیتے ہیں-یہ توہین ذات پروردگار ہے جب رب نے سب کچھ دیا، جوانی میں اس کو بھولے رہے۔ جب دنیا ختم ہونے کو آئی تو رب یاد آگیا-

یاد رکھیں! جو دنیا کو ترجیح دیتا ہے اللہ اس کو دنیا کے حوالے کردیتا ہے پھر بھی دنیا اس کو اتنی ہی ملتی ہے جتنی اس کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔ اللہ ہمیں اپنی طرف آنے کے راستے بتاتا ہے- وہ ہم سے کسی قسم کا تقاضہ نہیں کرتا کیونکہ وہ بے نیاز ہے- ہماری یہ توجہ الی اللہ یا عبادت ہمارے ہی کام آئے گی اس کی عظمت کو نہیں بڑھا سکتی۔ ہمیں ذہنی طور پر اس قابل ہونا چاہیے کہ ہم از خود یہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالی ترجیح اول ہے اور اس کے لیے کسی چیز کی ضرورت نہیں- بس خالق کائنات کے احسانات کو دیکھیں۔ اپنی ذات کے اندر اور باہر، اپنے اردگرد، اپنے اوپر نیچے دیکھیں اور دیکھیں کہ حق تعالی شانہ نے یہ دنیا اور اس کی تمام چیزیں میرے لیے بنائی ہیں اور پھر کہیں کہ "باری تعالی میں نے تجھے ترجیح اول سمجھ لیا ہے- اب مجھے توفیق دینا کہ اس ترجیح اول کو برقرار رکھ سکوں"-عمل کی توفیق اس وقت ہوگی جب ہم دل سے اس ترجیح کے لیے کوشش کریں گے لیکن زبان سے کہنے کی بھی اپنی جگہ ایک اہمیت ہے- ایک مقام ہے-

رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے ایک بڑی پیاری بات بیان فرمائی ہے کہ زبان سے کہنے کا بھی اثر ہوتا ہے- بس من میں رب تعالی سمایا ہوا ہو۔ فرمایا" جس نے زبان سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا اور مرتے دم تک اس پر قائم رہا (یقین کے ساتھ) تو جنت اس پر واجب ہوگئی"----یعنی زبان سے اقرار اور اس پر دل سے یقین پر قائم رہنا ہمیں منافق نہیں رہنے دے گا۔ یعنی اگر انسان کلمہ پڑھنے کے بعد (دل سے یقین کرے) اور پھر تمام عمر فرائض کی ادائیگی کی کوشش کرتا رہے۔ زندگی میں گناہ تو ہوتے ہی رہتے ہیں، اگر حقوق العباد ٹھیک ہیں، حقوق العباد میں کوتاہی نہیں۔ تو چھوٹے موٹے گناہ اللہ اپنے کرم سے معاف کردے گا۔ اور آپ خاتم النبیین ﷺ کی شفاعت کے بعد جنت میں چلا جائے گا (مومن آخر کار جنت میں جائے گا) اس لیے کہ گناہ گار معاف کیے جائیں گے- گستاخ جہنم میں جائیں گے -" گستاخ کون"؟ جو نیکی کی طرف بلانے والے کو ٹکا سا جواب دیں- "اپنی نیڑ (یعنی اپنے بارے میں سوچ) تجھے اپنی قبر میں جانا ہے"۔ اللہ تعالی تمام مہربانوں سے

زیادہ مہربان---تمام کریموں سے زیادہ کریم---تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا۔اس نے ہمارے نفوس کو بنایا ہے۔ہمیں سخت بھوک لگی ہے۔نماز تیار ہے۔اللہ تعالی کا حکم ہے پہلے کھانا کھا لو۔ بعد میں مجھے یاد کر لینا۔وہ ہم پر جبر نہیں کرتا اگر ہم اسے اول ترجیح دیں گے تو وہ ہمارے لیے اور زیادہ آسانیاں پیدا کرتا چلا جائے گا-

قرآن پاک، سورہ الشوری، آیت نمبر 20: ترجمہ:"جس کا ارادہ آخرت کی کھیتی کا ہو ہم اسے اس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کی طلب رکھتا ہو ہم اسے اس میں سے کچھ دے دیں گے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں"-

تو ہم اللہ سے دور ہٹ کر یا اس ترجیح کو ترک کر کے کبھی سکون نہیں پا سکتے - دنیا میں دل لگا لیا جائے۔ دنیا ہی کے لیے سب کچھ کیا جائے تو درجہ اقتدار تو حاصل ہو جائے گا لیکن دل کو سکون حاصل نہیں ہو گا۔

قرآن پاک، سورہ ق، آیت نمبر 16 أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ترجمہ:"ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں"-

یقین کیجئے کہ اللہ تعالی ہماری رگوں سے بھی زیادہ قریب ہے جب بھی کسی انسان کا دل اس کی طرف مائل ہوتا ہے۔وہ ذات باری تعالی کو اپنی طرف متوجہ پاتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنھما نے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے پوچھا کہ "اللہ تعالی کہاں ہیں زمین میں یا آسمان میں"؟ تو نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا"اللہ تعالی اپنے مومن بندوں کے دلوں میں ہے"-(احیا العلوم۔امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ)

اگر کسی کے دل میں اس کی محبت کے علاوہ کسی اور کی محبت ہے تو وہ وہاں نہیں سمائے گا۔یعنی اگر کوئی اپنے دل میں اپنی اولاد کی محبت رکھتا ہے، مال کی محبت رکھتا ہے، جان کی محبت رکھتا ہے اور مصرف دنیا کے لیے یہ کرتا ہے تو ٹھیک ہے لیکن محبت دنیا نہ ہو اور اس کے نزدیک اللہ تعالی ترجیح اول ہو تو اس دل میں اللہ سما جائے گا- کہنے کو تو سب ہی کہتے ہیں ہمیں اللہ سے سب سے زیادہ محبت ہے لیکن وہ خالق دلوں کی محبت کو جان سکتا ہے کہ کون سچا ہے؟ وہ صرف قلب عبداللہ ہی میں سما جاتا ہے-یعنی ایک لامحدود ہستی جو کہیں نہیں سما سکتی نہ آسمانوں میں نہ زمینوں میں نہ عرش پر۔وہ قلب عبداللہ میں سما جاتی ہے-بس اپنے من میں رب کو بسا لو بات بن جائے گی۔

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی، جذبہ و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے

اسلام اعتدال پسند دین ہے اور اعتدال کی زندگی بسر کرنے کا دوسرا نام تصوف ہے۔اعتدال--- جو شاید دنیا کا مشکل ترین کام ہے مگر ہم نے اللہ تعالی کی تلاش کو نارمل اور اعتدال کی تلاش سے نکل کر اسے مافوق الفطرت حرکات کا نتیجہ قرار دے دیا ہے- معاذ اللہ! ہم نے اللہ کو شاید مافوق الفطرت مخلوق سمجھ کر اس کے لیے چلہ کشی شروع کر دی ہے جب کہ وہی اللہ کہہ رہا ہے کہ "لا رھبانیت فی الاسلام---لا سرورۃ فی الاسلام"

اسلام ایسا ہی ہے جیسا نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے ہمیں بتایا اور اللہ اسی طرح ملتا ہے کہ جس اعتدال سے اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ نے اللہ کو پایا۔ جس اعتدال سے صحابہ رضی اللہ تعالی عنہ، تابعین اور تبع تابعین نے اللہ کو پایا۔آج بھی اصول عاشقی وہی ہیں جو نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے دور میں تھے-اللہ تعالی سے محبت کرنے کا کوئی قرینہ نہیں بدلا- اتباع رسول خاتم النبیین ﷺ اس کا واحد راستہ ہے اور اسوہ حسنہ اس کا طریقہ۔اللہ بندے کے اخلاص کو دیکھتا ہے۔اپنی ذات کے محاسبے اور اعتدال سے اس کی طرف بڑھنے کے بعد عرفان خداوندی حاصل ہو جاتا ہے۔اعتدال کیسے ممکن ہے؟ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اعتدال صرف علم سے ممکن ہے۔اللہ تعالی کے ہاں بندوں کے درجات، معجزات اور کرامات پر مبنی نہیں ہوتے - بلکہ سورہ النحل آیت نمبر 43 میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ترجمہ:"اگر تمہیں کچھ معلوم نہیں تو علم والوں سے پوچھ لو"۔

اس کے بعد سورہ یوسف آیت نمبر 76 میں وہ فرماتا ہے: نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَّن نَّشَاءُ ترجمہ: "میں جس کو چاہتا ہوں اس کے درجات بلند کر دیتا ہوں"۔

پھر سورہ یوسف آیت نمبر 76 میں فرمایا کہ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ترجمہ "ہر علم والے کے اوپر ایک علم والا ہے"-

بار بار پروردگار نے اساس علم کے تجسس اور غور و فکر کرنے میں ہمیں دعوت دی ہے۔اپنے بہترین بندوں کے لیے سورہ الحجرات، آیت نمبر 13 میں ارشاد ہے:

اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَاللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ ترجمہ:"تمہارے لوگوں میں سے میرے نزدیک عزت والا وہ ہے جو تقوی والا ہے"۔

پھر سورہ آل عمران، آیت نمبر 191 میں ارشاد فرمایا: الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ

ترجمہ:"وہ جو کھڑے بیٹھے اور کروٹوں کے بل مجھے یاد کرتے ہیں"۔مگر ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا (سورہ آل عمران آیت نمبر 191)

وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ترجمہ:"اور زمین وآسمان کی تخلیق پر غور وفکر کرتے ہیں"۔

تو درجات بڑھتے ہیں تقوی سے۔جس کے لیے فرائض کے ساتھ ذکر الٰہی اور پھر تفکر اور تدبر پر زور دیا گیا ہے اور یہ سب کچھ ہمیں علم بتاتا ہے۔

حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:"جس نے علم کی تلاش کی تو وہ تلاش گزشتہ گناہوں کے لیے کفارہ ہے"۔(جامع ترمذی)

علم تو اس وقت پورے کا پورا مدینے میں ہی تھا پھر آپ خاتم النبیین ﷺ کس علم کی تلاش کی ترغیب دے رہے ہیں؟ دراصل یہ وہ علم حقائق ہیں جو پوری دنیا میں ہیں۔ارد گرد ہمارے آس پاس پوری دنیا، پوری کائنات میں بکھرا پڑا ہے۔دنیا بھر کے علم ٹیکنالوجی کا علم بھی ہے یعنی پہلے دین کا علم اس کے بعد دنیا کا علم۔

اللہ تعالی پہلا عالم ہے، اللہ سب سے بڑا فیاض ہے اور اللہ تعالی کی سب سے بڑی فیاضی یہ ہے کہ اس نے انسان کو علم اور قلم عطا کیا۔اللہ تعالی کے بعد عالم نبی کریم خاتم النبیین ﷺ ہیں۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے ہمیں آگ سے بچنے کے اصول دیے۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے ہمیں جنت میں داخلے کے طریقے بتا دیے اور پھر آپ خاتم النبیین ﷺ کے بعد وہ عالم ہے جو لوگوں کو اللہ تعالی کے لیے علم دے۔اللہ کے لیے تعلیم دے اور ان سے صلہ طلب نہ کرے۔

علمیت کی جب ہم انتہا دیکھتے ہیں تو علم تین قسم کے فیصلے کرتا ہے:

1۔یہ ماضی میں کی گئی غلطیوں اور خوبیوں کو دفع کرتا ہے۔ 2۔یہ معاملات حاضرہ کو حل کرتا ہے موجودہ کے لیے باعث رحمت ہے یعنی یہ منزل کی شناخت کرا دیتا ہے۔

3۔یہی علم ہمیں اپنے انجام کی منزل آخیر تک پہنچاتا ہے۔علم کے نزدیک یہ دنیا آخری دنیا نہیں فانی دنیا ہے۔

یہ تمام باتیں ہمیں علم دیتا ہے اور ہمیں یہ باتیں عالم کے سوا کون سکھا سکتا ہے؟ جس دنیا سے ہم گزر رہے ہیں یہ عارضی ہے---فانی ہے---قلیل ہے---لہو لعب ہے---جلد ختم ہونے والی ہے--یہ مقام عمل ہے جو عمل کرنا ہے آج ہی کرنا ہے اور یہ کہ دنیا کل تین دن ہے:

1۔ایک کل جو گزر گیا تو دیکھ کہ تو نے اس میں کیا کیا تھا؟ 2۔ ایک آج جو گزر رہا ہے تو دیکھ تو اس میں آج کیا کر رہا ہے؟

3۔ایک کل جو آنے والا ہے اور معلوم نہیں ہے کہ وہ آئے گا بھی کہ نہیں۔

یعنی گزشتہ کل ایک عبرت ہے---موجودہ وقت موجودہ دن غنیمت اور آنے والا کل ایک خیالی چیز ہے۔تو یہ تمام کام عالم کے ہیں کہ وہ لوگوں کو علم سکھائے اور آگاہی دے۔

سب سے بڑی بات اس میں یہ ہے کہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے طریقے کی اتباع کی جائے۔آپ خاتم النبیین ﷺ کے انداز فکر کو اپنایا جائے۔

بدقسمتی سے ہم نے صحیح علم کے بجائے تصوراتی، سنی سنائی باتوں، غیر معروف دقیانوسی خیال کو بنیاد بنا کر تمام تصوف کو جادوگری بنا دیا۔اور اعتدال کو ہم نے انتہا پسندی کا نام دے دیا۔ہمارے نزدیک کائنات میں علم کا سب سے بڑا خزانہ کتاب اللہ ہے۔اور یہ صرف علم والے ہی بتا سکتے ہیں کہ کتاب اللہ میں کیا خزانہ پوشیدہ ہے (کتاب کا خزانہ)۔کیا یہ کسی غیر معتدل انداز میں رکھا گیا ہے؟ یا کسی انتہا پسندی میں رکھا گیا ہے؟ یا پھر اصل زندگی کی صحیح نشاندہی کرنے والا ہے۔**یہ علم والے جان لیتے ہیں کہ کتاب اللہ میں بہترین علم بہترین تناسب میں رکھا گیا ہے۔**قرآن پاک اور تفسیر قرآن (رسول پاک خاتم النبیین ﷺ) وجود علم کو ایک بنیادی اصول فراہم **کرتے ہیں وہ یہ کہ جوں جوں کسی کا علم بہتر ہوتا جاتا ہے توں توں وہ اعتدال کو بڑھتا جاتا ہے اور یہ تفکر اور تدبر سے ممکن ہوتا ہے۔**

مسلم شریف کی آٹھ ملحقہ احادیث ہیں اور تمام احادیث کا صرف ایک مقصد ہے کہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا"اعتدال اختیار کرو۔اگر مکمل اعتدال حاصل نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کے قریب ترین رہو"۔جب داخلی توازن حاصل ہو جائے گا۔جب اللہ کی ذات کسی وجود کی اول ترجیح ہو جائے گی تو بات سمجھ میں آنے لگے گی۔خوش قسمت ہیں قلب سلیم اور قلب منیب رکھنے والے لوگ۔

مثلاً قران پاک میں نماز کا بھی ذکر ہے اور زکوۃ کا بھی۔مگر اس کے ساتھ ایک بہت بڑی بات بھی ہے وہ یہ ہے کہ کتاب کی تلاوت کرو۔یہ تمہیں بتائے گی کہ اللہ تعالی نے تمہیں کیا کیا احکامات دیے ہیں۔کن کاموں کو کرنے کے لیے کہا اور کن باتوں سے منع فرمایا ہے۔نماز قائم کرو۔یہ تمہیں منکرات اور فحاشی سے روکے گی۔اس کے بعد کہا لیکن ہماری یاد تو سب سے بڑی چیز ہے۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ نماز اور روزے پر اتنا زور نہیں ہے کہ جتنا ذکر اللہ پر ہے۔تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کب تک پرائمری

کلاس میں کھڑے رہیں گے؟ جو شخص مسلمان ہے کیا وہ نہیں جانتا کہ نماز اور روزہ کے بغیر مسلمان نہیں ہے۔ ہمارے پاس وقت کم ہے اور اس کم وقت میں ہم نے اپنے مقصد کو حاصل کرنا ہے۔

حدیث: ایک آدمی نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول (خاتم النبیین ﷺ)! میرے لیے شرائع اسلام (عبادات، احکام وقوانین) بکثرت ہیں۔تو کوئی ایسی چیز مجھے بتا دیں جس پر میں مضبوط جما رہوں۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "تمہاری زبان ہر وقت اللہ کے ذکر سے تر رہے"۔(ترمذی 3375، ابن ماجہ 3793، مسند احمد 5411، مشکوۃ 2279)

جس شریعت میں اللہ کی خواہش اور خیال نہیں۔جس شریعت کے پیچھے حصول خداوندی کی تڑپ اور محبت کی چاشنی نہیں۔اللہ تعالی کی طلب اور جستجو نہیں۔دوست تک پہنچنے کی کوفت نہیں۔وہ محض طریقہ ہے-- عادت ہے-- رواج ہے اور اس سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔نماز اور روزہ تو ہمارا ابتدائی سبق ہے۔اور ذکر یعنی یاد۔یہ نماز اور روزے میں بھی ہے اور ہر وقت ہونی چاہیے۔**ایک ہے صورت عبادت اور ایک ہے حقیقت عبادت۔**

اب دیکھیے آج کل لاکھوں حاجی دنیا بھر سے حج کرنے کے لیے آتے ہیں لیکن کیسے مسلمان ہیں کہ ان میں نہ اتفاق ہے نہ اتحاد۔اب بظاہر تو صورت عبادت بنی ہوئی ہے لیکن عبادت کی روح مفلوج ہوگئی ہے-عبادت سے جو حقیقت مقصود ہے وہ حاصل نہیں۔عبادت سے رضائے الٰہی مقصود ہے۔اور رب کو راضی کرنے کے لیے تمام احکامات کی بجا آوری ضروری ہے۔اور مسلمان آج صرف عبادت کرتے ہیں اور اسی کو اپنے لیے کافی سمجھ بیٹھے ہیں۔**صرف صورت عبادت سے بات نہیں بنتی جب تک روح میں اللہ تعالی کی محبت اور اس کے احکامات کی پوری طرح بجا آوری کا جذبہ نہ ہو۔جب تک عبادت میں اخلاص اور اس کی ذات پر مر مٹنے کا جذبہ نہ ہو بات نہیں بنتی**-اللہ تعالی ہمیں نظر نہیں آتا۔کوئی بات نہیں اس کو نظر آنا بھی نہیں چاہیے۔اس کو کوئی دیکھ بھی نہیں سکتا۔نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا کہ "اللہ تعالی کا ایک حجاب نور ہے۔اگر وہ اس حجاب کو ہٹا دے تو ساری کائنات جل کر خاک ہو جائے"-(صحیح مسلم۔حدیث نمبر 445) اسی لیے ہم اپنی استطاعت سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

ابو امامہ رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ کسی یہودی عالم نے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے سوال کیا" کون سا قطعہ زمین بہتر ہے؟" آپ خاتم النبیین ﷺ خاموش ہو گئے اور فرمایا" میں جبرائیل علیہ السلام کے آنے تک خاموش رہوں گا" - آپ خاتم النبیین ﷺ خاموش رہے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے دریافت کیا تو انہوں نے کہا"مسئول سائل سے زیادہ نہیں جانتا، لیکن میں اپنے رب تبارک وتعالی سے دریافت کروں گا"۔پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا" محمد خاتم النبیین ﷺ میں اللہ کے اتنا قریب ہوا کہ میں اس سے پہلے اتنا قریب نہیں ہوا"۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے پوچھا" جبرائیل وہ قریب ہونا کیسا تھا؟" حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا" میرے اور اللہ کے درمیان 70 ہزار پردے تھے"- اللہ تعالی نے فرمایا" بدترین مقامات بازار اور بہترین مقامات مساجد ہیں"-(مشکوۃ المصابیح، حدیث نمبر 741)

اللہ تعالی ہماری نظروں سے اوجھل ہے لیکن اگر ہمیں نظر نہیں آتا تو ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو ہمیں نظر نہیں آتی-لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ ہیں-مثلاً ہوا ہمیں نظر نہیں آتی مگر کون سی ایسی کیفیت ہوا ہے جو ہم محسوس نہیں کر سکتے-صبح کی شبنمی ہوا-- ہلکی ٹھنڈی ہوا بادصبا-- صحراؤں میں چلنے والے بادسموم-- ٹھنڈ اور سردی میں چلنے والی بادسرسر-- تپتی ہوئے، اجاڑنے والی، سن سٹروک دینے والی چلنے والی بادِ لؤ۔ہم ہر ایک میں فرق محسوس کر سکتے ہیں-

جب ہوا نظر نہ آنے کے باوجود اپنے تمام تاثرات ہمیں محسوس کروا دیتی ہیں۔تو اللہ کی ذات کا پورا پورا احساس ہم رکھتے ہیں۔جو اس کو جاننا چاہتا ہے اللہ تعالی اس کو پورے پورے حواس عطا کر دیتا ہے۔انہی احساسات اور انہی حواس کا نام (اللہ سے محبت ہے) اسی کو تصوف کہتے ہیں۔شرط یہ ہے کہ اگر کوئی اللہ تعالی کو تہ دل سے چاہے۔اس لیے کہ جو شخص اللہ تعالی کو ترجیح اول سمجھتا ہے اللہ اس کو اس کے صلے میں رسپانس ضرور دیتا ہے-اس نے خود ہی سورہ البقرہ، آیت نمبر 152 میں کہا ہے:

فَاذْكُرُوْنِیٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِیْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ　　ترجمہ:"جو مجھے یاد کرتا ہے میں اسے یاد کرتا ہوں"-

اور ہم جتنا اسے یاد کرتے ہیں وہ اسی حساب سے ہمیں یاد کرتا ہے۔اور پھر ایک چیز ہمیں اس کے جواب میں ملتی ہے۔(سورہ یونس، آیت نمبر 62)

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ　　ترجمہ:خبردار رہو کہ ہم اپنے دوستوں پر کسی قسم کا خوف اور غم نہیں رہنے دیتے"۔

اب اگر کوئی شخص اللہ کی ذات کی طرف بڑھنا چاہتا ہے اور کچھ عرصہ تک فرائض کی پابندی کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر بھی کرتا ہے۔تو کچھ عرصے کے بعد اسے اللہ

کی طرف سے جواب مل جاتا ہے۔اور وہ اپنے اندر ایک خاص قسم کا سکون اور طمانیت محسوس کرتا ہے اور اللہ کی طرف سے دیے گئے اس سکون سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور چیز نہیں ہے۔اللہ تعالی کے ریسپانس کو سنبھالنا یا جذب کرنا کبھی یک طرفہ اور اچانک نہیں ہوتا۔سیدنا حضرت داتا گنج بخش ہجویری کہتے ہیں کہ "تبدیلی ایک دم نہیں ہوتی جب ہم اس کا ذکر کرتے ہیں۔تسبیح تلاوت، یا نوافل تو ہماری جبلتیں اس کے خلاف جنگ کرتی ہیں۔پھر رفتہ رفتہ یہ دنیا شروع ہو جاتی ہیں۔بعض لوگوں کو اس جدو جہد میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔جب کہ بعض افراد جن میں مقبولیت کی حس پائی جاتی ہے ان کے اخلاص پر ان کو صرف چند دن لگتے ہیں"۔

حد بندی صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ سورہ البقرہ، آیت نمبر 229 میں ہے "اے بندگان خدا! میں نے کچھ حدود بنائی ہیں جو ان حدود سے تجاوز کرتا ہے وہ ظالم ہوتا ہے"۔

جلد قرب پانے والے وہ لوگ ہیں جو کبیرہ گناہوں اور فحاشی سے بچنے والے ہوتے ہیں۔تو اللہ تعالی اچھی طرح جانتا ہے کہ ہم کتنے متقی ہیں لیکن ہمیں کبھی دعوٰی تقدس نہیں کرنا چاہیے۔یہ دعوی تقدس نہ کرنے والا وہ انسان ہے جو نارمل ہے اور لغزش وخطا جزا کے درمیان اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے۔

اس لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا "ایمان بیم ورجا کے درمیان ہے (خوف اور امید کے درمیان) یعنی انسان زندگی کے اختتام تک کبھی اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھے اور کسی خطا پر یہ نہ سمجھے کہ اللہ اس کو معاف نہ کرے گا۔

اس کو کہتے ہیں "معتدل علم" یعنی اعتدال میں علم ہے۔۔۔اعتدال میں شناخت ہے۔۔۔اعتدال میں منزل ہے۔۔۔اعتدال میں اللہ ہے۔۔۔شناخت منزل یہ ہے کہ جب ہم اپنی زندگی گزارنے کے لیے نکلیں اور اپنی مقام حیات کی ابتدا کریں تو ہمیں سب سے پہلے اس رہبر اور تعلیم دینے والے کو تلاش کرنا پڑتا ہے جو ہمیں اس فتنہ والی جگہ سے گزار کر عافیت اور سکون کے ساتھ قبر کے دہانے تک پہنچا دے تاکہ وہاں ہم امن سے رہیں۔

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا کہ "میری اور لوگوں کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس نے آگ جلائی، جب اس کے چاروں طرف روشنی ہو گئی تو پروانے اور یہ کیڑے مکوڑے جو آگ پر گرتے ہیں اس میں گرنے لگے اور آگ جلانے والا انہیں اس میں سے نکالنے لگا لیکن وہ اس کے قابو میں نہیں آئے اور آگ میں گرتے ہی رہے۔اسی طرح میں تمہاری کمر کو پکڑ پکڑ کر آگ سے تمہیں نکالتا ہوں اور تم ہو کہ اسی میں گرتے جاتے ہو"۔(صحیح بخاری، حدیث نمبر 6483)

یہی حال اس رہبر کا ہوتا ہے جس کی تمام عمر لوگوں کے لیے ڈرنے، خوف کھانے اور اللہ تعالی سے ان لوگوں کے لیے بھلائی کی دعائیں مانگنے میں گزر گئی۔

جب انسان کی عقل بلوغت کو نہ پہنچتی تھی۔جب شعور ابھی پختہ نہ ہوا تھا تو اللہ تعالی کو انسان کو سکھانے کے لیے ایسے طریقوں کی ضرورت پڑی جنہیں ہم معجزات اور خارق اعداد کہتے ہیں مگر یہ طریقہ اللہ تعالی کے نزدیک مناسب ترین طریقہ نہ تھا۔پرانے انبیاء کرامؑ میں معجزات کی کثرت ملتی ہے۔

حضرت عیسی علیہ السلام کی تمام زندگی پیدائش سے لے کر آسمان پر اٹھائے جانے تک معجزات سے بھری پڑی ہے۔پالنے میں بولنا--برص اور کوڑی والوں کو شفا دینا--مردوں کو زندہ کرنا--پرندوں کی مٹی کی صورت کو اڑا دینا--گھر میں کھانے کی چیزوں کے بارے میں بتا دینا--اور جو کچھ لوگ کھا کر آتے ان کا پتہ دینا وغیرہ وغیرہ اور کہاں اتنے سارے ہنگاموں میں لوگوں سے صرف ایک اقرار لینا (سورہ الدہر، آیت نمبر 3)

ترجمہ: "ہم نے اسے راہ دکھائی اب خواہ وہ شکر گزار بنے یا ناشکرا"۔

عالم کی شناخت کا ایک اصول ہے کہ عالم وہ ہے جو لوگوں سے ان کی حیثیت علمی کے مطابق خطاب کرتا ہے۔جو اپنے طرز عمل کو لوگوں کے طرز عمل سے بہتر نہیں سمجھتا بلکہ ان کی استعداد دیکھ کر ان کو نصیحت کرتا ہے۔ہمیں جن فتنوں کی نشاندہی کی گئی ہے کہ آخری زمانے میں وقوع پذیر ہوں گے ان میں سب سے پہلے فتنہ یہ ہے کہ لوگ لوگوں سے ڈریں گے---دوسرا فتنہ عیش وعشرت کا فتنہ ہوگا یہ دولت کا فتنہ ہوگا---تیسرا فتنہ بے سکونی کا فتنہ ہوگا۔

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ تم اس سے پہلے 10 نشانیاں دیکھ لو۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے دھوئیں کے نمودار ہونے، دجال دابتہ العرض، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے، عیسی علیہ السلام بن مریم کے نزول، یاجوج ماجوج، تین جگہ زمین کا دھنسنا (مشرق، مغرب اور جزیرہ عرب میں) آخر میں وہ آگ ہوگی جو یمن سے نکلے گی اور لوگوں کو حشر کے میدان کی طرف دھکیلے گی"۔(صحیح مسلم، جلد 4، حدیث نمبر 7285)

ہمارے خیال میں تو یہ شہوات، طلب ہوس، آرزو اور لالچ کی آگ ہے جو ساری دنیا میں لگ گئی ہے اور لوگ مشرق سے مغرب کی طرف مستقبل سنوارنے کے لیے دھڑا دھڑ جا رہے ہیں۔کوئی ان سے یہ پوچھے بھائی کون سا مستقبل؟؟ یہ 25,30 سال کا مستقبل اور اس کے بدلے میں کون سا مستقبل ہم کھو رہے ہیں؟ ہمیشہ کی زندگی کا مستقبل۔ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کے پاس ایک بدو آیا اور سوال کیا "یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ روز محشر ہم میں سے حساب کون لے گا"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ

نے فرمایا" اللہ خود" - وہ ہنسا اور چل دیا - اسے بلایا گیا اور پھر آپ خاتم النبیین ﷺ نے اس سے پوچھا" تو نے ایسا کیوں کیا"؟ اس نے جواب دیا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ میرا زندگی کا، اس دنیا کا تجربہ ہے کہ جب کوئی اعلیٰ ظرف حساب لیتا ہے تو نرمی سے لیتا ہے - اب اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کون اعلیٰ ظرف ہے؟" آپ خاتم النبیین ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھما کو مخاطب کرتے ہوئے کہا" دیکھو اس کا گمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کتنا اچھا ہے" - پھر آپ خاتم النبیین ﷺ نے یہ ہدایت فرمائی کہ "اللہ کے ساتھ ہمیشہ خوش گمان رہو (یعنی اچھا گمان رکھو)" - کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "میں لوگوں کے گمان کے ساتھ ہوں جیسے وہ مجھ سے گمان کرتے ہیں میں ویسا معاملہ ان کے ساتھ فرماتا ہوں" - (متفق علیہ)

کچھ لوگ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کے پاس آئے اور فرمایا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ہم کھجور کو پیوند لگاتے ہیں" - آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" میں پیوند پسند نہیں کرتا" - لوگ چلے گئے خسارہ ہوا - لوگ گلا گزار ہوئے کہ " آپ خاتم النبیین ﷺ کے کہنے پر ہم نے پیوند نہ لگایا" - آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا کہ "پھر ویسے ہی کیا کرو جیسے تمہارا تجربہ تھا" -

یہ اتنی خوبصورت مثال ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے اپنی ججمنٹ کی غلطی کا اعتراف کیا لیکن بات یہ نہیں ہے بلکہ بظاہر اپنی غلطی سے اپنی امت کو ایک زبردست سبق دیا ہے اور وہ یہ کہ **وہ انسانی تجربہ جو صدیوں سے تمہیں حاصل ہو رہا ہے---جس پر تم ہزار مرتبہ علم وحکمت سے تجربے کر چکے ہو اگر تم اس کے خلاف جاؤ گے تو غلطی کرو گے-**

آپ خاتم النبیین ﷺ کا تمام وجود علمی تھا--علم آپ خاتم النبیین ﷺ کی رگ و پے سے ظاہر ہوتا تھا--آپ خاتم النبیین ﷺ قرآن پاک کے علمی اوارق کی عملی تفسیر تھے-قران پاک پورے کا پورا علمی شکل میں آیا اور نبی کریم خاتم النبیین ﷺ عملی صورت میں آئے اور کوئی صورت آپ خاتم النبیین ﷺ کی صورت سے بہتر نہیں-

ہماری اس مختصر سی زندگی میں جو کہ توشہ کمانے کی واحد زندگی ہے راہیں بدلنے کا وقت نہیں ہے- ہم خود بھی اس بات کو سمجھیں اور اپنی اولاد کو بھی یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کروا دیں کہ ہمارا مقصد زندگی فقط دنیا کمانا نہیں ہے- بلکہ آخرت کمانا ہے اور ہمارا اصل تعلق تو اللہ تعالیٰ سے ہونا چاہیے-اگر ہم اتباع رسول خاتم النبیین ﷺ کریں گے تو تعلق بن جائے گا اور پھر یہ تعلق حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی وساطت سے اللہ تعالیٰ سے ہوجائے گا-شاید اسی لیے جب رسول پاک خاتم النبیین ﷺ سے پوچھا گیا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ آل رسول کون لوگ ہیں"؟ تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" متقی" -

اب ایک محسن، ایک رسول، ایک مرشد اور سب سے بڑے استاد کے لیے کتنی کوفت کی بات ہے کہ اس کے پیغام، اس کے احکامات کی پرواہ نہ کی جائے اور دعوی اللہ سے محبت کا کیا جائے- جو لوگ اللہ سے محبت کا دعوی کرتے ہیں ان کی سب سے اول ترجیح اتباع رسول (خاتم النبیین ﷺ) کے ذریعے سے ذات باری تعالیٰ ہوتی ہے-

آج ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ **اللہ سے دعوی محبت کے دعوی دار اتباع رسول خاتم النبیین ﷺ پہلے کرتے ہیں پھر اللہ سے تعلق بنتا ہے**-اس لیے جو کچھ آپ خاتم النبیین ﷺ لے کر آئے ہیں یعنی قران پاک اور جو کچھ آپ خاتم النبیین ﷺ نے اپنا پیغام چھوڑا ہے یعنی حدیث اور سنت مبارکہ ان پر عمل کیا جائے اور سب سے بڑا پیغام لوگوں تک پہنچایا جائے کہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی سنت اور قران کے احکامات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ ترجیح اول ہے، جو اللہ کو اول ترجیح دے گا وہ اللہ کو پالے گا-

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ہدایت اور یقین کا باہمی تعلق

سورہ بقرہ، آیت نمبر 1 تا 5 الٓمّٓ. ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ ۛ فِیْہِ ۛ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ "یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں ۔ (یہ) پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے"۔
الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰـھُمْ یُنْفِقُوْنَ "جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا اسے خرچ کرتے ہیں"
وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ. "اور وہ لوگ جو آپ (خاتم النبیین ﷺ) پر نازل کیا گیا اور جو آپ (خاتم النبیین ﷺ) سے پہلے نازل کیا گیا تھا (سب) پر ایمان لاتے ہیں۔ اور آخرت پر بھی (کامل) یقین رکھتے ہیں"۔
اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ ۙ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. ترجمہ: "وہی اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی حقیقی کامیابی پانے والے ہیں"۔

مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت یافتہ افراد کے تین طبقے بیان فرمائے ہیں: (1) ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے)
(2) عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ (اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں) (3) الْمُفْلِحُوْنَ (فلاح پانے والے ہیں)

یہ تینوں طبقات وہ ہے جنہیں غیب پر یقین رکھنے اور بن دیکھے حقیقتوں پر ایمان لانے کی بدولت اپنے رب کی طرف سے ہدایت عطا ہوتی ہے۔ ایمان تب نصیب ہوتا ہے جب بندہ یقین کامل کے ساتھ زبان سے اقرار کرے اور دل سے تصدیق کرے۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ہم لوگ یقین کے معنی ومفہوم، یقین کی ضرورت واہمیت اور اس کی برکات سے بالکل محروم ہو گئے ہیں۔ درحقیقت زبان سے اقرار کرنا دل کی تصدیق کے اظہار کے لیے ہوتا ہے اور دل تصدیق تب کرتا ہے جب بندہ یقین کی اعلیٰ بلندیوں پر فائز ہو۔ گویا زندگی کی ابتداء ایمان بالغیب سے ہوتی ہے اور یقین ہی ایمان بالغیب کو پختہ کرتا ہے جس کے نتیجے میں ہدایت کے راستے کھلتے ہیں۔ وہ لوگ جو تقویٰ و پرہیزگاری کے ذریعے ہدایت حاصل کرتے ہیں قرآن نے انہیں "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" کی صورت میں بیان کیا ہے۔

دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جنہیں تقویٰ اختیار کرنے، غیب پر ایمان لانے، نماز ادا کرنے، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور آخرت پر ایمان لانے کی بدولت اللہ تعالیٰ ایسی ہدایت عطا فرماتا ہے کہ وہ خود تو ہدایت پر قائم رہتے ہی ہیں مگر اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کی ہدایت کا سبب بھی بنتے ہیں۔ وہ دوسروں میں ہدایت تقسیم کرنے والے بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ ہادی کس طرح بنتے ہیں؟ اس کا انحصار ایمان بالغیب کے اقرار، شک کے خاتمہ اور یقین پر ہے۔

ایمان بالغیب کے ذریعے:- انسان کی زندگی میں نور کا ایک بیج داخل ہو جاتا ہے۔ ایمان کا یہ بیج خود بخود اُگ کر درخت نہیں بن جاتا بلکہ بیج بونے کے بعد اُس کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ اُس کو زندہ رکھنے کے لیے پانی دینا پڑتا ہے، پھر پروان چڑھانے اور طاقت مہیا کرنے کے لئے کھاد ڈالنی پڑتی ہے۔ لیکن افسوس! ہماری زندگی کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہم نے کلمہ پڑھ لیا یا کسی کے ساتھ وابستگی کا اقرار کر لیا تو سمجھ بیٹھے کہ یہی کافی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے مالی نے بیج بویا، مٹی ڈالی اور چلا گیا اور یہ سمجھتا رہا کہ اب یہ خود اُگ کر درخت بن جائے گا حالانکہ محض ایسا کرنا کافی نہیں ہے۔ جب بیج بو دیا جائے تو پہلے مرحلہ پر اس کی قوت تخلیق کے لیے پانی اور کھاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب اُگ کر پودا بن جائے تو پھر اُس کی مزید نشوونما کے لئے دھوپ اور ہوا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان ساری چیزوں کا اہتمام نہ کیا جائے تو وہ پودا جل جاتا ہے۔ جس طرح بیج سے اُگنے والے پودے کو پانچ چیزیں پانی، کھاد، گوڈی، روشنی اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح انسان کے دل میں بوئے ہوئے ایمان کے بیج سے پیدا ہونے والے اسلام کے پودے کو بھی پانچ چیزیں درکار ہیں جنہیں ارکان اسلام کہتے ہیں۔ ان ہی کی مدد سے انسان ایمان اعتقاد، ایقان اور یقین کے درجہ تک پہنچتا ہے۔ کسی پودے کے نمو کے لیے درکار ان پانچ ارکان کے ہوتے ہوئے بھی اگر مالی نہ ہو تو کام نہیں چلتا۔ اس کے لیے ایک دیکھ بھال کرنے والا بھی چاہئے جو بیج کو یہ پانچ چیزیں بروقت فراہم کرے تب یہ بویا ہوا بیج پودا بنتا ہے اور پھر درخت بن کر پھل کی صورت میں نفع بخش ثابت ہوتا ہے۔

اللہ رب العزت نے ایمان کے بیج کی آبیاری کے لیے یہ سارے سامان فراہم کئے ہیں۔ فرمایا" اگر چاہتے ہو کہ تمہاری زندگی کو قرآن سے ہدایت ملے تو سب سے پہلے اپنے دل میں اُگے ہوئے شک کے درخت کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکو۔ جب شک سے دل پاک صاف ہو جائے گا، تب یقین کا پودا اُگے گا اور ہدایت نصیب ہو گی"۔ گویا ہدایت کی ابتداء یقین ہے اور اس کی انتہاء مرتبہ ایقان ہے۔ فرمایا: ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْہِ. -- یعنی اگر تم نے اس لاریب کتاب سے ہدایت لینی ہے تو دل کی کتاب کو بھی لاریب کرنا پڑے گا۔ جس طرح فصل میں اگنے والی زہریلی جڑی بوٹیاں زمین کی طاقت جذب کر کے فصل کو کمزور کرتی ہیں، اسی طرح دل میں جنم لینے والا شک، یقین کو کمزور کر دیتا ہے۔ ایمان کی بحث میں اس کو ''ریب'' کہتے ہیں۔ (یعنی شک) یہ شک طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ اللہ کے وجود میں شک ہے، یقین نہیں ہے۔ تقدیر

میں شک ہے، مانتے ہیں اقرار کرتے ہیں مگر یقین نہیں ہے۔۔اللہ دے گا مگر اس کے دینے میں شک ہے یعنی ''یقیناً'' دے گا'' یہ کیفیت نہیں ہے۔۔قلب کو یقین میسر نہیں۔ موت ہوگی، قبر میں حساب وکتاب ہوگا، آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی سے زیادہ اہم ہے، ہر کوئی ان عقائد کا اظہار کرتا ہے مگر یقین نہیں ہے۔۔اقرار زبان کی حد تک ہے ۔دل کی حد تک نہیں پہنچا۔علم زبان تک کر کے تو بات نہیں بنتی علم دل پر وار ہو تو کام چلتا ہے-اگر ان تمام کا کامل یقین ہوتا تو ہر کوئی بدل گیا ہوتا اور دنیا کی زندگی پر آخرت کو ترجیح دیتا۔سودے یہیں بدل جاتے اور دنیا کی لالچ میں مبتلا کرنے والے سودے بیچ کر نئے سودے کر لئے ہوتے مگر ہماری اکثریت کی زندگی دھوکہ بازی پر چل رہی ہے اس لیے کہ ہمارے یہ سودے اللہ سے پکے اور سچے نہیں ہو رہے۔ہم نے زندگی میں دل کی زمین میں موجود شک کی بوٹیوں کو جڑوں سے نکال کر پھینکا ہی نہیں ہے۔

اللہ رب العزت فرما رہا ہے " قرآن بھی تمہاری طرف نازل کر دیا ہے، ہدایت بھی اس میں رکھ دی ہے مگر ہدایت کے نصیب ہونے کی شرطِ اولین یہ ہے کہ ریب وشک کی بوٹیاں دل کی زمین سے اکھاڑ پھینکو اور دل کی زمین کو پاک اور صاف کر دو"۔اس لیے کہ تمہارے دل کی طاقت تو تمہارے شک کو پالنے میں لگی رہتی ہے اور اس میں سو قسم کے شک پلتے رہتے ہیں۔اب حالت یہاں تک جا پہنچی ہے کہ شک کے پودے پل پل کر اتنے بڑے ہو چکے ہیں کہ اب تو وہ قابو میں بھی نہیں ہیں۔

ہم انہیں قابو میں کرنے کے لئے اوپر سے کاٹ دیتے ہیں جبکہ دل میں شک کی جڑیں دور دور تک پھیل چکی ہوتی ہیں۔اوپر سے کاٹنے کے بعد جب کچھ نظر نہیں آ رہا ہوتا تو ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ دل میں موجود تمام شکوک کی جڑی بوٹیاں کاٹ دی ہیں، مگر یہ خبر ہی نہیں کہ دور دور تک اس کی جڑیں پھیل چکی ہیں اور چند دنوں کے بعد وہ پھر سر نکال لیں گی۔یہی وجہ ہے کہ ہم آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں۔ان حالات میں ضرورت تزکیہ کی ہے، تزکیہ کا مطلب شک کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا ہے۔اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا"اگر ہدایت لینی ہے تو دل کے اندر شک کی کوئی جڑ ہی نہ رہے، تمام شک نکال پھینکو گے تب ہدایت ملے گی اور ایمان نصیب ہوگا"۔

ایمان ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جن کی ہدایت کا اللہ ارادہ فرما لیتا ہے اور ہدایت ان کو نصیب ہوتی ہے جو اپنے آپ کو شک کی دلدل سے نکالتے ہیں۔دل کی زمین میں یقین کی اونچی اونچی بوٹیاں موجود ہیں جبکہ یقین، ایمان اور عقائد صحیحہ چھوٹے چھوٹے نوخیز پودوں کی طرح موجود ہیں، شک کے بڑے بڑے پودے ان پر سایہ کئے کھڑے ہیں، جن کی وجہ سے ان ننھے ننھے پودوں کا نمو پانے کا راستہ ہی صاف نہیں ہو رہا۔جب دل کو پاک صاف کر دیا جائے تو تب ہدایت نصیب ہوتی ہے اور یہ ہدایت ایمان تک پہنچاتی ہے۔دل کی زمین سے شک کو اکھاڑ پھینکنے کے بعد اب اس ایمان کے بیج کو پانی، کھاد، ہوا اور روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ایمان کے پودے کو یہ تمام چیزیں کیونکر مہیا ہوں گی؟ فرمایا: وَيُقِيمُوْنَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰـهُمْ يُنْفِقُوْنَ.---ایمان کے پودے کے لیے پانی بصورتِ نماز۔۔۔عبادات بصورتِ کھاد۔۔۔اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا بصورتِ ''ہوا'' ہے۔گویا عملِ صلوٰۃ پانی بن گیا، عبادت کھاد بن گئی اور دل کی زمین شک سے پاک ہوگئی تو ان تمام عوامل کے ذریعے ایمان کے پودے کو زندگی اور توانائی مل گئی۔پھر فرمایا: وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ج وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ.

ان تمام تعلیمات الٰہیہ کے ذریعے ایمان کے پودے کو روشنی میسر آ گئی اور اس طرح اس کے نمو کا سارا سامان مہیا ہو گیا۔اِن تمام مراحل کے بعد جا کر آخرت کا یقین پیدا ہوا۔شک کے رفع کرنے سے سفر شروع ہوا تھا۔شک نکالا تو یقین کی ابتداء ہوئی، پھر سارے تقاضے پورے کئے تو مرتبہ ایقان تک جا پہنچے اور ایقان کو جب کمال نصیب ہوا تو اس شخص کے لئے اللہ نے خوشخبری سنائی: اُولٰٓـئِكَ عَلٰی هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ق وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.

ایک ہدایت وہ ہے جس کا ذکر اللہ نے شروع میں هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے ذریعے کر دیا تھا اور دوسری ہدایت کا ذکر عَلٰی هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ کے الفاظ کے ذریعے کیا۔ان دو ہدایتوں میں فرق ہے---هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ فرما کر اللہ تعالیٰ نے ایک اعلان فرما دیا تھا کہ:"جو شخص جتنا پرہیزگار رہوگا، اتنی ہدایت اس کا نصیب ہے، اب اس کی محنت و ریاضت اور تگ ودو پر منحصر ہے کہ وہ اپنے لیے کتنی ہدایت سمیٹتا ہے"۔بعد ازاں انسان جب نماز، انفاق اور تعلیمات پر عمل کے ذریعے ایمان کے کمال تک جا پہنچا اور اُسے یقین حاصل ہو گیا تو فرمایا: اُولٰٓـئِكَ عَلٰی هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ.---یعنی کمالِ یقین پا لینے والے اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر فائز ہو گئے۔پہلے صرف ایک اعلان تھا کہ ہدایت کا خزانہ انہیں ملے گا جو متقی و پرہیزگار رہیں مگر مل جانے کی ضمانت نہ تھی۔بعد ازاں: يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُوْنَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰـهُمْ يُنْفِقُوْنَ کے ذریعے سارا راستہ بیان کر دیا، شرطیں بیان کر دیں، تقاضے بیان کر دیئے کہ جب ساری وادی عبور کر لو گے اور یقین کو مرتبہ ایقان تک پہنچا دو گے تو اب ان کو اللہ نے خوشخبری سنائی کہ اب چونکہ ان لوگوں کا آخرت پر یقین جم گیا ہے اور انہوں نے دنیا کے بدلے آخرت خرید لی ہے لہٰذا: اُولٰٓـئِكَ عَلٰی هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ق یقین کے کمال کو پا لینے والے اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر فائز ہو گئے۔

"وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُون" کا معنی یہ ہے " جس نے آخرت کے لئے دنیا بیچی"۔افسوس ہمارا آخرت پر یقین نہیں ہے۔ہم نے دنیا کو آخرت کے بدلے بیچنے کی بجائے

آخرت پر دنیا کو ترجیح دے رکھی ہے۔ جب کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو سب سے پہلے ہمارے پیشِ نظر دنیا اور دنیا کا مفاد ہوتا ہے، برادری، رشتہ دار اور نام ونمود ہوتی ہے، دنیا کے حرص ہیں، دنیا کے لالچ ہیں، یہ سب دنیا کے پیمانے ہیں، ہمارا تو سارا جینا مرنا دنیا ہے۔ اگر ہم میں تبدیلی نہیں آئی تو ہم اللہ کے ساتھ کتنا بڑا دھوکہ کر رہے ہیں۔ آخرت پر اگر یقین ہو گیا ہوتا تو دنیا پیچ چکے ہوتے۔ اگر دنیا، آخرت پر وار دی ہوتی تو ہماری زندگی کے طور طریقے ہی بدل گئے ہوتے۔ ہماری دنیا کی زندگی بدل گئی ہوتی۔ ہماری ترجیحات بدل گئی ہوتیں۔ پسند اور ناپسند کے سارے پیمانے بدل گئے ہوتے۔ لیکن جب کوئی معاملہ آتا ہے تو سب سے پہلے ہم دنیا کو سامنے رکھ کر سوچتے ہیں۔ جو دنیا کے پیمانوں پر سوچتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے "وَبِالْاٰخِرَۃِھُمْ یُوْقِنُوْنَ" کی وادی میں قدم نہیں رکھا۔ ہم دنیا کو سامنے رکھتے ہیں، نفس کو سامنے رکھتے ہیں، ہمارے تو اپنے گورکھ دھندے ہی ختم نہیں ہوتے۔ دنیا کا گورکھ دھندہ اور جنجال ہی سب سے بڑا دجال ہے۔ ایک دجال تو وہ ہے جو قربِ قیامت آئے گا اور گمراہ کرے گا، لیکن ہم نے تو کئی دجال اپنے اندر پال رکھے ہیں۔ یہ نفس، حرص دنیا، حسد وبغض، عناد وغرور، ہر ایک کے ساتھ دنگا فساد، غیبتیں اور چغلیاں یہ سارا کچھ ایک دجال ہی کی خصوصیات ہیں۔ دجال کا کام بھی گمراہ کرنا ہوگا۔ اور ان تمام چیزوں کا کام بھی گمراہ کر کے اللہ کی راہ سے ہٹانا ہے۔ قربِ قیامت پر جو دجال آئے گا اس سے بچنے کے لئے تو دعائیں کی جاتی ہیں۔ اس سے ڈرا جاتا ہے کہ وہ ہمیں گمراہ نہ کر دے۔ سوچنے کا مقام یہ ہے کہ آج ہم کون سی راہ پر ہیں؟ کہ دجال ہمیں گمراہ کر دے گا۔

جب تک دنیا کے جنجال کو لات نہیں مارتے اور اس گورکھ دھندے سے نہیں نکلتے، اس وقت تک ہم "وبِالْاٰخِرَۃِھُمْ یُوْقِنُوْنَ" کی وادی میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اور مرتبہ ایقان کو نہیں پا سکتے۔

ایقان کیا ہے:- جب آخرت اور آخرت میں جو کچھ ہونا ہے، اس کے ہونے کا یقین اپنے کمال کو پہنچ جائے تو اس کمال کو ایقان کہتے ہیں۔ جب یہ حالتِ ایقان نصیب ہو جائے تو اس کی ادنیٰ علامت یہ ہے کہ بندہ آخرت کے بدلے دنیا کا سودا کر لیتا ہے۔ آخرت کا سودا کر لینے کا مطلب ہے زندگی بدل گئی، زندگی کا رنگ بدل گیا، ڈھنگ بدل گیا، سوچ بدل گئی، ترجیح بدل گئی، سارا کچھ بدل گیا۔ اللہ رب العزت نے فرمایا "جب آخرت کے یقین کو کمال تک پہنچالو گے تب تم ہدایت پر فائز کر دیئے جاؤ گے"۔ "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دوزخ سے بچ گیا، راہ راست پر گامزن ہو گیا اور اس کو ہدایت مل گئی۔ جس کو ہدایت مل گئی اس کا اپنا کام ہو گیا جن کے لیے اس ہدایت کا ذکر کیا وہ صرف اپنے لیے ہیں۔ پس "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" جن کو ہدایت مل گئی ان کا اپنا آپ سنور گیا، وہ گناہ اور خطا کی وادی سے نکل آئے، اوسط درجے میں آ گئے، کنارے لگ گئے، بخشش والے ہو گئے، وہ جیت گئے، ان پر عنایتیں ہو گئیں مگر یہ جتوانے کے قابل نہیں بنے۔ جبکہ بعض لوگ وہ ہیں جن کے لئے فرمایا: "اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ" کہ وہ لوگ جنہوں نے ساری منزلیں طے کر لیں اور "وَبِالْاٰخِرَۃِھُمْ یُوْقِنُوْنَ" تک جا پہنچے، دنیا کو لات ماردی، اب وہ دنیا کے بندے نہ رہے بلکہ آخرت کے بندے ہو گئے۔ جب انہوں نے ایمان کی شرائط اور تقاضے پورے کیے اور دنیا کے بدلے آخرت خرید لی تو اب وہ نہ صرف خود ہدایت یافتہ ہو گئے بلکہ اوروں کے ہادی بن گئے۔ اب جو ان کی کشتی میں بیٹھ جائے گا، اس کو بھی کنارے لگا دیں گے۔ پہلے "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" تھے اب "عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ" کے مصداق ہو گئے، یعنی ہدایت پر فائز اور متمکن کر دیئے گئے۔ جب کوئی کسی شے کے اوپر متمکن ہوتا ہے تو اس کے تصرف میں خصوصی رحمت دے دی جاتی ہے۔ پہلے آدمی ہدایت لیتا تھا، اب جس کو چاہتا ہے ہدایت بانٹتا ہے۔ پہلے آدمی ہدایت کا خریدار تھا، ہدایت اپنے لیے خریدتا تھا مگر اب ہدایت دیتا پھرتا ہے۔

مختصر یہ کہ پہلا درجہ "ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" متقین کے لئے ہدایت ہے جتنی ہدایت چاہیں لے لیں، اپنے جوگے ہو گئے۔ دوسرا درجہ "عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ" کے مصداق دنیا کو ہدایت دینے والے ہو گئے۔ یعنی لینے کے بعد آگے دینے والے بن گئے۔ جو ان کے دامن سے لپٹ جائے گا اس کو بھی ہدایت کی خیرات مل جائے گی۔

ایک تیسرا درجہ بھی اللہ رب العزت نے بیان فرمایا کہو "اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" یہ نہیں فرمایا "اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ ق ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ." بلکہ "وَ اُولٰٓئِکَ" دہرا کر کہا "وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پر متمکن ہونے کے بعد فلاح پا گئے اور جو فلاح پا گئے وہ اہل اللہ ہو گئے۔ جو ہدایت کے اوپر متمکن تھے وہ اہلِ اَقرب تھے اور جو اصلاً اولیاء اللہ ہو گئے وہ "وَ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" ہو گئے۔ ان کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے فلاح کے چشمے دے دیئے۔ (نعمتوں سے نواز دیا) فلاح کے چشمے جن کے ہاتھ میں دیئے وہ لقاء والے ہو گئے، وہ اللہ سے ملاقات کرنے والے ہو گئے، وہ آخرت کے بھی طلبگار نہ رہے بلکہ صرف اور صرف مولیٰ کے دیدار کے متمنی بن گئے۔ یہ اللہ کو پا گئے۔ دوسرے درجے والوں کو نعمت ملی تھی تیسرے درجے والوں کو اللہ مل گیا۔ وہ نعمت والے تھے اور یہ نعیم والے ہو گئے۔ جن کو اللہ مل جاتا ہے تو سارا کچھ ان کے ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ فلاح کے چشمے ان کے ہاتھ میں آ گئے۔

بس یہی راستہ ہے اور یہی سودا ہے۔ اس سودے کے سوداگر بنیں، اس راستے پر چلیں، ان منزلوں کو عبور کریں، اللہ تبارک وتعالیٰ سب کا حال بہتر کر دے گا۔

قدر دان (اللہ جل شانہ)

حدیث قدسی :- حضرت عبداللہ بن عباسؓ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ " رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے اپنے پروردگار سے یوں روایت کی "اللہ تعالیٰ نے (قلم سے دست قدرت کا حکم) تمام نیکیاں اور برائیاں لکھوا دی ہیں"۔ پھر ان کی وضاحت یوں فرمائی:

" جس نے کسی نیکی کا دل سے ارادہ کیا مگر اس پر عمل نہ کر سکا تو اس کے (نامہ اعمال میں) کامل نیکی کا ثواب لکھ دیا جاتا ہے۔ اگر دل میں نیکی کا ارادہ کرنے کے بعد اس پر عمل پیرا بھی ہوا تو اس کے (نامہ اعمال میں) دس سے لے کر سات سو تک نیکیاں لکھ دیتا ہے بلکہ سات سو سے بھی کہیں زیادہ نیکیوں کا ثواب لکھ دیتا ہے۔ اور اگر کسی نے ایک برائی کا ارادہ دل میں کر لیا مگر اس پر عمل نہیں کیا (نہ کر سکا) اللہ تعالیٰ اس کے لئے بھی ایک نیکی کا ثواب عطا کرتا ہے (لیکن) اگر برائی کا ارادہ کر کے اس پر عمل بھی کر گزرے تو اس کے نامہ اعمال میں محض ایک برائی کا (بدلہ) لکھا جاتا ہے"۔ (بخاری شریف، مسلم شریف)

زندگی میں جتنے بھی کام کرتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں اچھے یا برے یعنی نیکی یا برائی۔

نیکی پر ہم اللہ تعالیٰ سے اجر کی امید رکھتے ہیں۔ **برائی** سے ہم اس لئے بچنا چاہتے ہیں کہ اس پر ہمیں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا اندیشہ ہوتا ہے۔

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا۔ ''الدین یسر'' ترجمہ: "دین آسان ہے"۔ (صحیح بخاری)

اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی کے بدلے کا قانون بھی بڑا آسان بلکہ سراسر رحمت کا قانون رکھا ہے۔ اور اس قانون کی وضاحت حدیث قدسی میں کر دی گئی ہے۔

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے قول، فعل اور عمل کو سنت کہتے ہیں۔ یعنی آپ خاتم النبیین ﷺ نے جو کچھ کہا، جو کچھ کیا اور جو کچھ کر کے دکھایا، وہ آپ خاتم النبیین ﷺ کی سنت ہے اور اسی کو حدیث کہتے ہیں- احادیث عام طور پر قرآن مجید کی تشریح ہوتی ہیں۔ قرآن مجید کی باتوں کو تفصیل سے بیان کرتی ہیں۔ اور قرآن پاک کے احکامات کی وضاحت کرتی ہیں۔ مثلاً قرآن پاک میں حکم ہوتا ہے کہ نماز قائم کرو۔ حدیث بتاتی ہے کہ کس طرح کرو۔ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرو۔ کتنی زکوٰۃ ادا کریں؟ کتنے مال پر، زکوٰۃ کا مطلب کیا ہے؟ اس مال کو نکالنے یا راہ خدا میں دینے کی کتنی فضیلت ہے؟ یہ تمام تر تفصیل ہمیں حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں رمضان کے مہینے میں روزے رکھنے کا حکم موجود ہے۔ لیکن باقی تمام تر نفلی روزے، ہر ماہ کے تین (یعنی چاند کی تیرہ، چودہ، پندرہ تاریخ کا روزہ)۔ کہ یہ روزے رکھنے والا ہمیشہ روزے سے رہنے والوں میں شمار ہوگا۔ اسی طرح رمضان کے روزے رکھنے کے بعد شوال کے چھ روزے رکھنے والا ہمیشہ روزے رکھنے والوں میں شمار کیا جائے گا۔ ایسا کیوں؟ یہ اس لئے کہ حدیث کے مطابق ایک نیکی کا بدلہ یا اجر 10 نیکیوں کے برابر- ہر ایک کے لئے تو رمضان کے 30 روزے 10 ماہ کے روزوں کے برابر، اس میں شوال کے 6 روزے ملا لیں تو 2 ماہ کے روزے ہو گئے۔ یہ تو عام لوگوں کے لیئے ہے۔ لیکن اس حدیث میں ایک اور بھی بات بہت ہی اہم بتائی گئی ہے کہ ''اللہ اضافہ کر دیتا ہے جس کے لئے وہ چاہے"۔ یعنی ایک کے بدلے 10 ہر ایک لئے، باقی کسی کے لئے ایک کے بدلے 100 کی، کسی کے لئے 500، کسی کے لئے 700، کسی کے لئے 7000 - وہ مالک کل ہے مختیار ہے اس کی مرضی ہے جس کو جتنا کچھ دینا چاہے۔

سورہ بقرہ، آیت نمبر 261 میں انفاق فی سبیل اللہ کے ضمن میں یہ بات کہی گئی ہے " جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانے جیسی ہے جس میں سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے بڑھا چڑھا کر دے اور اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علم والا ہے"۔

سورہ الانعام، آیت نمبر 160 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "نیکی کا اجر 10 گنا دیا جائے گا"۔

تو جو بات حدیث میں کی گئی ہے وہ قرآن مجید سے ماخوذ ہے اور نبی کریم خاتم النبیین ﷺ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ قرآن مجید کی تشریح ہے۔

یہ بات قرآن پاک میں بہت واضح ہے کہ کسی کا کوئی نیک عمل کبھی ضائع نہیں ہو سکتا۔ کسی محنت کرنے والے کی محنت، کسی مزدوری کرنے والے کی مزدوری، کسی نیک عمل کرنے والے کا کوئی نیک عمل ضائع نہیں ہو سکتا۔ سوائے اس کے کہ وہ خود اس کو ضائع کر دے۔ خود ہی کنواں کھودے اور اس میں گر جائے۔ یعنی خود ہی ایسے برے اعمال کرے۔ جو کی ہوئی نیکیوں پر غالب آ جائیں۔ وہ اس کا اپنا کام ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکی ضائع نہیں ہوتی۔ برائی کو چاہے وہ لکھے اور چاہے تو معاف کر دے۔ اس مقابلے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قانون جو نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے حدیث قدسی کے طور پر بیان کیا ہے۔ بڑا ہی اہم قانون ہے اس کا ہر ہر جز واپنی جگہ قابل غور ہے۔ پہلی بات جو اس حدیث میں واضح طور پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اصل چیز کسی کام کو کرنے کا ارادہ ہے۔

انسان کو جو طاقت دی گئی ہے اختیار دیا گیا ہے۔ وہی اس کا امتحان ہے اور وہ اپنی شخصیت، اپنی ہستی، اپنے دماغ، اپنے قلب جو لفظ بھی ہم استعمال کریں-قرآن مجید نے انسان کے اندر جو شخصیت کام کرنے کے فیصلے کرتی ہے اور کام کرتی ہے اس کے لئے قلب کا لفظ استعمال کیا ہے-اس کے ذریعے وہ اس اختیار کو استعمال کرتا ہے۔

قرآن مجید ہی کہتا ہے کہ اصل زندگی قلب کی زندگی ہے۔اصل موت قلب کی موت ہے-اصل بینائی قلب کی بینائی ہے۔اور اصل اندھا پن قلب کا اندھا پن ہے-

سورہ الحج، آیت نمبر 46 میں ارشاد باری تعالی ہے " آنکھیں اندھی نہیں ہوتی بلکہ قلب جو سینے میں ہے وہ اندھا ہو جاتا ہے "۔اور جب قلب اندھا ہو جائے تو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی۔ایک امیر شخص نے کسی بزرگ سے کہا" حضرت اس کی کیا وجہ ہے کہ جب میں کوئی نیک کام کرتا ہوں تو خوشی نہیں ہوتی اور جب کوئی برا کام کرتا ہوں تو افسوس نہیں ہوتا"؟ بزرگ نے اس امیر آدمی کی طرف دیکھا اور فرمایا ’’اب آپ کا دل پورے طور پر مر گیا ہے "۔تو قیامت کے دن وہی آدمی نجات پائے گا جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر حاضر ہوگا۔" قلب سلیم وہ خالص دل ہے جو کفر (انکار) نفاق (منافقت) اور ہر قسم کی گندگی سے پاک ہوتا ہے "-

سورہ شعراء آیت نمبر 89 میں ارشاد باری تعالی ہے " مگر وہ جو اللہ کے حضور حاضر ہوا سلامت دل لے کر"-

اللہ تعالی کے ہاں اصل قوت ارادے کی ہے ہم لوگ ارادے کے لئے ایک دوسرا لفظ نیت استعمال کرتے ہیں۔شریعت میں نیت کی بڑی اہمیت ہے۔عمل کی ظاہری شکل وصورت نہیں ہے۔اس عمل کے لئے جو نیت کی ہے وہ اصل بات ہے۔آدمی نے اللہ تعالیٰ کے آگے جواب وہ ہونا ہے- جب بھی بندہ نیکی کا پختہ ارادہ کرتا ہے پھر وہ نیک کام کرے یا نہ کرے۔ایک نیکی اس کے نامہ اعمال میں لکھ دی جائے گی ۔ کیونکہ نیکی کا ارادہ ہی اصل بات ہے۔ کیونکہ جب نیکی کا ارادہ کرے گا تو نیک عمل بھی کرے گا اور نیک عمل کرے گا تو آگے بھی بڑھے گا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ارادہ کرنا خود ایک نیکی ہے-اس لئے نیکی کی نیت اور ارادہ آدمی کو کرتے رہنا چاہیے۔سوچتے رہنا چاہئے۔کہ میں یہ نیک کام کرلوں- میں کسی بندے کا کوئی کام کردوں، میں فلاں کا قصور معاف کردوں، فلاں سے معافی مانگ لوں یا آئندہ میں نرمی سے بات کیا کروں گا، کسی پر غصہ نہیں کروں گا وغیرہ وغیرہ۔زندگی کے جو بھی دائرے ہیں معاش کمانے کے ہیں، اولاد کے ہیں، رشتہ داروں، پڑوسیوں، ماں باپ کے، اپنے نفس کے، اللہ کی عبادت کے ، اللہ کی اطاعت کے، نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ ان سب کے اندر ایک ہی اصول ہے کہ آدمی نیکی کرنے کا ارادہ کرتا رہے۔

انسان کے پاس، اللہ کا دیا ہوا یہ اختیار بھی ہے جس سے وہ نیکی کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور پھر نیکی کرتا ہے۔لیکن اس اختیار اور ارادہ پر مواخذہ بھی ہوگا۔ جو چیزیں اختیار سے باہر ہیں۔ ہمارے ارادے کے اندر نہیں آسکتیں۔وہ دین کے لحاظ سے کتنی ہی اچھی ہوں آدمی ان کے لئے جواب دہ نہیں ہوتا مثلاً نماز کا معاملہ لیتے ہیں۔وضو کرنا، نیت کرنا، نماز کے لئے قیام کرنا، نماز کے ارکان ادا کرنا یہ سب ہمارے اختیار میں ہیں۔اگر ہم یہ سب کچھ نہیں کرتے تو ہم اللہ کے سامنے جواب دہ ہوں گے-لیکن نماز میں دل کی توجہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے- دل کے اندر تو وسوسے آئیں گے۔دل کے اندر طرح طرح کے خیالات بھی آئیں گے۔اس دنیا کی پریشانیاں، معاش کا فکر ، بچوں کی پڑھائی کی فکر، بچوں کی فیس دینے کا مسئلہ، غرض بے شمار قسم کی پریشانیوں میں انسان گھرا رہتا ہے۔جو امیر لوگ ہیں۔وہ دولت کمانے اور دولت کمانے کے ذرائع ڈھونڈنے میں پریشان رہتے ہیں۔بحر حال گھریلو پریشانیاں ہر ایک کو لاحق رہتی ہیں۔اس لئے دل کے اندر وسوسے اور طرح طرح کے خیالات تو آئیں گے ہی۔ان کے لئے کوئی جواب دہی نہیں ہے۔دل کو ان خیالات سے پاک رکھنے کی کوشش نہ کی تو جوابدہی ہوسکتی ہے؟ کہ تم نے کتنی کوشش کی کہ دل میں خیالات اور وسوسے نہ آئیں؟ اس کوشش کے لئے علماء کرام نے کہا ہے کہ

(1) نماز کو ترجمہ سے یاد کیا جائے اور دھیان مطلب پر رکھا جائے-

(2) دوسرے یہ کہ نماز کو الگ تھلگ جا کر ادا کیا جائے۔لیکن یہ تو عورتوں کے لئے ہے۔آدمیوں کے لئے یہ ہے کہ مسجد میں اعتکاف کی نیت کرتے ہوئے داخل ہوں، دھیان نماز کے مطلب پر رکھیں۔اور اپنے آپ کو حالت اعتکاف میں سمجھتے ہوئے پوری کوشش کریں کہ دھیان اللہ کی طرف رہے۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں فرمایا ہے "اگر انسان (مومن بندہ) نماز میں چار جگہ حاضر ہوتا ہے۔تو نماز 100 فیصد قبول ہو جاتی ہے:

1) تکبیر اولیٰ کے وقت 2) اھدنا صراط المستقیم پر 3) رکوع میں جب کہے سبحان ربی العظیم 4) سجدہ میں جب کہے سبحان ربی الاعلیٰ"

اگر صرف تکبیر اولیٰ کے وقت بھی حاضر ہوا تو نماز قبول ہو جائے گی۔لیکن اگر ان چاروں جگہ پر سے کسی جگہ بھی حاضر نہ ہوا۔تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے اللہ کے حضور حاضر ہونے کی کوشش ہی نہیں کی اس پر مواخذہ ہوگا۔باقی نماز میں اپنے آپ وسوسے آنے پر مواخذہ نہیں ہوگا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ نماز میں خشوع کی کمی ہے تو اضافہ مطلوب ہے لیکن لازمی نہیں۔یاد رکھیں! کہ حاضری ضروری ہے حضوری اللہ تعالیٰ خود ہی عطا فرمادیں گے۔لیکن جیسا خشوع ہے، جتنا خلوص ہے اس کے لحاظ سے اجر دے

دیا جائے گا۔ اجر نیت پر ہے اب دیکھیے اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا اکرم ہے کہ ایک کے بدلے میں 10 تو ہر ایک کو دے گا ہی لیکن یہ خلوص پر ہے کہ کسی کو ایک کے بدلے میں 100 ،کسی کو پانچ سو ،کسی کو سات سو گناہ اور اس سے کئی گناہ زیادہ بڑھ سکتا ہے۔

صحابہ کرامؓ نے ایک مرتبہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے فرمایا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ہم اپنے دلوں میں بعض ایسی باتیں پاتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی انہیں زبان پر لانا بھی بہت گراں سمجھتا ہے"۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''کیا تم اس چیز کو (اپنے دلوں میں) پاتے ہو؟''انہوں نے کہا: ''جی ہاں!'' آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''یہی ایمان صریح ہے"۔(صحیح مسلم)

اس لئے کہ چور تو اسی جگہ جاتا ہے جہاں مال ہوتا ہے۔ جہاں پر جتنا زیادہ مال ہوتا ہے وہاں پر ڈاکو اتنا زیادہ ڈاکے ڈالتے ہیں۔ وسوسہ ہی تو شیطان کا ایک اختیار ہے اس کے علاوہ کوئی اختیار اس کو نہیں دیا گیا وہ ہم سے ہاتھ پکڑ کر کام نہیں کرواسکتا نہ ہمارے پاؤں پکڑ کر غلط راستے پر ڈال سکتا ہے۔ایک ہی اختیار اس کے پاس ہے کہ دل میں یہ خیال ڈال دے یا وسوسہ ڈال دے۔

کسی شخص نے ایک بزرگ سے سوال کیا" ہمارے دل میں بے شمار خیالات آتے ہیں۔کیا علاج کریں"؟ فرمایا" دل تو ایک سڑک ہے اس پر اچھی گاڑیاں بھی چلتی ہیں بری گاڑیاں بھی چلتی ہیں۔اس سڑک پر گھوڑے بھی چلیں گے۔گدھے بھی چلیں گے۔یہ انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اچھے خیالات دل میں لائیں۔نیکی کی بات سوچیں۔نیکی کے عزائم دل میں لائیں۔اللہ کا ذکر کرنے لگیں۔ بری باتوں کو ذہن سے نکالنے کی طرف توجہ بھی نہ دیں"۔

اللہ تعالیٰ نے امت محمدی خاتم النبیین ﷺ کی عمریں کم ہونے کی وجہ سے انہیں کچھ مہینے، کچھ دن اور کچھ راتیں ایسی عطا فرمائی ہیں۔جن میں عبادت کرنے کا ثواب عام مہینوں، عام دنوں اور عام راتوں سے ہزار گناہ زیادہ ہے۔

1-مہینوں میں محرم، رجب، ذیقعدہ، اور ذالحجہ　2-دنوں میں یوم عاشورہ، یوم عرفہ اور یوم جمعہ　3-راتوں میں شب معراج، شب برات اور شب قدر

صحیح بخاری میں عبداللہ بن عمرؓ کی سند سے روایت ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ''گزشتہ امتوں کے مقابلے میں تمہاری عمراتنی ہے جتنا عرصہ نماز عصر سے لے کر مغرب تک کا ہوتا ہے"۔

1۔اہل توریت نے توریت پر عمل کیا یہاں تک کے عین دوپہر کے وقت وہ عاجز آ گئے، ان کو ایک قیراط (دینار کا 6/4 کی چیز کا چوبیسواں حصہ) دیا گیا۔

2) پھر اہل انجیل کو انجیل دی گئی انہوں نے نماز ظہر سے نماز عصر تک اس پر عمل کیا پھر وہ بھی عاجز آ گئے۔انہیں بھی ایک قیراط عطا کیا گیا۔

3) پھر ہمیں قرآن پاک عطا ہوا۔اور غروب آفتاب تک اس پر عمل کیا گیا اور ہمیں دو قیراط ملے-

روز محشر جب یہ اجر ہمیں دیا جائے گا تو اہل کتاب کہیں گے "اے ہمارے رب ہمیں تو نے ایک ایک قراط دیا اور ان کو (مسلمانوں) کو تو نے دو، دو قیراط دیئے۔حالانکہ ہم نے ان سے بڑھ کر کام کیا ہے"۔راوی کا قول ہے "اللہ تعالیٰ فرمائے گا" کیا میں نے تمہاری اجرت میں تم پر کوئی کمی کی ہے؟ (یعنی جتنی اجرت مقرر کی گئی تھی کیا تم کو میں نے پوری نہیں دی؟) وہ کہیں گے "نہیں اجرت تو آپ نے ہمیں پوری دی ہے"-اللہ تعالیٰ فرمائے گا" پھر یہ تو میرا فضل ہے جسے چاہیے عنایت کرتا ہوں"۔

مندرجہ بالا حدیث میں یہودیوں کی مدت عمل طلوع آفتاب کے بعد سے ظہر تک ہے۔نصاری کی مدت عمل وہ وقفہ ہے جو نماز ظہر سے عصر تک پھیلا ہوا ہے-اور مسلمانوں کی مدت عمل وہ وقفہ ہے جو نماز عصر سے مغرب تک ہے۔اس حدیث سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ کی امت کو فضیلت بخشی ہے۔لیکن سابقہ امتوں کی اجرت میں نہ تو کمی کی گئی ہے اور نہ ہی ان پر کسی قسم کا ظلم کیا گیا ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے ظلم وزیادتی سے پاک ہے-

حدیث میں قیراط کا ذکر کیا گیا ہے اس قیراط سے مراد جنت میں ان کا حصہ اور ملکیت ہے۔ جنت میں سب سے کم درجہ والے اور کم ملکیت والے شخص کو بھی اس کی خواہش سے 10 گناہ زیادہ اجر دیا جائے گا۔اس صورت میں قیراط سے مراد مکمل اور کامل بہت بڑی اجرت ہے۔اہل کتاب کو غصہ اس لئے نہیں آیا کہ ان کی حق تلفی ہوئی یا انکو اجرت کم ملی۔ بلکہ ان کے غصہ کا سبب وہ حسد ہے جو ان کے دل میں امت محمد خاتم النبیین ﷺ کی فضیلت کی وجہ سے موجود ہے۔

امت محمد خاتم النبیین ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرمایا ہے وہ جسے چاہے جو چاہے عطا کرتا ہے۔وہ اپنے اس کرم وفضل کے لئے کسی کو جواب دہ نہیں ہے وہ مالک کل ہے اس کی مرضی قرآن پاک سورہ آل عمران، آیت نمبر 26 میں فرمان الہیٰ ہے: ''اے اللہ بادشاہت کے مالک تو جسے چاہتا ہے بادشاہت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ۔بادشاہت چھین لیتا ہے۔اور تو جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے"۔

تو بھلائی اور قدرت صرف اور صرف اللہ کی ذات کے پاس ہے۔حضرت داوٗدؑ سے ایک مرتبہ فرمان الٰہی ہوا۔
ترجمہ: (مفہوم) '' اے داوٗد تو بھی چاہتا ہے اور میں بھی چاہتا ہوں۔اگر تو میرے چاہنے میں راضی ہو جائے گا تو میں تجھے تیرے چاہنے میں نواز دوں گا۔اور اگر تو میرے چاہنے میں راضی نہیں ہو گا تو میں تجھے تیری چاہت میں پھنسا دوں گا۔پھر بھی وہی ہو گا وہ جو میں چاہتا ہوں''۔
بنی اسرائیل اللہ کی لاڈلی قوم تھی لیکن نافرمانی نے ختم کر دیا۔
قرآن پاک سورہ زمر، آیت نمبر 9 میں فرمان الٰہی ہے'' کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں"۔
قرآن پاک سورہ ہود، آیت نمبر 24 میں فرمان الٰہی ہے'' کیا ایک اندھا اور بہرا، دوسرا دیکھنے والا اور سننے والا برابر ہو سکتے ہیں"؟
کیا وہ لوگ جنہوں نے ایک گونگے بچھڑے کے متعلق کہا کہ '' وہ تمہارا بھی معبود ہے اور موسیٰ کا بھی"۔(سورہ طہٰ، آیت نمبر 88)
ان کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا: "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں"۔(سورہ آل عمران آیت نمبر 2)
کیا وہ لوگ جنہوں نے کہا:''یہودی بولے عزیز اللہ کے بیٹے ہیں اور نصرانی بولے عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں''۔(سورہ توبہ آیت نمبر 30)
ان کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا :''اللہ ایک ہے اور وہ بے نیاز ہے''۔(سورہ اخلاص، آیت نمبر 1 اور 2)
کیا وہ لوگ جنہوں نے کہا:''اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔''(سورہ آل عمران، آیت نمبر 181)
ان کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا''اللہ غنی ہے اور تم محتاج ہو''۔(سورہ محمد، آیت نمبر 38)
کیا وہ لوگ جنہوں نے کہا: ''کیا تمہارا رب ہمارے لیئے دسترخوان نازل کر سکتا ہے''۔(سورہ المائدہ، آیت نمبر 112)
ان کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا:'' (اے رب) تیرے ہاتھ میں ہی ہر بھلائی ہے'' ۔(سورہ آل عمران ، آیت نمبر 26)
کیا وہ لوگ جنہوں نے کہا:"ہم نے سن لیا اور نافرمانی کی'' ۔(سورہ بقرہ آیت نمبر 93)
ان کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا:''ہم نے سنا اور اطاعت کی'' ۔(سور بقرہ آیت نمبر 285)
کیا جنہوں نے کہا:''جاوٗ تم اور تمہارا رب جا کر لڑو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں"۔(سورہ المائدہ آیت نمبر 24)
ان کے برابر ہو سکتے ہیں جنہوں نے کہا:''اے نبی آپ ہمیں جس جگہ جا کر لڑنے کا حکم دیں گے ہم اس جگہ جا کر لڑیں گے''
کیا مندرجہ بالا لوگ کسی طرح بھی آپس میں برابر ہو سکتے ہیں؟ جب عمل میں برابر نہیں، نافرمانی، سرکشی، بے ادبی اور ہٹ دھرمی میں پیش پیش تو اجر میں کیسے برابری کی توقع کر سکتے ہیں؟؟؟

حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ نے اپنی سند میں بہزا بن حکیم سے روایت کیا ہے جس کو بہزا اپنے والد حکیم سے اور ان کے والدان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''تم لوگ ستر امتوں کے خاتمے کے بعد وجود میں آئے ہو۔تم لوگ اللہ کے نزدیک ان امتوں میں سے سب سے زیادہ بہتر اور باعزت ہو''۔(مندرجہ بالا حدیث کو امام ترمذی نے (3001) میں اور ابن ماجہ نے (4288) میں بیان کیا ہے اس کی سند حسن ہے۔)
تو ہم اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ امت ہیں۔دیکھئے کتنی محبت سے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی قدردانی کی یقین دہانی کروا رہا ہے۔(سورہ بنی اسرائیل، آیت نمبر 19)
وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا
ترجمہ:''اور جو آخرت چاہے اور اس کی سی کوشش کرے اور ہو ایمان والا تو انہیں کی کوشش ٹھکانے لگی''۔
جس نے آخرت کا ارادہ اور ہمت کر لی کہ مجھے آخرت کمانا ہے اور یہ عزم کر لیا اور پختہ ارادہ ہو گیا۔اور پھر اس کے لئے کوشش کی (جیسی کوشش کر سکتا ہے) جتنی اس کی استطاعت ہے۔جیسا کہ اس کا حق ہے اور ایمان کے ساتھ کی۔اور اللہ کے بھروسہ پر کی۔اس کی خاطر کی تو اس کی ان ساری کوششوں کی پوری قدر کی جائے گی۔یعنی ان کو قبول کیا جائے گا اور ان کی بدلہ دیا جائے گا۔تو ایک کے بدلے 10 تو ہر ایک کے لئے ہے اس کے بعد وہ جس کو دینا چاہے اور جتنا دینا چاہے وہ بہترین قدردان ہے۔
اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی سمجھ عطا فرمائے۔قرآنی احکامات کو سمجھ کر عمل کرنے والا بنائے اور نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی اتباع اور آپ خاتم النبیین ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین ثم آمین)

اشرف المخلوقات

قرآن پاک سورہ الاحزاب، آیت نمبر 72 میں فرمان الٰہی ہے:

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ الۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَ اَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَ حَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا

ترجمہ: "ہم نے پیش کی اپنی امانت آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں پر۔ انہوں نے انکار کردیا اور کہا کہ اگر ہم اس بارِ امانت کو اٹھائیں گے تو ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ انسان نے اس کو اٹھالیا۔ بے شک یہ ظالم اور جاہل ہے۔"

اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ پھر ظالم اور جاہل کیسے ہے؟

ہر شے اپنے اندر دو وصف رکھتی ہے:- ایک ظاہری وصف اور دوسرا باطنی وصف

مثلاً پانی ظاہری طور پر رقیق اور سیال مادے کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کی باطنی قوت سٹیم ہے جو بڑی سے بڑی مشین کو معمولی جھٹکے کے ساتھ حرکت میں لے آتی ہے۔ کسی بھی درخت کا کوئی بیج باطنی طور پر اپنے اندر بہت بڑا درخت رکھے ہوئے ہے۔ کوئی بھی پھل اور اس کے اندر خوشبو اور ذائقہ یعنی کائنات میں کوئی وجود اس وصف سے خالی نہیں ہے۔ یعنی ہر موجودہ شے دو اوصاف سے مرکب ہے۔

<u>کوئی انسان جب اپنی ذہنی فکر اور کوششوں سے کسی نئی چیز کو عالم وجود میں لے آتا ہے تو اس کی پہلی اور آخری خواہش یہ ہوتی ہے کہ یہ چیز اس کے تعارف کا سبب بن جائے۔</u> یہ وصف انسان کو اللہ تعالی سے ملا ہے---- **حدیث قدسی:** اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ "میں چھپا ہوا خزانہ تھا میں نے محبت کے ساتھ مخلوق کی تخلیق اس لیے کی کہ میں جانا اور پہچانا جاؤں"۔ (عجلونی، کشف الخفاء، 173:2، الرقم: 2016)

اس فرمان خداوندی کے تحت ہر چیز کو وجود میں لانے والی ہستی کا منشاء اور مقصد یہ ہے کہ کائنات میں جس قدر مصنوعات ہیں وہ اس کے تعارف کا ذریعہ قرار پائیں۔

<u>رسالت کا اقرار اور قرآن پاک کی تعلیمات ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ انسان اگر اپنے باطنی وصف کے علم کو حاصل کرے تو وہ موجودات کو وجود میں لانے والی ہستی کو پہچان سکتا ہے۔ جب تک انسان اس مقصد کو پورا نہیں کرتا بے شک وہ خسارے اور نقصان میں ہے۔</u>

اب ہم انسان کے باطنی وصف کی تشریح کر کے یہ دیکھتے ہیں کہ باطنی وصف سے کیا مراد ہے؟ اور ہم باطنی وصف کا علم کس طرح اور کیسے حاصل کر سکتے ہیں؟

کسی بھی حقیقت کو پوری طرح اس وقت سمجھا جا سکتا ہے جبکہ اس کی اصل سے واقفیت ہو۔ اور اصل سے واقفیت اس وقت ممکن ہوتی ہے جب ہم اس کی جزئیات کا پورا پورا علم رکھتے ہوں---- ہم انسان اور اس کے باطنی وصف کی بات کر رہے ہیں۔ ذہن کا یہ تجسس فطری ہے کہ انسان کیا ہے؟ دنیا میں آنے سے پہلے کہاں تھا؟ یہاں پہنچنے تک اسے کن کن منازل سے گزرنا پڑا؟ اور پھر ایک وقت معینہ کے بعد کسی دوسری منزل کی طرف لوٹ جانے پر کیوں مجبور ہے؟ نہ خود پیدائش پر اس کی مرضی کا انحصار تھا اور نہ ہی موت پر کسی قسم کی دسترس رکھتا ہے۔ آخر وہ کونسا نظام ہے جس کی گرفت اتنی مضبوط اور مستحکم ہے کہ کائنات کی ہر شے مقید اور محکوم نظر آتی ہے؟

اس کا حل قرآن پاک کی تعلیم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ " کن "یعنی اُس ہستی نے فرمایا " کن "یعنی عالم وجود میں آجا جیسا کہ ہمارے ارادے میں ہے۔" فیکون "پس وہ کائنات وجود ہوگئی۔ اُس کی منشاء کے مطابق۔ مگر وہ اُس کے پروگرام سے بے خبر تھی اور اُس پر حیرانی کا عالم طاری تھا۔ جب اُس نے چاہا کہ اس (کائنات) کی حیرانی ختم ہو جائے تو اُس نے فرمایا "أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ " کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تمام نے کہا "بَلٰی" کیوں نہیں بے شک تو ہی ہمارا رب ہے۔ عالم موجودات میں جس نے ربانیت اور وحدانیت کا عہد کر کے اپنے مخلوق ہونے کا اعتراف کیا تھا۔ وہی اصل انسان اور انسان کا باطنی وصف ہے یعنی روح۔

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انسان ازل میں ہیں منشاء الٰہی پورا کرنے کا اقرار اور عہد کر چکا ہے اور یہ کہ توحید کا تصور ازل ہی میں انسان کو دے دیا گیا تھا- پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ انسان اپنے اس عہد کو کہاں تک پورا کرتا ہے اسے مختلف منازل سے گزر کر باطنی وصف کے ساتھ ایک اور ظاہری وصف (جسم) دے کر اس دنیا میں بھیجا گیا اور ساتھ ہی بے شمار وسائل (مخلوقات) بطور نشانی پھیلا دیے تا کہ انسان اپنے تفکر کے ذریعے اس بات کو سمجھ سکے کہ جب اس کے استعمال کی کوئی چیز (وسائل) اس قانون سے باہر نہیں ہے کہ ہر شے دو اوصاف سے مرکب ہے تو پورا انسان اس قانون سے مثتنیٰ کیسے ہو سکتا ہے؟

جس طرح درخت کا کوئی بیج اپنے اندر ایک درخت رکھے ہوئے ہے اس طرح انسان کا یہ مادی جسم اپنے اندر موجود باطنی صلاحیتوں کا تابع ہے۔ جنہیں ہم

روح کی صفات سے تعبیر کرتے ہیں۔ روح کی حرکت ہی دراصل انسانی حرکات وسکنات کا سبب بنتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ حرکت معطل ہو جائے تو انسان کی کوئی بھی حرکت عمل میں نہیں آئے گی۔ عام مشاہدہ یہ ہے کہ جسم ایک وقت معینہ کے بعد معطل اور بے کار ہو جاتا ہے حالانکہ جسمانی طور پر اس میں کسی قسم کی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس کے ناک کان ویسے ہی ہوتے ہیں-کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والا ہر فرد جسم کے اس تعطل کو موت کا نام دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ جسم کو حرکت دینے والی شے نے جسم سے اپنا رشتہ منقطع کر لیا ہے یہی وہ باطنی رخ یا انسان کا وہ باطنی وصف ہے جس کو ہم روح کہتے ہیں---ان حقائق کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ پیدائش کے بعد انسان کا تعلق **تین نظاموں سے ہے:** 1- پہلا نظام وہ ہے جہاں اس نے خالق حقیقی کو دیکھ کر اس کی منشاء کو پورا کرنے کا عہد کیا تھا۔

2- دوسرا نظام وہ ہے جس کو ہم عالم ناسوت، دارالعمل یا پھر امتحان گاہ کہتے ہیں۔

3- تیسرا نظام وہ ہے جہاں انسان کو امتحان کی کامیابی یا ناکامی سے باخبر کیا جائے گا۔

جب ہم اپنی زمین، سورج، چاند، کہکشائی نظام اور کائنات کی ساخت پر غور کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ سارا نظام ایک قاعدے، اور قانون کے تحت کام کر رہا ہے۔ زمین اپنی مخصوص رفتار سے محوری اور طولانی گردش کر رہی ہے، پانی کا بہنا، بخارات بن کر اڑنا، شدید ٹکراؤ سے اس کے مالیکیولز کا ٹوٹنا اور بجلی کا پیدا ہونا اور ماحول کو منور کرنا، حرارت کا وجود میں آنا یہ سب ایک مقررہ قاعدے اور ضابطے کے تحت ہیں۔ اسی طرح حیوانات، نباتات کی پیدائش اور افزائش اور انسانی دنیا میں پیدائش اور نشوونما کا نظام ایک ہی چلا آ رہا ہے۔ وہ پیدا ہو کر بڑھتا ہے اور لڑکپن اور جوانی کے زمانوں سے گزر کر بڑھاپے کے دور میں داخل ہو جاتا ہے اور پھر اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ کوئی نہیں چاہتا کہ وہ بوڑھا ہو لیکن بوڑھا ہونے پر مجبور ہے، کوئی موت نہیں چاہتا لیکن وقت مقرر پر مر جاتا ہے-

ان تمام باتوں پر گہرے غور و بحث کے بعد یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اس قدر منظم اور مربوط نظام کو چلانے والی کوئی ہستی ہے۔ کوئی اسے بھگوان کہتا ہے، کوئی اسے God کہتا ہے، کسی مذہبی صحیفے میں اسے یزدان کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ایل اور ایلیا کے ناموں سے بھی یہ ہستی متعارف ہے۔ نام کچھ بھی ہو بہر حال ہم یہ ماننے اور یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ ایک طاقتور ہستی ہمیں سنبھالے ہوئے ہے اور ساری کائنات پر اسی کی حکمرانی ہے۔

خالق کائنات نے یہ کائنات حق پر پیدا کی ہے- ہر شے کو کسی نہ کسی پروگرام کے تحت تخلیق کیا ہے۔ بلا مقصد یا کھیل کے طور پر کوئی چیز وجود میں نہیں آئی۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انسان کیا ہے؟ عام طور پر انسان کا وجود گوشت پوست اور ہڈیوں سے مرکب جسم ہے۔ جبکہ تمام پیغمبروں نے اور برگزیدہ ہستیوں نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اصل انسان گوشت پوست کا جسم نہیں ہے بلکہ اصل انسان وہ ہے جو اس گوشت پوست کے جسم کے اندر ہے اور وہ ہی اس گوشت پوست کے جسم کو متحرک رکھتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اس اصل انسان کو روح کا نام دیا گیا۔ ہے یعنی گوشت پوست کا جسم اصل انسان کا لباس ہے اور اصل انسان روح ہے۔ مادی جسم گوشت پوست کا جسم صرف ایک لباس کی حیثیت رکھتا ہے-

قرآن پاک سورہ الدھر، آیت نمبر 2-1 میں فرمان الٰہی ہیں "یقیناً گزرا ہے انسان پر ایک وقت زمانے میں جب کہ یہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ بیشک ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے امتحان کے لئے پیدا کیا اور اس کو سنتا دیکھتا بنایا۔"

قرآن پاک سورہ بنی اسرائیل، آیت نمبر 85 میں اللہ تعالی نے حضور پاک (خاتم النبیین ﷺ) سے ارشاد فرمایا:

ترجمہ: "یہ لوگ تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں- آپ (خاتم النبیین ﷺ) کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے"۔

امر کی تعریف سورۃ یس کی آخری آیات میں اس طرح ہے: ترجمہ: "اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا (کن) اور وہ ہو جاتی ہے (فیکون)"-

ان آیات سے فارمولا یہ بنا کے آدمی جسمانی اعتبار سے ناقابل تذکرہ شے ہے۔ اس کے اندر روح ڈال دی گئی تو اسے حواس مل گئے۔ روح اللہ کا امر ہے اور اللہ کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے-

موجودہ سائنس کی دنیا کہکشائی اور شمسی نظاموں سے روشناس ہو چکی ہے۔ کہکشائی اور شمسی زمانوں کی روشنی سے ہماری زمین کا کیا تعلق ہے؟ اور یہ انسان، حیوانات، نباتات اور جمادیات پر کیا اثر کرتی ہے؟ یعنی یہ (لہر) نور یا روشنی کیا ہے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "God said light and there was light" (یعنی اللہ نے کہا روشنی اور روشنی وجود میں آ گئی)

قرآن پاک سورہ نور، آیت نمبر 35 میں فرمان الٰہی ہے: اللہ نور السموات والارض ترجمہ: "اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا"-

مطلب یہ ہوا کہ (لہر) روشنی اور زمین و آسمان کی بساط براہ راست اللہ کی ذات سے (اللہ کے نور سے) قائم ہے۔

اس کا واضح مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ سب دراصل اللہ کے نور (لہر) کا مظاہرہ ہے۔ اس لہر یا نور کو مذہب نے روح کا نام دیا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کی حیثیت دوسری مخلوقات کے درمیان کیا ہے؟ اور اگر یہ تمام مخلوقات سے افضل ہے تو کیوں؟

قرآن پاک سورہ الاحزاب، آیت نمبر 72 میں فرمان الٰہی ہے: "ہم نے پیش کی اپنی امانت آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں پر۔ انہوں نے اس امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر ہم نے اس بار امانت کو اٹھالیا تو ہم ریزہ ریزہ ہوجائیں گے- انسان نے اس کو اٹھالیا بے شک یہ ظالم اور جاہل ہے"۔

قرآن پاک کے اس ارشاد سے پتہ چلتا ہے کہ تخلیق کائنات کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے سامنے اپنی امانت اور اپنی خصوصی نعمت کو پیش کیا۔ سب نے معذرت کی کہ وہ اس بار امانت کے متحمل نہیں ہو سکتے لیکن انسان اس امانت کا امین بننے پر رضامند ہوگیا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی اس خصوصی نعمت کو قبول کرلیا۔ یہی امانت اسے تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ انسان کو ظالم اور جاہل قرار دے رہے ہیں۔ کیا اس نعمت کو قبول کرنا اپنے اوپر ظلم کرنا یا جہالت تھا؟

آسمانوں، زمین اور پہاڑ کی گفتگو ہمارا ذہن اس طرف متوجہ کرتی ہے کہ انسان کی طرح آسمانوں، زمین اور زمین کے اندر تمام ذرات، زمین کے تمام تخلیقات اور پہاڑ شعور رکھتے ہیں۔ جس طرح آدمی کے اندر عقل و شعور کام کرتا ہے اسی طرح یہ تمام چیزیں بھی عقل و شعور رکھتیں ہیں۔ پہاڑوں، آسمانوں اور زمین نے تفکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس بار امانت کے متحمل نہیں ہو سکتے- اس طرح وہ ظلم و جہالت کے دائرے سے باہر نکل گئے-

یہ ظلم اور جہالت ہے کیا؟ **ایسی زندگی جس میں بصیرت شامل نہ ہو وہ ظلم اور جہالت سے تعبیر کی جاتی ہے-**

انسان مٹی سے بنایا گیا ہے انسان نے اللہ تعالیٰ کی اس امانت کو قبول کرلیا- انسان کو اللہ تعالیٰ کی یہ امانت حاصل ہے۔ اگر انسانی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انسان مٹی کے ذرات سے کم عقل اور کوتاہ نظر ہے۔ مٹی کو دیکھیے ایک ہی پانی زمین کی کھوکھ میں جذب ہونے کے بعد اتنی تخلیقات میں جلوہ گر ہوتا ہے کہ ان کا کوئی شمار نہیں۔ لگتا ہے زمین کے بطن میں بے شمار سانچے نصب ہیں جس سانچے میں پانی ٹھہر جاتا ہے وہاں نیا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ کہیں کیلا بن جاتا ہے، کہیں سیب، کہیں پھول-

انسان اور زمین کا تجزیہ کیا جائے تو ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ زمین انسان سے زیادہ باصلاحیت ہے- لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق انسان اشرف الخلوقات ہے- **بصیرت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم تلاش کریں کہ اشرف المخلوقات ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ اور انسان ظالم اور جاہل کیسے ہے؟**

پیدائش، بھوک، پیاس، خواہشات، شعور چاہے جسمانی ہوں یا جنسی- انسان ان چیزوں میں دوسری مخلوقات کے برابر ہے۔

البتہ مظاہراتی زندگی سے ہٹ کر اس درجے پر فائز ہے جو آسمانوں، پہاڑوں اور زمین کو حاصل نہیں- یعنی وہ اللہ تعالیٰ کا امین ہے۔ **کوئی انسان اگر اس امانت سے واقفیت رکھتا ہے تو وہ اشرف الخلوقات ہے۔ بصورت دیگر آدم زاد اور دوسری مخلوقات میں کوئی فرق نہیں۔**

انسان میں سمجھ، عقل، فہم، تدبر اور تفکر کرنے کی صلاحیت ہے- **اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمت حاصل ہونے کے باوجود اس نعمت سے بے خبر رہنا یا بے خبر ہونا سراسر ظلم اور جہل ہے۔ اس جہل سے کیسے نکلیں؟** اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس خصوصی انعام سے مستفید ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمیں اپنی ذات کا عرفان حاصل ہو۔ تصوف میں اس علم کو خود آگاہی کا نام دیا گیا ہے۔ خود آگاہی کے بعد انسان کے اوپر علوم کے جو دروازے کھل جاتے ہیں- ان سے گزر کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا رشتہ مستحکم ہوجاتا ہے۔ اور پھر وہ اس امانت سے واقف ہوجاتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اس کو ودیعت فرمائی ہے۔ **اللہ تعالیٰ کی پیش کردہ اس امانت سے واقف ہونا ہی انسان کو اشرف الخلوقات کے رتبے پر فائز کرتا ہے۔ اور اگر وہ اس امانت سے واقف نہیں ہے تو بیشک وہ ظالم اور جاہل ہے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس امانت سے جس کو بار امانت کہا جاتا ہے کا مطلب کیا ہے؟**

امانت سے مراد:- امانت سے مراد صلاحیت، سکت، ذہنی استعداد، روح کی طاقت اور قوت پرواز ہے۔ ایسی قوت پرواز کہ جب انسان اس قوت پرواز سے واقف ہوجاتا ہے تو آسمانوں سے گزر کر عرش سے بھی اوپر نکل جاتا ہے۔

انسان نے بلا سوچے سمجھے وہ صلاحیت تو قبول کر لی لیکن کبھی سوچا ہی نہیں کہ کائنات میں وہ اللہ تعالیٰ کی واحد مخلوق ہے جو اس کی امین ہے۔ مگر اس امین مخلوق کی

حالت یہ ہے کہ وہ فانی دنیا کی کیچڑ میں تولت پت ہو سکتی ہے۔لیکن اس کا ذہن کبھی اس امانت کی طرف نہیں جاتا۔انسان سونا، چاندی اور بیوی بچوں کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے۔ **جب کہ اس کی زندگی کی اصل تو وہ امانت ہے۔جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کی اور کائنات میں کسی دوسری مخلوق کو یہ اعزاز حاصل نہیں۔**

ہماری اس دنیا کی طرح بے شمار دنیا کے عالم ہیں۔ان تمام عالم میں بھی انسان ہی امین ہے۔انسان کی فضیلت کا شرف اس بنا پر نہیں ہے کہ انسان کے اندر تھوڑی سی عقل زیادہ ہے بلکہ **انسان کا شرف یہ ہے کہ اس کے اندر ایسی صلاحیت موجود ہے کہ وہ زمین و آسمان کے کناروں سے باہر نکل کر اللہ تعالی کے حضور سجدہ کر سکتا ہے۔**

انسان کے گوشت پوست کی حیثیت اس وقت تک ہے جب تک اس کے اندر روح موجود ہے۔روح کا دوسرا نام نور ہے۔روح کو نور کے علاوہ دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔

آدمی کے محدود طرز فکر (صرف دنیا کی فکر)، دنیا کی محبت، حرص، لالچ اور سونے چاندی کے سکوں کے عشق نے اس نور کے اوپر غلاف ڈال دیا ہے۔اللہ تعالی نے تو اس کے لئے سب کچھ تیار کر کے اسے دے دیا لیکن آدمی نے اپنے ارادے اور اپنے اختیار سے گہرے اندھیرے کی چادر اوڑھ کر خود کو کثافت سے بھر لیا ہے۔

اے انسان---
تو کوئی انجان سا پتھر بھی نہیں ہے — تو کوئی فرشتہ یا پیمبر بھی نہیں ہے
تو علم کا چشمہ یا سمندر بھی نہیں ہے — پر رب کی نگاہوں میں تو کمتر بھی نہیں ہے
جو کچھ بھی ہے تو اپنی حدوں کو پہچان — رحمان کی پکڑ سے تو باہر بھی نہیں ہے
دنیا نہ بسا دل میں کہ دنیا کی حقیقت — مچھر کے کسی پر کے برابر بھی نہیں ہے

انسان کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ اپنی ذات اور اس وصف کا عرفان حاصل کرے (تلاش کرے) جس نے اللہ تعالی کے روبرو اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ اللہ تعالی کی منشا کو پورا کر کے اللہ تعالی کا عرفان حاصل کرے گا۔رسالت و نبوت اس تعلیم کو تصوف یا طریقت کا نام دے کر ہمارے سامنے ان الفاظ میں پیش کرتی ہے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ" "جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا پس تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچان لیا"۔(بحار الانوار، ج2،ص32)

یعنی اس مقصد حقیقی کو وہی پا سکتا ہے جو اپنی ذات کے باطنی رخ یا روح کا عرفان رکھتا ہو۔جو اللہ تعالی کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کو یاد رکھے۔اسی یاد دہانی کی تکمیل کے لئے اللہ تعالی نے ہر زمانے میں انبیاء اور رسولوں کو صحائف اور کتابوں کے ساتھ مبعوث فرمایا۔**بارگاہ الٰہی میں تعمیل حکم کی قدر کی جاتی ہے اور تعمیل حکم ہی اصل عبادت ہے۔**

حضور پاک (خاتم النبیین ﷺ) کا ارشاد ہے: "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ"

"جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا پس تحقیق اس نے اپنے رب کو پہچان لیا"۔(بحار الانوار، ج2،ص32)

اپنا عرفان رکھنے والا شخص ہی خالق کائنات کا عرفان حاصل کر سکتا ہے اور وہی اشرف المخلوقات کہلائے جانے کا مستحق ہے-ورنہ انسان جاہل اور ظالم ہے کہ اس نے بار امانت کو تو اٹھا لیا لیکن اس کی قدر نہ کی--اس کی قدر کیسے کی جائے؟

انسان کا اصل رخ یہ ہے کہ وہ اللہ کے قریب ہے لیکن وہ ہمیشہ نقلی رخ (دنیا) کو اہمیت دیتا ہے۔اصل رخ (روح) کو اس نے کبھی اہمیت نہیں دی۔

روحانیت ہمارے اوپر یہ دروازہ کھولتی ہے کے ہر آدمی اپنے باطنی وجود میں اللہ کا دوست ہے۔ہر انسان کا باطن روح ہے اور روح اللہ کی دوست ہے۔

جب سے انسان نے اپنے باطن سے نظریں چرائی ہیں اللہ کا دشمن بن گیا ہے اور یہ دشمنی ہی بے سکونی ہے، پریشانی اور اضطراب ہے۔یہ کیسا ظلم ہے؟ یہ کیسا ستم ہے؟ یہ کس قسم کی ناشکری اور کفران نعمت ہے کہ ہر آدمی کے اندر سکون کی نہریں بہہ رہی ہیں اور وہ ان نہروں کی طرف نہیں دیکھتا، جب بھی دیکھتا ہے باہر دیکھتا ہے۔اس دنیا کو دیکھتا ہے پھر کہتا ہے کہ بہت پریشان ہوں اور پریشانی سے بچنا بھی چاہتا ہے۔یہ کیسی حماقت ہے کہ رب ہمارے اندر ہے اور ہمارا ذہن اس طرف نہیں جاتا-ہم کہتے ہیں کہ ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں جبکہ تمام تر دعائیں ہم اس ظاہری دنیا کی کامیابی کے لئے ہی مانگتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے اپنے قریب نور کا ایک ہیولہ نظر آیا۔نماز سے فارغ ہونے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ یہ ایک فرشتہ ہے-فرشتے نے اس شخص سے کہا" تم مانگو تمہیں اللہ تعالی سے کیا کچھ چاہیے؟ میں تمہارا پیغام اللہ تعالی کو پہنچا دوں گا"۔اس شخص نے جواب دیا" مجھے دنیا کی فلاں چیز چاہیے، مجھے فلاں چیز چاہیے، مجھے فلاں چیز چاہیے"۔ابھی وہ شخص اپنی دنیا کی خواہشات کی فہرست بتا ہی رہا تھا کہ فرشتے نے اسے ٹوک دیا اور کہا" بس بس میں سمجھ گیا کہ تمہیں اللہ تعالی سے کیا چاہیے"؟؟ اس شخص نے کہا" میں نے تو ابھی اپنی تمام خواہشات کو بتایا ہی نہیں پھر تمہیں کیسے پتا چل گیا"؟؟ فرشتے نے جواب دیا" مجھے پتہ چل گیا ہے میں اللہ عزوجل کے پاس جاؤں گا اور کہوں گا کہ اس شخص کو تیری ذات کے سوا دنیا کی ہر چیز چاہیے"۔

اس لئے اگر ہم صرف دنیا کے خواہش مند ہیں اور اپنے اندر کے انسان کو (یعنی روح) دیکھنے کی توجہ نہیں دیتے تو پھر ہم حیوان ہیں، ظالم اور جاہل ہیں۔ پیغمبروں نے ہمیں اس بات کا شعور دیا ہے کہ ہم اپنی عقل وفکر کو استعمال کر کے اپنے آپ کو حیوانات سے کسی طرح ممتاز کر سکتے ہیں۔ اس کا طریقہ کار ہمیں رسول پاک خاتم النبیین (خاتم النبیین ﷺ) نے غار حرا کی زندگی سے سمجھا دیا ہے۔ ہمیں عمل سے بتا دیا۔ آپ (خاتم النبیین ﷺ) ہمیں زندگی گزار کر دکھا گئے اور بتا گئے کہ یہ دنیا دھوکے کا گھر ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے پیغمبر حضرت محمد خاتم النبیین (خاتم النبیین ﷺ) کے نقش قدم پر چل کر ایسا طریقہ اختیار کریں۔ جس سے ہمارے اندر یہ بات مشاہدہ بن جائے کہ انسان کی صلاحیتیں محدود نہیں ہیں۔ یعنی کوئی انسان اگر چاہے تو ٹائم اور سپیس کی گرفت سے آزاد ہو سکتا ہے اور اپنے رب کا عرفان حاصل کر سکتا ہے۔

شریعت میں اس کا بنیادی طریقہ یہ ہے کہ ہر طرف سے توجہ ہٹا کر پوری یکسوئی سے ایک مرکز پر خود کو متوجہ کر لیا جائے بس یہی CONCENTRATION آدمی کو اصل انسان سے متعارف کرا دیتی ہے۔ **تصوف میں** اس کا نام مراقبہ ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے نظر کے قانون کو بیان کرنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ:

نظر کا قانون کیا ہے؟ بظاہر یہ ایک مشکل سا جملہ لگتا ہے لیکن یہ کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہے بس سمجھنے کی ضرورت ہے۔

آدمی دو طرح دیکھتا ہے:　　1- ایک براہ راست　　2- دوسرا بالواسطہ

(1) براہ راست دیکھنا یہ ہے کہ ہماری نظر کسی چیز کے مادی خول سے ٹکرائے بغیر اس کی حقیقت کا مشاہدہ کرے۔

(2) بالواسطہ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری نظر کسی چیز کے مادی خول سے ٹکرا کر رک جائے اور ہم اس کا مشاہدہ کر لیں۔

غیب کی دنیا کا مشاہدہ کرنے کے لئے براہ راست نظر کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

ہر انسان پیدائش سے موت تک دو کیفیات میں سفر کرتا ہے ایک کیفیت کا نام بیداری ہے اور دوسری کیفیت کا نام نیند یا خواب ہے۔

CONCENTRATION میں انسان پر وہ حالتیں طاری ہو جاتی ہیں جن میں وہ سو جاتا ہے یا خواب دیکھتا ہے۔ یعنی وہ ٹائم اور سپیس کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ **قرآن پاک کی اصطلاح "صلوٰۃ قائم کرو" ہمیں اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ ہم نماز میں ذہنی مرکزیت حاصل کر کے اصل انسان سے واقف ہو جائیں"۔ صلوۃ" کے ساتھ قائم کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نماز میں ذہنی مرکزیت (CONCENTRATION) اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جائے۔ اس کے برعکس اگر نماز میں ذہنی مرکزیت قائم نہ ہو (تو تصوف کی اصطلاح میں) وہ نماز نہیں ہے۔**

قرآن پاک سورہ ماعون، آیت نمبر 5-4 میں فرمان الٰہی ہے　　ترجمہ: "ہلاکت ہے ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے بے خبر ہیں"۔

ایک اور جگہ قرآن پاک سورہ مومنون، آیت نمبر 1 میں فرمان الٰہی ہے　　ترجمہ:۔ "فلاح پائی ان مومنون نے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں"۔

قیام، صلوۃ اور نماز میں خشوع اور خضوع حاصل کرنے کے لئے (Concentration) ضروری ہے اور اس مقصد کی پریکٹس (Concentration) کے لیے مراقبہ بہترین چیز ہے۔ جب کوئی انسان concentration یا مراقبہ سے گہرائی میں اتر جاتا ہے تو اس گہرائی میں اسے نیا باطنی وجود نظر آتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی ذات کا احساس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "جہاں تم ایک ہو وہاں میں دوسرا ہوں اور جہاں تم دو ہو وہاں میں تیسرا ہو"۔

یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز پر عیاں ہے۔ اللہ تعالیٰ تو انسان کی شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ اللہ تو انسان کے اندر ہے کیوں کہ انسان کے اندر روح ہے۔

قرآن پاک سورہ الدھر، آیت نمبر 2-1 میں فرمان الٰہی ہے: "یقیناً گزرا ہے انسان پر ایک وقت زمانے میں جب کہ یہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا۔ بیشک ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے امتحان کے لئے پیدا کیا اور اس کو سنتا دیکھتا بنایا۔"

قرآن پاک سورہ الاحزاب، آیت نمبر 72 میں فرمان الٰہی ہے: "ہم نے پیش کی اپنی امانت آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں پر۔ انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر ہم اس بار امانت کو اٹھائیں گے تو ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک یہ ظالم اور جاہل ہے۔"

اب ہمیں بخوبی اندازہ ہو جانا چاہئیے کہ کس نے رب کی ذات کا عرفان حاصل کر لیا (یہ عرفان حاصل کرنے کی صلاحیت اللہ نے ہر انسان کو دی ہے) اور کون دنیا کی زندگی میں کھو کر ظالم اور جاہل رہ گیا؟؟؟

اے خاک کے پتلے تجھے ادراک نہیں ہے
کچھ اور بھی ہے تجھ میں فقط خاک نہیں ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تعلق مع اللہ

جس طرح انسانی تعلقات کے کئی درجے ہیں مثلاً پہلے شناسائی، پھر دوستی، پھر محبت اور پھر عشق۔اسی طرح اللہ تعالیٰ سے تعلقات کے کئی مراحل ہیں مثلاً پہلے ترکِ گناہ پھر اعمال، پھر بلند اعمالی، پھر شب بیداری اور سحر خیزی پھر فنافی الذات۔ یہ ایک کھٹن سفر ہے۔ہم اس کھٹن سفر میں آسان طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے رابطہ پیدا کرنے کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ **انسان گناہ کو چھوڑ دے۔**

جھوٹ، فریب، منافقت، بددیانتی، بے رحمی، فحش کاری، رعونت، لالچ اور دیگر رذائل (بری عادات) کو ترک کرنے کے بعد دوسرا قدم اعمال اور خیالات میں بلندی اور پاکیزگی پیدا کرنا ہے۔ جب یہ اعمال ہوں گے تو دماغ خوف وخطر سے آزاد ہو جائے گا۔ نہ دنیا میں کسی محاسبے کا ڈر رہے گا اور نہ آخرت میں۔حرص ناپید ہو جائے گی تو دنیائے دل بے نیازی سے معمور ہو جائے گا اور اس کے بعد تسلیم ورضا کی نعمت مل جائے گی۔ دراصل عبادت عبوبیت کا نام ہے۔عبوبیت اللہ کی مرضی میں ڈھل جانے کو کہتے ہیں۔جس کے لیے 2 قدم بہت ہی ضروری ہوتے ہیں۔اِن میں **پہلا قدم** ترکِ گناہ ہے۔ترکِ گناہ اور بلند اعمالی اور اُس کے ہر حکم اور ارشاد کی تعمیل، کیونکہ گناہ اللہ کے خلاف بغاوت اور شیطان کی غلامی ہے۔اللہ کے ہر حکم اور اشارے کی تعمیل کے بعد انسان سراپا تسلیم بن جاتا ہے۔اور جب وہ حضوری خداوندی میں سر جھکاتا ہے تو اُس کی روح اور جسم میں ایک کامل ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔

جو عبادت گزار جھوٹ بولتا ہے، غیبت کرتا ہے، ظلم توڑتا ہے، غصہ کرتا ہے، طنز کرتا ہے، منافقت کرتا ہے اور انسانوں کو ستاتا ہے، اُس کا جسم بے شک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے لیکن روح شیطان کی غلامی میں جکڑی رہتی ہے۔جسم فانی ہے، روح غیر فانی ہے، بارگاہ ذوالجلال میں روح نے پیش ہونا ہے۔جسم نے نہیں ، جسم لاکھ عبادت کرے اگر روح عاصی سرکش ہے تو کچھ بھی نہیں ہے پھر جب کوئی شخص پورے خلوص سے عبادت کرتا ہے تو اُسے کئی انعامات ملتے ہیں۔

1۔ وہ ہوا میں اُڑ سکتا ہے۔
2۔ وہ ارواح سے رابطہ کر سکتا ہے۔
3۔ وہ اپنی توجہ سے دوسروں کے گناہوں کو دھو سکتا ہے۔
4۔ وہ غیبی آواز سُن سکتا ہے۔
5۔ وہ آنے والے واقعات کی خبر دے سکتا ہے۔

لیکن یہ تمام مدارج منزل نہیں بلکہ راہ کے نظارے ہیں۔ یہ تمام باتیں محض شعبدہ بازی ہیں۔اور سچے عابد کی منزل تو کہیں بہت آگے ہے۔"یعنی کائنات اور رَبِّ کائنات سے رابطہ "اصل عظمت روح کی عظمت ہے، جسے حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی خواہش میں ڈھل جائے۔عبادت، پاکیزگی اور تقویٰ کو اپنا شعار بنالے، کینہ، کدورت، حسد، حرص اور دیگر سفلی جذبات کو جھٹک دے، دِل میں محبت اور عشق کی دنیا بسالے اور اِس کے بعد ہماری بصارت اور سماعت کا یہ عالم ہو جائے کہ ہر ذرّے میں ذرہ طور نظر آنے لگے۔تمام انبیاءعلیہ السلام اور اولیاءاللہ اِس بات پر متفق ہیں کہ تمام مسرتوں، نعمتوں اور لذتوں کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور جب تک اللہ سے رابطہ پیدا نہ کیا جائے یہ چیزیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔

اَب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رابطہ کیسے پیدا ہو؟ (یعنی تعلق کیسے بنے؟) یہ ہے وہ سوال جس پر تمام نسلِ انسانی کے اہلِ علم نے صدیوں سوچا مختلف تجربے کئے اور آخرکار کچھ اصول منضبط کیے جو ہر جگہ ایک ہی جیسے ہیں بس طریق کار کا فرق ہے۔یعنی مسلمان ہو یا عیسائی، ہندو ہو یا تبتی یوگا، سب میں چند چیزیں مشترکہ ہیں یعنی پاکیزگی، افکار واعمال، ذکر تسبیح، اور ذاتِ الٰہی میں محویت۔فرق صرف یہ ہے کہ مسلمان جسم اور روح دونوں کے جائز تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور یوگی تمام جسمانی اور مادی خواہشات کو جھٹک کر کسی غار میں جا بیٹھتا ہے۔روح میں بالیدگی اور قوت پیدا کرنے کے لیے مسلم اور غیر مسلم صوفیا کرام کے ہاں ایک ہی طریقہ ہے۔یعنی تمام فکری اور ذہنی آلائشوں سے پاک ہونا اور پھر عبادت کرنا، عبادت سے روح کیوں توانا ہوتی ہے؟ اور اِس کے بعد کائنات کی تمام طاقتیں ہماری امداد پر کیوں تیار ہو جاتی ہیں؟ ہم اس پر کوئی عقلی دلیل نہیں دے سکتے۔لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس بات پر ہم سوا لاکھ انبیاء، لاتعداد اَولیاء، کروڑوں راہبوں کی شہادت پیش کر سکتے ہیں۔مثلاً نظام الدّین اولیاءؒ، خواجہ اجمیریؒ، سلطان باہوؒ، بابا فرید گنج شکرؒ، بوعلی قلندرؒ، داتا گنج بخشؒ وغیرہ۔**یہ "دانیان رازفطرت" ایک ہی بات بتاتے رہے کہ "اللہ کے سامنے جھکنے کے بعد تمام کائنات تمہارے آگے جھک جائے گی"۔**

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:(سورۃ طٰہٰ، آیت نمبر 130)

"اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرو، سجدے میں گرو اور عبادت کرو، تاکہ تمہیں نعمت یقین حاصل ہوجائے طلوع وغروب آفتاب سے پہلے، دوران شب اور دن کے کناروں پر اللہ کی حمد وثنا کیا کروتا کہ تمہیں مسرت وشادمانی نصیب ہو"۔

ایک عابد منزل بہ منزل اللہ کی طرف بڑھتا ہے۔ جب ایک اِنسان ترک گناہ کے بعد عبادت کو اپنا معمول بنالیتا ہے اور رات کے پرسکون ماحول میں اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو رفتہ رفتہ دل میں یقین پیدا ہوجاتا ہے کہ اَب میری یہ صدا بے کار نہیں جائے گی، اَب مَیں رب سے قریب ہوگیا ہوں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:(سورہ زمر، آیت نمبر 9)

ترجمہ:" کیا وہ شخص جو رات کو قیام وسجود کی حالت میں اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے، اپنے اعمال سے ڈرتا ہے اور رحمتِ الٰہی کی امید رکھتا ہے اور وہ شخص جو ان صفات سے محروم ہیں، برابر ہوسکتے ہیں؟ اے رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کہہ دو کہ ارباب علم اور جاہل برابر نہیں ہوسکتے اور یہ باتیں دانش مندوں کے لیے بیان ہوتی ہیں" ۔

مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے عبادت کو علم کہا ہے۔ **یہ اس لیے کہ علم ایک ایسی قوت ہے جو کائنات کو مسخر کرسکتی ہے اور عبادت وہ توانائی ہے جو حدود زماں و مکاں کو توڑ کر ہمیں ربِ کائنات کے حضور میں کھڑا کردیتی ہے۔ علم سے دماغ کو اور عبادت سے رُوح کو نور ملتا ہے۔ فرشتوں پر انسان کی فوقیت علم سے ہے۔ اور انسانوں پر ان کی برتری عبادت سے ہے۔** قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے(سورہ الحجرات، آیت نمبر 13)

ترجمہ:"تم میں سے بڑا اور عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے"۔

جب ہم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق، ہر فعل اور ہر قدم ہمارے فائدے کے لیے ہے، یہ بادل، یہ ہوا، یہ درخت، یہ پھل و پھول، یہ اناج، یہ سورج، یہ پانی، یہ آگ، یہ روشنی، یہ خزاں، یہ بہار، یہ زمین، یہ آسمان، یہ چاند، یہ جانور، یہ سب ہماری خدمت کے لیے رَبِ کائنات نے بنائے، ہماری جسمانی ضروریات کے ساتھ ساتھ اُس ذاتِ باری تعالیٰ نے ہماری روحانی تقاضوں کی تسکین کا بھی انتظام کیا ہے۔

اُس نے سینکڑوں کتابیں، صحیفے اُتارے، لاکھوں نبی بھیجے، اولیا کرام کا ایک تانتا باندھا، جب اللہ تعالیٰ کی ہر تخلیق ہمارے فائدے کے لیے ہے اور اِسی وجہ سے ہم اُسے رَبِّ العالمین، رحیم اور کریم کہتے ہیں تو پھر نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ فیض رساں رحیم اور کریم رب کو انہی لوگوں سے پیار ہوسکتا ہے۔ جن میں رحم، محبت، فیاضی، خدمت اور مروت کے خدائی اوصاف موجود ہوں، فیاض خدا بےفیض انسانوں کو کیسے پسند کرسکتا ہے؟ ساری کائنات سے محبت کرنے والا رَب، ظالم، سنگدل اور جفا کار کے ساتھ کیسے ہوسکتا ہے؟ پاکیزہ، جمیل اور لطیف اللہ کا رابطہ اور دوستی، ناپاک، غلیظ اور بدکار افراد سے کیسے ہوسکتی ہے؟ اِس لیے ہمارے بہترین اعمال ہی وہ رشتہ ہیں جو ہمیں ربِ کائنات سے منسلک کرسکتے ہیں۔ یہ رِشتہ قائم ہونے کے بعد جہان مخفی کی تمام اچھی طاقتیں (ملائکہ اور ارواح) ہماری مددگار بن جاتی ہیں اور ہر معاملے میں ہماری مدد کرتی ہیں۔ اُمّ موسیٰ کا دریا میں بہایا ہوا صندوق ساحل پر لگاتی ہیں اور موسیٰ علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی ملاقات کا بندوبست کرتی ہیں۔ اِس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم کوئی ایسی حرکت نہ کریں جن سے ان مخفی دوستوں کا مزاج برہم ہوجائے۔ جن لوگوں نے اِس مخفی دنیا سے رابطہ قائم کیا ہے۔ مثلاً اولیاء اللہ اور انبیاء علیہ السلام ان تمام کا تجربہ یہ ہے کہ یہ طاقتیں نیکی سے خوش ہوتی ہیں، اور گناہ سے اِن کی پیشانی پر بَل پڑ جاتے ہیں۔

ایک حکیم کا قول ہے "بعض چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی مثلاً طنز، ناشائستہ ریمارکس اور مذاق وغیرہ سبھی مضر اثرات کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ **اللہ تعالیٰ کے کچھ انعامات ایسے ہیں جو براہ راست ہم تک آتے ہیں** مثلاً بارش، ہوا، روشنی وغیرہ **اور کچھ انسانوں کی وساطت سے ہمیں ملتے ہیں،** مثلاً علم، شفقت اور محبت وغیرہ۔ اللہ سے تعلق قائم کرنے کے بعد "صاحب رابطہ" اللہ اور اُس کی مخلوق کے درمیان ایک واسطہ یا وسیلہ بن جاتا ہے"۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں(سورہ المائدہ، آیت نمبر 35)

ترجمہ:"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو"-

اِس کائنات میں اتفاق نام کی کوئی چیز نہیں ہے، ہر واقعہ ایک سکیم اور پلان کے تحت ظہور میں آتا ہے، اگر ہم کسی بیماری یا حادثے کا شکار ہوتے ہیں تو اس کی وجہ طبعی، اِخلاقی یا روحانی قانون کی خلاف ورزی ہے۔ ایک کمزور کشتی کو طوفان امواج میں ڈال دینا، طبعی قانون کی خلاف ورزی ہے۔ اِس کشتی کا ڈوب جانا یقینی ہے۔ آگ میں کودنے کا لازمی نتیجہ جلنا ہے، کیونکہ آگ اور جلنے کا رشتہ بالکل واضح ہے۔ دوسری طرف انسانی زندگی کچھ ایسے حوادث سے بھی دوچار ہوتی ہے۔ جہاں اعمال

اور نتائج میں کوئی علاقہ قائم کرنا دشوار ہوتا ہے۔ فرض کیا ایک دولت مند مردم آزار (لوگوں کو تکلیف دینے والا بُرا شخص) اپنے اثر و رسوخ اور دولت کی وجہ سے ملک کے قانون کی گرفت سے بچتا چلا جاتا ہے، اور پھر کسی نہ کسی منزل پر اُسے فالج ہو جاتا ہے تو یہ اُسے اُس کے کرتوتوں کی سزا ملی ہے۔ لیکن یہ بات ہم اُسے نہیں سمجھا سکتے کہ کس قاعدے سے تمہاری یہ مردم آزاری فالج کی علت بنی ہے۔ ہر بدکار کی زندگی پر ایسے حوادث آئے دن ٹوٹتے رہتے ہیں، کبھی گاڑی کی ٹکر ہو گئی، کبھی پیر ٹوٹ گیا، کبھی بچہ چھت سے گر گیا، کبھی بچہ ڈوب گیا، کبھی فالج گر گیا وغیرہ وغیرہ۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ (سورہ النساء، آیت نمبر 62)

ترجمہ: "(نافرمانوں پر) اُن کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی مصیبت آ پڑتی ہے"

گناہ اور دُکھ نیز نیکی اور سُکھ میں کوئی ایسا رشتہ ضرور موجود ہے جو ہم نہیں دیکھ سکتے اور نہ ہم اُسے سمجھ سکتے ہیں۔ اس زندگی کا سفر اللہ سے شروع ہو کر اللہ ہی پر ختم ہوتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی انسان کی آخری منزل ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے (سورہ النجم، آیت نمبر 42)

ترجمہ: "تمہاری آخری منزل اللہ تعالیٰ ہی ہے"

کوئی مسافر منزل کے تصور سے غافل نہیں ہو سکتا اور پورا خیال رکھتا ہے کہ راہ سے بھٹک نہ جائے۔ زندگی کی شاہراہ پر ہر مسافر کو مختلف قسم کے حوادث پیش آتے ہیں، کبھی سرکش اور نافرمانی پر اتر آتا ہے، کبھی گناہ کے غاروں میں گر جاتا ہے اور کبھی عارضی اور فانی دنیا میں اُلجھ کر منزل سے غافل ہو جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ہم پر خاص نوازش ہے کہ اُس نے منزل کی تمام علامات ہمیں بتا دی ہیں، پگڈنڈیوں سے خبردار کر دیا، غاروں اور گڑھوں کا پتہ بتا دیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ" ہماری جبروت اور عزت کے گن گانے والے اور راتوں کو ہمارے حضور میں گڑگڑانے والے نہ تو راہ سے بھٹکیں گے اور نہ ہی مصائب کا شکار ہوں گے"۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کے لیے بہترین اور مختصر راستہ **"ترکِ گناہ"** کے بعد **"شریعت کی پابندی"** کے ساتھ ساتھ **"ذکر اللہ"** ہے، منطقی طور پر ذکر اللہ اور مسرت میں کوئی رابطہ قائم کرنا ناممکن ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جو لوگ گناہوں سے بچنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ذکر کی صورت میں کرتے ہیں وہ ضرور دولتِ سکون و اطمینان سے نوازے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں: (سورہ رعد، آیت نمبر 28)

ترجمہ: "یاد رکھو کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے-"

ذکرِ الٰہی سے وہ طاقتیں جنہیں ہم ملائکہ کہتے ہیں خوش ہوتی ہیں۔ ذِکر اور تقویٰ سے وہ داخلی اِنسان (رُوح) جو اِس جسم خاکی کے غلاف میں لپٹا ہوا ہے، خوبصورت اور لطیف بن جاتا ہے اور فرشتے اِس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ ملائکہ چونکہ خود اجسام لطیف ہیں اِس لیے اِن کا رشتہ ہمارے جسم لطیف ہی سے قائم ہوتا ہے۔ گناہوں کی وجہ سے جسم لطیف مسخ اور غلیظ ہو جاتا ہے اس سے تعفن کی لپٹیں اُٹھتی ہیں اور فرشتے قریب نہیں آتے، اِس لیے نیک لوگوں کے زیادہ تر کام ملائکہ کی مدد سے انجام پاتے ہیں، حتیٰ کہ وہ جہاد میں جائیں تو فرشتے ساتھ جاتے ہیں (بدر وحنین)

فضاءِ بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اَب بھی

یہ فرشتے نیک لوگوں کو حوادث سے بچاتے ہیں اور کامیابی اور مسرت کی نئی نئی تجاویز ان کے دماغوں میں ڈالتے رہتے ہیں۔ اسباب کی کڑیاں بہم پہنچاتے ہیں۔ لوگوں کے دل میں ان کے لیے جذبہ اِحترام پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو احترام رومیؒ، خیامؒ، شمس تبریزؒ، خواجہ اجمیریؒ، بابا فریدؒ، داتا صاحبؒ اور سید عبدالقادر جیلانیؒ کو ملا وہ بڑے بڑے شہنشاہ اور فاتح کو بھی نہ مل سکا۔ اِس کا مطلب یہ ہے ہوا کہ "ترکِ گناہ"، "شریعت کی پابندی" کے ساتھ "ذکر الٰہی" کا بلند اعمال میں بڑا درجہ ہے۔ اِس کے بعد شب بیداری یا سحر خیزی، بلند اعمال میں بڑا مقام رکھتی ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (سورہ بنی اسرائیل، آیت نمبر 79)

ترجمہ: "رات کے ایک حصے میں جاگ کر نماز پڑھا کرو، ہم (بطور صلہ) عنقریب تمہیں ایک مقام پر پہنچا دیں گے کہ دنیا اِس کی تعریف کرے گی"-

اِحترام و محبوبیت کا یہ مقام جلیل شب خیزی کے بغیر میسر نہیں آ سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ مزمل، آیت نمبر 6 میں ارشاد فرمایا: ترجمہ: "(شب خیزی) شب بیداری، نفس کو کچلنے کے لیے، بہت مفید ہے اس سے بات میں وزن بھی آتا ہے۔"

شریعت کے بعد، مرتبہ احسان یا طریقت یا راہِ سلوک یا تصوف میں بھی اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کے بے شمار فائدے ہیں۔

(1) ہدایت (2) قبولِ دُعا (3) فراخی رزق (4) دُکھ سے نجات (5) بات میں وزن

(6) شخصیت میں کشش (7) دانش یا عقلمندی (8) حفاظت (9) ملائکہ کی دُعائیں

(1) **ہدایت:-** ہدایت سے مُراد دماغ میں ٹھیک تجویز کا القاہے۔ اعمال کی دو اقسام ہیں : (1) مفید (2) مضر

اگر اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہایت عمدہ تجاویز دماغ میں آتی ہیں۔ جن کا نتیجہ لازماً بہتر نکلتا ہے۔ اور اگر سیاہ کاری یا گناہوں کی وجہ سے رابطہ قائم نہ ہو تو پھر شیاطین کی طرف سے تجاویز آتی ہیں اور ان کا نتیجہ ہمیشہ خراب ہی نکلتا ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (سورہ النساء، آیت نمبر 175)

ترجمہ: "تو وہ جو اللہ پر ایمان لائے اور اس کی رسی مضبوط تھامی تو عنقریب اللہ انہیں اپنی رحمت اور اپنے فضل میں داخل کرے گا اور انہیں اپنی طرف سیدھی راہ دکھائے گا"۔

دوسری جگہ سورہ الحج، آیت نمبر 54 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے ترجمہ: "یقیناً اللہ ایمان والوں کو راہ راست کی طرف رہبری کرنے والا ہے"۔

(2) **قبولِ دُعا:-** نیک آدمی کی ہر جائز دُعا قبول ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (سورہ المومن (سورہ غافر)، آیت نمبر 60)

ترجمہ: "مجھ سے دعا کرو میں دعا قبول کروں گا"۔

جبکہ کافروں کی دعا قبول نہیں کی جاتی ہے۔ قرآن پاک سورہ رعد، آیت نمبر 14 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ترجمہ: "کافروں کی دُعا اور پکار اِدھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہے"۔

(3) **فراخی رزق:-** رزق فراخ ہوتا ہے تو زندگی چین سے گزرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت عامہ یہی ہے کہ اُس کے محبوب بندے فقر و فاقہ کے شکار نہیں ہوتے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ فاروقؓ، حیدرؓ، دنیاوی نعمتوں کی پرواہ نہ کریں اور جو کچھ ہاتھ آئے خواہ وہ کسریٰ کے لامحدود خزائن ہی کیوں نہ ہوں فوراً اللہ کی راہ میں تقسیم کر دیں۔

(4) **دُکھ سے نجات:-** ایک مسلمان تو مسلمان، یورپ کے غیب بینوں نے بھی اس حقیقت کو پالیا ہے کہ گناہ دماغی پریشانی اور بیماری کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور اگر زندگی سے گناہوں کو نکال دیا جائے تو نہ پریشانی رہے گی اور نہ بیماری۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : (سورہ الانبیاء، آیت نمبر 88)

ترجمہ: "تو ہم نے اس کی (ذوالنون کی) پکار سن لی اور اسے غم سے نجات دے دی اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح بچا لیا کرتے ہیں "۔

(5) **بات میں وزن:-** دُنیائے اِسلام میں اہلِ علم تو لاکھوں ہوئے ہیں لیکن جو مقبولیت رومیؒ، غزالیؒ، سعدیؒ، اِمام ابو حنیفہؒ، اِمام مالکؒ، اِمام شافعیؒ، اِمام احمد بن حنبلؒ، علامہ اقبال جیسے اہلِ دِل کے کلام کو حاصل ہوئی دوسروں کو نہ مِل سکی کیوں؟

بات یہ تھی کہ اُن کا رابطہ یا تعلق اللہ تعالیٰ سے تھا اور جب اللہ کسی پر مہربان ہوتا ہے تو اُس کی بات میں تاثیر رکھ دیتا ہے اور لوگ اُن کی طرف کھینچے چلے آتے ہیں۔

(6) **شخصیت میں کشش:-** کردار پاکیزہ ہو تو صاحبِ کردار میں ایک مقناطیسی کشش پیدا ہو جاتی ہے جو دوسروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہ کشش عبادت کرنے سے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور اگر یہی عبادت بہت زیادہ ہو جائے تو عابد مقبول خلائق بن جاتا ہے۔ یقین نہ آئے تو خواجہ عبد القادر جیلانیؒ، خواجہ اجمیریؒ، بابا فرید گنج شکرؒ، نظام الدین اولیاؒ، داتا گنج بخشؒ کے مزارات پر جایئے اور پروانوں کے عشق اور ہجوم کا اندازہ لگایئے۔

(7) **دانش یا عقلمندی:-** نیک لوگوں کو علم و دانش کی دولت عطا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں (سورہ القصص، آیت نمبر 14)

ترجمہ: "ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو علم و حکمت سے نوازا اور ہم نیک لوگوں کو اس طرح اجر دیا کرتے ہیں"۔

(8) **حفاظت:-** نیک انسان اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ جاتا ہے اور اِس کے بعد نہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوتا ہے اور نہ کسی مرض میں مبتلا ہوتا ہے اور نہ ہی اُسے سانپ ڈس سکتا ہے۔ سانپ کیسے ڈسے گا۔

شیخ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے "اگر چہ تیر کمان سے گزرتا ہے لیکن دانش مند کو تیر کے پیچھے ایک کمان اور کمان کے پیچھے ایک کمان والا بھی نظر آتا ہے"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی نے ایک مرتبہ پوچھا تھا" جب اللہ تعالیٰ کے تیر مرض، تیر مرگ، تیر غم و حادثہ چاروں طرف چل رہے ہوں تو ان سے بچنے کی تدبیر کیا ہو

سکتی ہے"؟اِس سوال پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا"اِن تیروں سے بچنے کی صورت صرف ایک ہے کہ آدمی تیر انداز کے پہلو میں آ جائے"۔

مندرجہ بالا باتوں کے باوجود،ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ نیک لوگ بیماری، حادثہ یا کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں تو یہ سب کچھ اُس بندے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے، کیونکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:(سورہ البقرہ، آیت نمبر 155)

ترجمہ:"اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور خوشخبری سنا ان صبر والوں کو"۔

(9) **ملائکہ کی دُعائیں:-** نیک لوگوں کے لیے فرشتے بھی دُعائیں مانگتے ہیں۔قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔(سورہ مومن، آیت نمبر 9-7)

ترجمہ:"عرش کو اٹھانے والے اور اُس ماحول کے دیگر فرشتے حمد خداوندی کے گیت گاتے ہیں اور اُس پر ایمان لاتے ہیں اور اہلِ ایمان کے لیے یوں دُعا مانگتے ہیں۔اے اللہ! تیری رحمت اور تیرا علم تمام کائنات پر محیط ہے۔تو اُن لوگوں کی خطائیں معاف کر جو گناہ سے تائب ہونے کے بعد تیری راہ پر چل پڑے ہیں،انہیں عذابِ جہنم سے بچانا اور جنتِ عدن میں پہنچا کہ تُو نے اُن سے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ان کے ہمراہ ان کے نیک آباؤ اجداد، بیویوں اور بچوں کو بھی جگہ دے کہ تُو ہر چیز پر غالب اور صاحبِ حکمت ہے۔ان لوگوں کو گناہوں سے دُور رکھ، آج اِس دنیا میں تُو نے جس شخص کو گناہ سے بچالیا۔اُس پر بڑا کرم کیا کیونکہ گناہ سے بچنا بہت بڑی کامیابی ہے"۔

یہ بات بار بار تجربے میں آتی ہے کہ کبھی کسی چیز کا شوق بڑھ جاتا ہے اور کبھی گھٹ جاتا ہے۔ایک نمازی کو اس نشیب وفراز سے بار بار واسطہ پڑتا ہے کہ کبھی تورات کی تہجد بھی قضا نہیں ہوتی اور کبھی فجر بھی قضا ہو جاتی ہے۔اس شوق اور بدشوقی کا تعلق اِس وجہ سے ہوتا ہے کہ ملائکہ اور شیاطین ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے کوشش کرتے رہتے ہیں۔یہ دونوں طاقتیں ہر وقت مصروف ہوتی ہیں۔اور ہر طاقت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسری طاقت کے پیروکاروں کو زیادہ سے زیادہ ورغلائے۔اور اس مقصد کے لیے دونوں طاقتیں اپنا پورا زور لگاتی ہیں۔

جب کوئی اللہ کی طرف چلا جاتا ہے تو شیاطین زیادہ طاقت ور لہریں اُس کی طرف چھوڑتے ہیں،جس سے اُس آدمی میں شوق عبادت کم ہو جاتا ہے۔اِس پر فرشتوں کی صف میں ایک بےچینی پیدا ہو جاتی ہے۔چنانچہ وہ اپنی لہروں میں زیادہ توانائی بھر دیتے ہیں،جس سے اُس آدمی کے شوق کی آگ دوبارہ بھڑک اُٹھتی ہے، اور یہ سلسلہ زندگی بھر جاری رہتا ہے۔

اللہ تعالی تک پہنچنے یا تعلق مع اللہ کا راستہ طویل ضرور ہے لیکن راستہ چاہے کتنا ہی طویل ہو ہمارے پیروں کے نیچے ہی ہوتا ہے- ہماری منزل اللہ تعالی کی ذات ہے-ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے جو راستہ اللہ تعالی تک پہنچنے کے لئے اختیار کیا ہے وہ صراط مستقیم ہی ہے-منزل تک پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور نہ ہر کسی کے لئے ضروری ہے-ضروری یہ ہے کہ---ہمیں جب موت آئے اس وقت ہم اللہ تعالی کی طرف والے راستے پر گامزن ہوں یعنی صراط مستقیم پر مریں-

****

اطاعت الٰہی

اطاعت الٰہی یہ ہے کہ بندہ خود کو بلکہ اپنی پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے تابع کر دے۔ یہ اتباع ایک یا دو معاملوں میں نہیں بلکہ زندگی کے تمام معاملات میں ضروری ہے تاکہ محب کی پوری زندگی حکم الٰہی کے اتباع میں رنگ جائے۔ اگر انسان کی زندگی حکم الٰہی کے تابع رہے تو اسے اطاعت الٰہی کہا جائے گا۔

قرآن پاک میں اس اطاعت کا ذکر یوں ہے، (سورہ توبہ، آیت نمبر 111) اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَ اَمۡوَالَھُمۡ

ترجمہ: "بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کا مال خرید لئے ہیں"۔

جب اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کا مال خرید لئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بندہ اللہ کے حضور بِک گیا، جب مالک حقیقی نے سب کچھ خرید لیا تو اب بندے کا اپنا کچھ بھی نہیں رہا۔ یعنی بندہ مومن کے لئے اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف اپنی آرزو، اپنی تمنا، اپنی سوچ، اپنی فکر اور اپنے قول و فعل کا کوئی جواز باقی نہ رہا۔ اس لئے کہ جو خود بِک گیا تو پھر تو اس کا اپنا کچھ بھی نہ رہا۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جانیں قربان کرنے کے مفہوم کو بیان کرتے ہوئے شیخ ابو طالب مکیؒ اپنی کتاب "قوت القلوب" میں فرماتے ہیں ''چنانچہ اہل محبت نے اپنے اموال کو جانوں میں داخل کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاں فروخت کر دیا اور اس کی محبت کی خاطر سب کچھ بیچ دیا، اللہ تعالیٰ نے انہیں عمدہ قرار دے کر خرید لیا'' اب محبت کی علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے جان و مال خرید لیا اور فروخت کی علامت یہ ہے کہ ان سے ان کے جان و مال الگ ہو گئے اور اب اللہ تعالیٰ کے سوا ان کے دلوں میں کچھ خواہش نہ رہی۔

اس آیت کریمہ میں اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ میں ایک اور ارشاد بھی موجود ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ جس سے اس کی جان و مال خریدتا ہے وہ مومن ہوتا ہے کیونکہ وہ خریدتا ہی مومن سے ہے۔ اور جو مومن اللہ کی راہ میں بک گیا وہ اسی لمحہ حیات جاوید پا کر انمول ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ جو خوش نصیب اللہ تعالیٰ کے ہاں اتنا عزیز ہو کہ اللہ اس کا خریدار بن جائے، اور اس کی ہر شے کو اپنے قبضہ قدرت میں لے کر اپنا بنا لے تو اسے دنیا کی کونسی طاقت دوبارہ خرید سکتی ہے؟ جبکہ عالم امکان میں ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور بِکے ہوئے لوگوں کو دنیا کے سب خزانے لُٹا کر بھی کوئی اور خرید سکے۔

جب تک بِکے نہ تھے کوئی پوچھتا نہ تھا
تو نے خرید کر ہمیں انمول کر دیا

مراد یہ ہے کہ جب تک بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور نہیں بکتا بے قیمت رہتا ہے، مگر جب وہی بندہ اللہ تعالیٰ سے لو لگا لیتا ہے، اور اپنی ہستی کو اپنے خالق کے ہاتھ بیچ دیتا ہے، تو اس کی قیمت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اگر ساری دنیا ایک پلڑے میں رکھ دی جائے اور اسے دوسرے پلڑے میں، تو بھی اس کا پلڑا بھاری رہے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی نظر میں مقبول ہو گئی اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے منسوب ہو گئی، وہ اگر معمولی بھی ہو تو انمول اور بے بدل بن جاتی ہے۔ اب جب بندے نے اپنا سب کچھ بیچ دیا اور رب نے سب کچھ خرید لیا، اور اب رب کی مرضی چاہے صحت مند رکھے یا بیماری میں مبتلا کر دے، چاہے بے حساب نعمتیں دے چاہے تنگ دستی دے۔ چاہے ہنسائے چاہے رُلائے۔ الغرض جس حال میں اس کا رب رکھتا ہے، بندہ مومن حرف شکایت زبان پر نہیں لاتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت تو یہی ہے کہ اس کا فرمانبردار بن جانا، ہر حکم ماننا، اب اللہ تعالیٰ حکم دینے والے ہیں حکم کبھی کسی کام کو کرنے کے لئے دیا جاتا ہے، اور کبھی کسی کام کو کرنے سے منع کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ یعنی ''اوامر'' بھی ہیں (کسی کام کو کرنے کا حکم) اور ''نہی'' بھی یعنی (کسی کام کو کرنے سے منع کرنے کا حکم) یعنی کبھی یہ آتا ہے اے بندے فلاں کام کرنا ہے اور کہیں یہ حکم ہے کہ اے بندے اس کام کو مت کرنا رُک جا۔ اس لئے جس کام کو کرنے کے لئے کہا گیا ہے اس کو کرنا، اور جس کام کو کرنے سے منع کیا گیا ہے اس سے رُک جانا اطاعت الٰہی ہے۔

ترکِ نواہی کمال اطاعت ہے: ۔یہاں خاص طور پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ اطاعت میں حکم کی تعمیل قدرے آسان ہے، لیکن وہ چیزیں جن سے عمر بھر کے لئے منع کیا گیا ہو، اس سے رُک جانا خاصا مشکل ہے۔ اس لئے عارفین کا قول ہے ''اطاعت تو حکم کی تعمیل ہے اور کمال اطاعت یہ ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے زندگی بھر اس کی طرف قدم نہ اٹھائے''۔

چنانچہ شیخ ابو طالب مکیؒ کسی بزرگ کا قول نقل کرتے ہیں کہ ''افضل ترین نیکی یہ ہے کہ انسان نیکیوں پر استقلال دکھائے، اور نیکی پر استقلال دکھانا نیکی کو ستر گنا تک بڑھا دیتا

ہے۔لیکن برائیوں سے پرہیز استقلال دکھانے سے سات سوگنا زیادہ اجر رکھتا ہے، گویا وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے قائم مقام ہے۔اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک امتحان میں ڈالا گیا ہے، اور اس پر نفس کا دباؤ یعنی جہاد اکبر سے گزرنا پڑا۔مگر جب اس نے خواہش کو ترک کیا تو اپنے نفس کو چھوڑ دیا، اس وجہ سے اس کی نیکیوں میں سات سوگنا اضافہ ہوگیا، اور اس کی محبت ثابت ہوگئی۔ارشاد خداوندی ہے(سورۃ الرحمن، آیت نمبر 46) وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝

ترجمہ:"اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لئے دو جنتیں ہیں"۔

اطاعت محبت کی اولین پہچان:- جس طرح محبت کی پہچان محبوب کی یاد یعنی کثرت ذکر ہے اس طرح خالص محبت کی پہچان محبوب کی اطاعت ہے۔اور اطاعت کا تقاضہ یہ ہے کہ محبوب کی پسند پر اپنی پسند کو قربان کر دیا جائے۔ جو لوگ محبوب کی پسند کو اپنی پسند پر قربان کرنا نہیں جانتے وہ دعویٰ محبت میں جھوٹے ہوتے ہیں۔اگر کوئی شخص نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی اطاعت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا دعویٰ کرتا ہے، یا اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ دار ہے تو اس کا دعویٰ اطاعت ومحبت باطل ہوگا۔

اس بات کو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خود واضح کیا ہے:(سورۃ البقرہ آیت نمبر 8) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ:"اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اقرار کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخرت پر، اور نہیں وہ ایمان لانے والے"۔(یعنی نہیں وہ ایمان لائے)

کیوں ایمان نہیں لائے؟اس لئے کہ وہ صرف اللہ اور آخرت پر ایمان لا رہے ہیں۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی ذات وبابرکات کو درمیان میں سے نکال کر ایمان لا رہے ہیں، اور جب آپ خاتم النبیین ﷺ کی ذات کو درمیان میں سے نکال دیا جائے تو کونسا ایمان؟ اور کہاں کا ایمان؟

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے(سورۃ آل عمران، آیت نمبر 31) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

ترجمہ:"اے محمد(خاتم النبیین ﷺ) ان سے کہہ دیں "اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو میری پیروی کرو، (میری اتباع کرو) پس اللہ اُن سے محبت کرے گا"۔

غرض حکم محبوب کے مقابلے میں اپنی پسند کو قربان کرنا اگرچہ اطاعت کا بنیادی تقاضہ ہے لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔نفس انسانی کئی قسم کے حیلے بہانے بناتا ہے مثلاً یہ کہ کاروبار میں معمولی سے ہیر پھیر سے لاکھوں روپے کی آمدنی زیادہ ہو جائے گی۔انسان دل میں سوچتا ہے کہ کوئی بات نہیں بس ایک جھوٹ ہی تو بولنا ہے، ہزاروں کا فائدہ ہو جائے گا۔اور کونسی چیز خالص مل رہی ہے جو صرف میری دیانت داری سے فرق پڑ جائے گا۔غرض نفس بہکاتا ہے کہ ساری دنیا ایسا کر رہی ہے تم کر لوگے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔

کسی شخص کی محبت اور اطاعت کو پرکھنے کے لئے یہ کافی ہے کہ ایک طرف مال ودولت کے ڈھیر، امارت دلفریبیاں، جاہ ومنصب، عزت اور اقتدار ہو اور دوسری طرف اپنے رب کی رضا، اس کی محبت، اس کا خوف اور اس کا جذبہ اطاعت اسے ان چیزوں سے بے نیاز کر رہا ہو اور وہ ان تمام رغبتوں کو ٹھکرا کر اپنے اللہ کی محبت کو اپنا لے۔

کامل اور سچے محب کی شان یہ ہے کہ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی رغبت کو جو اسے اپنے محبوب کی اطاعت سے باز رکھے، حقارت سے ٹھکرا کر اپنے محبوب کی رضاجوئی کے لئے ہمہ وقت مستعد رہے اور زبان حال سے کہتا رہے ''اے اللہ میں یہ سب کچھ تیری رضا کے لئے چھوڑتا ہوں''۔

ماسوائے اللہ کے ایسی بے نیازی صرف اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی شان ہے ورنہ ہر کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔اور یہ بات اس وقت تک سمجھ میں بھی نہیں آتی جب تک کوئی اللہ کا بن کر اس کے ہاتھ فروخت ہو کر نہ دیکھے۔اس سے آشنائی کی لذت سے لطف اندوز نہ ہو جائے۔اور اپنے تن من میں اس کی اطاعت کا جذبہ طاری نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے بعد کسی اور کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔یعنی رب کا مطیع بندہ یا دنیا کا مطیع۔پس یا تو اللہ تعالیٰ کو منالے، یا دنیا کے جھوٹے بتوں کے آگے جھک جائے، یعنی مال ودولت کی حرص اور دنیا طلبی کی لالچ میں اہل دنیا کی پیروی کر یا اللہ کی محبت اور اطاعت کا راستہ اختیار کر۔اگر اہل دنیا کی بجائے رب کو اپنا بنا لیا تو اس کے ہاتھوں اپنی ہستی کا سودا کر دیا۔اور پھر اس کی اطاعت میں اپنے آپ کو غرق کر دیا تو یہ دنیا اور اس کی تمام مخلوق خود بخود دپیچھے دوڑنے لگے گی۔

آج کچھ لوگ محبت کے بغیر اطاعت کرنا چاہتے ہیں ان کے خیال میں اطاعت خود محبت اور عشق ہے۔مزید محبت کی ضرورت کیا ہے؟ بس یہاں انسان ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی نوکر، ملازم، ڈرائیور، مالی، چوکیدار ہے حکم تو وہ بھی مانتا ہے، ہمارے اشاروں پر چلتا ہے، مگر اس کا محرک محبت نہیں بلکہ وہ اُجرت ہے جس کے عوض وہ ہمارے ہاں کام کرتا ہے۔حکم کی تعمیل اطاعت تب گنی جاتی ہے جب سر کے ساتھ دل بھی جھک جائے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ سر سے پہلے دل جھکے، اور دل کا جھکنا سر کو جھکنے پر مجبور کر دے۔اور یہ بات محبت کے بغیر ہرگز ممکن نہیں بن پاتی، اس لئے کہ دل پر کسی کا زور نہیں اور یہ دل نہ تو دنیا اور قانون کے تقاضے جانتا

ہے۔اور نہ ہی خوف اسے کسی بات پر مجبور کر سکتا ہے۔دل صرف اور صرف جذبہ محبت کو جانتا ہے اور جذبہ محبت سے ہی کسی کی طرف راغب ہوتا ہے۔لہٰذا وہ اطاعت جو انسان کو اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ بنا دے اور اس کے لئے قرب الٰہی کا ذریعہ بن جائے وہ محبت سے کی ہوئی اطاعت ہوتی ہے۔اور ایسی اطاعت اور فرمانبرداری جس میں جذبہ محبت نہ ہو بلکہ کوئی خارجی سبب ہو وہ منافقت اور فریب ہے۔مدینہ طیبہ میں منافقین نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے ساتھ باقاعدہ نمازیں پڑھتے تھے۔لیکن ان کی اطاعت اور صحابہ اکرامؓ کی اطاعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔جب سر کے ساتھ دل بھی جھک جائے تب اسلام سے ایمان تک کا سفر طے ہوتا ہے۔

اس لئے کہ اگر بندے کو اپنی اطاعت دکھائی دیتی رہے تو وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ میں مطیع ہو گیا ہوں۔جوں ہی یہ خیال آیا اطاعت جاتی رہی کیونکہ اطاعت پر نظر تکبر کو جنم دیتا ہے۔اور تکبر ہر نیکی کو ختم کر دیتا ہے۔لہٰذا صرف وہی اطاعت انسانی سیرت وکردار کی تعمیر اور روحانی ترقی کا باعث بنتی ہے جو انسان کی نظروں سے اوجھل رہے۔بندہ جوں جوں اطاعت کرتا جائے یہی سمجھے کہ ابھی کچھ نہیں کر پایا،پس یہی فکر رہے تو اطاعت میں اثر پیدا ہوگا اور انسان روحانی منازل طے کرتا رہے گا۔جس لمحے اس کے شعور میں یہ بات آگئی کہ اب میں مطیع ہو گیا ہوں،اسی لمحے' وہ اطاعت اور بندگی رعونت اور تکبر کا باعث بن جائے گی اور انسان نفس کے ہاتھوں ہلاکت کے قریب پہنچ جائے گا۔اس لئے اطاعت الٰہی کا محرک خوف نہیں بلکہ محبت ہونا چاہئے۔یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ خوف الٰہی بھی تو جزو ایمان ہے اور ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے کیونکہ اللہ سے ڈرنا ہی تقویٰ کی بنیاد ہے۔اور خوف الٰہی کا ثمر بھی دوسری تمام نیکیوں سے زیادہ ہے،ارشاد باری تعالیٰ ہے:(سورۃ الرحمن،آیت نمبر 46)

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۚ　　ترجمہ:"اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لئے دو جنتیں ہیں"۔

اب اگر خوف الٰہی کی اتنی اہمیت ہے تو اطاعت کا محرک ہم محبت کو کیوں قرار دے رہے ہیں خشیت کو کیوں نہیں؟اس نکتے کی وضاحت کے ضمن میں خوف الٰہی کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

خوف الٰہی کا مفہوم:- اہل محبت کے ہاں خشیت الٰہی محبت کا حجاب ہے،اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں اور ہمہ وقت اس کی رضا کے طلب گار رہتے ہیں،وہ اس کی بندگی اس کے خوف کی وجہ سے نہیں کرتے،وہ تو اللہ تعالیٰ کی محبت میں غرق ہوتے ہیں،اور محبت ہی ان کی بندگی کا محرک ہوتا ہے۔انہیں نہ تو جنت کا لالچ ہوتا ہے اور نہ دوزخ کا ڈر ہوتا ہے،کہ اللہ کے عذاب سے خوف زدہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں۔وہ اللہ سے ڈرتے ضرور ہیں مگر یہ خوف ایسا ہوتا ہے جیسے ایک محب اپنے محبوب سے ڈرتا ہے۔کہ کہیں کسی وجہ سے محبوب ناراض نہ ہو جائے،اس کی پیشانی پر کہیں شکن نہ آجائے۔کہیں محبوب مجھ سے منہ نہ موڑ لے۔الغرض اہل محبت کو زیادہ سے زیادہ اسی نوعیت کا خوف ہوتا ہے۔ان کے نزدیک باقی ہر قسم کا خسارہ اور نقصان برداشت کیا جا سکتا ہے،لیکن محبوب کی ناراضگی ان کے لئے قابل برداشت نہیں ہوتی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرنا کیا ہے؟یہ اللہ کے خاص اور مقرب بندوں کا احساس ندامت ہے،وہ اپنے محبوب کے سامنے اپنے آپ کو اس قدر ہیچ سمجھتے ہیں،کہ اس کے سامنے آنے سے بھی ڈرتے ہیں۔حالانکہ ان کے دلوں میں محبوب حقیقی کے لئے محبت کے الاؤ بھڑک رہے ہیں،جو انہیں دیدار کے لئے ہمہ وقت مضطرب کئے رکھتے ہیں۔وہ اگر محبوب کو یاد بھی کرتے ہیں،تو ڈرتے ہیں کہ کہیں محبوب کی بارگاہ میں گستاخی نہ ہو جائے۔یہ خوف انہیں کسی عذاب کے ڈر کی وجہ سے نہیں ہوتا،بلکہ محبوب کی عظمت شان کے پیش نظر اپنی کم مائیگی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اہل اللہ جو کامل اطاعت کرنے والے ہیں،وہ اطاعت محبت کی وجہ سے کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی محبت کی وجہ سے ڈرتے ہیں۔گویا خوف الٰہی بھی محبت کی ایک قسم ہوتی ہے۔اس لئے جب اطاعت کا محرک بھی محبت ہو اور خشیت الٰہی کا محرک بھی محبت ہو،تو پوری زندگی نہ اطاعت میں دشواری آتی ہے اور نہ حصول تقویٰ میں کوئی رکاوٹ حاصل ہوتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اہل محبت کی اطاعت کا مقصد اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ اسے محبوب کا قرب نصیب ہو،جبکہ محبت سے خالی اطاعت کرنے والا کسی نہ کسی اُجرت اور دنیاوی یا آخروی طلب کے پیش نظر اطاعت کرتا ہے۔اہل محبت اور اہل عشق تو اس عبادت کو شرک تصور کرتے ہیں،جس کا مقصد خالق کی رضا کے حصول کے سوا کچھ اور ہو۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اطاعت کرنے والے لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں، 1) ایک وہ اُجرت پاتے ہیں　　2) ایک وہ جو قربت چاہتے ہیں

اُجرت اور قربت میں بڑا فرق یہ ہے کہ:

1) اُجرت میں حساب رکھا جاتا ہے،اور ہر کام کرنے والے کو اتنا ہی ملتا ہے جتنی اس نے محنت کی ہو،مگر قربت میں حساب اٹھا لئے جاتے ہیں۔

2)　　　اُجرت میں محنت کرنے والا بھی اپنی محنت کا حساب رکھتا ہے اور اجر دینے والا بھی اس کو اسی حساب سے اجر دیتا ہے، مگر قربت میں نہ محنت کرنے والا حساب رکھتا ہے اور نہ اجر دینے والا حساب سے دیتا ہے کہ اس کو عطا کرتے ہوئے اس کی محنت کو مدنظر رکھتے ہوئے معاوضہ دے۔ محبت کرنے والا نہ حساب دکھاتا ہے اور نہ دینے والا اس سے حساب کا مطالبہ کرتا ہے۔ اسی لئے جو لوگ محبت میں اطاعت کرتے ہیں وہ قربت پاتے ہیں اور جو کسی منفعت میں اطاعت کرتے ہیں وہ اجرت پاتے ہیں۔

قربت چاہنے والے اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ یہ کام کرنے سے مجھے اتنی نیکیاں ملیں گی اور میرے اتنے درجات بلند ہوں گے۔ یہ دوگنا، دس گنا، ستر گنا کے فائدوں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ ثواب لینے کے لئے عمل نہیں کرتے بلکہ جو کچھ کرتے ہیں رب کی رضا اور خوشنودی کے لئے کرتے ہیں۔ رب کی رضا کے حصول کے لئے یہ جو اعمال کرتے ہیں اس پر یہ ثواب اور عذاب کا تصور نہیں کرتے۔

جو اطاعت کے بدلے میں اجر مانگے گا اسے اسی قدر اجر دیا جائے گا۔ اور کوئی شخص خواہ کتنا ہی پارسا کیوں نہ ہو، اسے اپنی اطاعت اور اعمال کے قبول ہونے کا یقین نہیں ہونا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ جس اطاعت کے عوض اس نے جنت طلب کی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہی نہ ہوئی ہو۔ اس لئے انسان کو ہمیشہ اطاعت کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے قرب کا متلاشی ہونا چاہئے۔ قرب کا طلب گار بندہ اپنی اطاعت پر فخر محسوس نہیں کرتا، اور اللہ تعالیٰ اس کی غلطیوں پر درگزر فرماتے ہیں۔

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہئے
کہ دانہ خاک میں مل کر گُل و گُلزار ہوتا ہے

اگر ہم صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے تو وہ ہمیں اپنی قربتوں سے نوازے گا۔ اور اگر قربت حاصل ہوگئی تو کائنات کے تمام اجر ہمارے قدموں میں آجائیں گے۔ پھر دنیا بھی ہماری اور آخرت بھی ہماری۔ جو اللہ کا ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی تمام چیزیں اس کی ہوجاتی ہیں۔

'ایک بہت کامل صوفی بزرگ گزرے ہیں، جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا اور حجاب اٹھادیئے گئے تو کچھ دیر پہلے جنت دکھادی گئی۔ ارشاد ہوا،

ترجمہ: ''اے بندے تو زندگی بھر میری اطاعت کرتا رہا دیکھ تیرا ٹھکانہ یہ ہے''۔

حالت نزع میں جنت کو دیکھ کر ایک شعر ان کے منہ پر جاری ہوا جس کا ترجمہ یہ ہے، ''مولا میں نے زندگی میں جو کچھ کیا تو اس کا اجر جنت کی صورت میں دینا چاہتا ہے، اگر ایسا ہی ہے تو میری پوری زندگی ضائع ہوگئی، تیری عزت کی قسم میں نے کوئی بھی عمل جنت کے لئے نہیں کیا میں اجرتوں کا خواہاں نہیں ہوں میں تو تیری قربت کا طلب گار ہوں"۔

ان کا یہ کہنا تھا کہ پردہ حائل ہوگیا، اور جب دوبارہ اٹھا تو ''حُسن الٰہی'' کا جلوہ نظر آیا، اور اس کے ساتھ ہی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ اللہ کے بندے نے جو چاہا تھا اسے مل گیا۔ اللہ تعالیٰ کے بندے کو آخری وقت تک آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے، کہ یہ بندہ اجرت کا طلب گار رہے یا اسے میری محبت اور قربت عزیز ہے۔ قربت والوں کو اللہ تعالیٰ ان گنت نوازشات سے بہرہ ور فرماتا ہے، کیونکہ وہ اپنے اللہ سے سوائے دیدار کے اور کچھ نہیں چاہتے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے خاص بندے اس کی رضا اور اس کے فضل کے ہر وقت طلب گار رہتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے: (سورۃ الحشر آیت نمبر 8)

يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا

ترجمہ: "وہ اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل اور رضا کے طلب گار ہیں"۔

یہ ہاتھ باندھ کر اپنے رب کی بارگاہ میں التجا کرتے ہیں، رُو رُو کر منہ تر کرتے ہیں، کبھی قیام، کبھی رکوع اور کبھی سجود میں پڑے رہتے ہیں۔ کبھی سسکیاں لیتے ہیں، اور کبھی روتے ہیں کبھی تڑپتے ہیں، کبھی بلکتے ہیں یہ سب کچھ کیوں؟

فقط اس لئے کہ محبوب اپنی قربتوں سے نوازدے۔ حتیٰ کہ محبوب کی رضا کے لئے جان کا نذرانہ تک خوشی سے پیش کرتے ہیں اور پھر بھی احسان نہیں جتلاتے اور کہتے ہیں۔

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

****

رضائے الٰہی

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: (سورۃ الفجر آیت 30-27)

ترجمہ: ''اے نفس مطمئنہ لوٹ چل اور واپس آ اپنے پروردگار کی طرف اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی ہے اور اللہ تجھ سے راضی اور میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا''۔

وقت نزاع کا خطاب:- اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کو اس کی موت و نزاع کے وقت خطاب کیا جائے گا جو اس کا آخری وقت ہوگا۔ گویا یہ خاتمے کے وقت کا خطاب ہے جیسے شرعی خطابات زندگی میں کیے گئے ہیں۔ یہ زندگی کے خاتمے کا وقت کا خطاب ہے جب کہ آدمی اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوگا اور اس دنیا کی زندگی کو ختم کر رہا ہوگا۔

ملک الموت دو قسم کے ہیں ایک اصحاب یمین اور ایک اصحاب شمال۔ ایک دائیں جانب کے ملائکہ ہیں اور ایک بائیں جانب کے۔ دائیں جانب کے ملائکہ کی یہ شان بیان کی گئی ہے کہ وہ سورج اور چاند کی طرح سفید اور روشن چہرے والے ہوں گے۔ بائیں جانب کا لشکر وہ ہے جو مظلم ہے، تاریک اور سیاہ اور ڈراؤنے ان کے چہرے ہوں گے۔ مومن کی جب روح قبض کرنے کا وقت آتا ہے اس وقت پہلے دائیں جانب کے ملائکہ بھیجے جاتے ہیں جنہیں اصحاب یمین کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ''بندہ جس کی موت قریب آ چکی ہے یہ دور سے دیکھتا ہے جیسے منزلوں پر سینکڑوں سورج اور چاند روشن ہیں، وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب بڑھتے جا رہے ہیں اسے ایک قسم کا اندیشہ پیش آتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ وہی ملائکہ ہوتے ہیں جو اصحاب یمین اور ملک الموت کا دائیں جانب کا لشکر کہلاتے ہیں۔ دور سے اس لیے نظر پڑتے ہیں کہ ایک نئے عالم سے سابقہ ہے نئے عالم کی مخلوق سامنے آ رہی ہے ایک دم سامنے آنے سے کہیں مومن گھبرا نہ جائے۔ اس لیے پہلے دور بیٹھ کر اپنا جمال دکھاتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ قریب ہوتے ہیں تا کہ رفتہ رفتہ انس پیدا ہو۔ یہ وقت اس میت پر ایسا ہوتا ہے کہ اس میت پر عالم تحیر طاری ہے کہ یہ سورج اور چاند ہیں کیا چیز؟

یہاں تک کہ بالکل قریب آ جاتے ہیں۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض روشنیاں نہیں ہیں بلکہ ان کی شکل وصورت سب نمایاں ہو کے سامنے آ جاتی ہیں وہ اس مومن کے ساتھ نہایت ہی خاطر مدارات اور نرمی کا برتاؤ کرتے ہیں یہ نہیں کرتے کہ آتے ہی اس کی جان نکالنی شروع کر دیں بلکہ ترغیب دینا شروع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے پاک روح اور نفس نکل اس بدن سے کہ تو نے اپنے عمل سے اِسے پاک بنا دیا تھا، تیرا بدن بھی پاک اور تو خود بھی پاک، کہاں نکل اور کہاں جا؟ راحتوں، نعمتوں، آسائشوں اور آرام کی طرف اور ایسے پروردگار کی طرف چل جو کبھی تجھ پر غضب ناک نہیں ہوگا بلکہ رحمت کرنے کے لیے تیار ہے اس طرف چل۔ یہ گویا ایک قسم کا واعظ ہوتا ہے جس سے وہ آخرت کی طرف جانے کی ترغیب دیتے ہیں پھر اس دنیا کی گندگی اور برائیاں بھی بیان کرتے ہیں کہ تو کس گندے عالم میں پھنسا ہوا تھا، پاک عالم کی طرف چل جس میں نہ غم والم اور نہ پریشانی ہے بلکہ بشارتیں، راحتیں اور انسباط ہیں۔ ادھر چل اور اخیر میں اس پروردگار کی طرف چل جس کے لئے تو نے زندگی بسر کی۔ محنتیں کیں، اب وہ نتیجہ قریب آ رہا ہے۔ یہ ایک وعظ و ترغیب ہے تا کہ مومن کا دل آخرت کی طرف پھر جائے تو مرنا آسان ہو جائے، دوسرے عالم کی طرف نکلنا سہل ہو جائے، یعنی ملائکہ، موت، مومن کو ترغیب دے کر آخرت کیلئے آمادہ کرتے ہیں۔ غرض پہلے دنیا کی برائی دل میں بٹھاتے ہیں اور آخرت کی ترغیب دیتے ہیں مگر طبعی طور پر موت انسان کو شاق ہے کہ عالم سے نکل کر جس میں پچاس، ساٹھ، ستر برس گزارے ہوں، دوسرے عالم میں جائے۔ اس لیے جیسے بدن کو چھوڑنا بھاری ہے، اس جہان کا چھوڑنا بھی بھاری ہے، اس لیے طبعی طور پر موت انسان کے حق میں مکروہ ہے۔ طبیعت گوارا نہیں کرتی، لاکھ بشارتیں دی جائیں، نعمتوں کا پیغام سنایا جائے مگر وہ طبعی کراہت اور جھجک غالب ہے تو آمادہ نہیں ہوتی۔ بعض طبائع تو وہ ہیں جنہوں نے دنیا میں رہ کر ہی اپنے قلب کو فارغ بنا لیا تھا، فوراً ہی آمادہ ہو جاتی ہیں۔

مومن کو عندالموت حق تعالیٰ براہ راست بھی خطاب فرماتے ہیں:- حدیث میں موت کی تمنا کی مخالفت فرمائی گئی ہے۔ فرمایا ''کوئی شخص تم میں سے موت کی تمنا نہ کرے"۔ (صحیح بخاری)

اس لیے کہ موت آ کر زندگی کے عمل کو قطع کر دے گی، جتنی زیادہ زندگی نیکی کے ساتھ گزرے اتنی بہتر ہے۔ اس لیے موت کی تمنا مت کرو۔

قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے: (سورہ جمعہ، آیت نمبر 6)

ترجمہ: "اے یہود! اگر تمہیں اولیا اللہ اور ولی کامل ہونے کا دعویٰ ہے تو ذرا موت کی تمنا کر کے دکھلاؤ''۔

اس سے معلوم ہوا کہ موت کی تمنا مومن ہونے اور ولایت کا خاصہ ہے۔اور یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے بظاہر ایک تعارض سا محسوس ہوتا ہے کہ ایک جگہ حکم ہے تمنا کرو، ایک جگہ حکم ہے کہ ہرگز مت کرو، یہ دو باتیں آپس میں ٹکرا گئیں لیکن ایک دوسری حدیث میں اس مضمون کو صاف کر دیا گیا تو فرمایا گیا'' کوئی شخص کسی مصیبت سے اکتا کر موت کی تمنا نہ کرے''(بخاری)

کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا، یہ نعمت خداوندی کو ٹھکرانا ہے، بے صبری ہے اس کی مخالفت ہے۔لیکن اگر اللہ سے ملاقات کے شوق میں موت کی تمنا ہو تو عین مطلوب ہے۔

حضرت بلال حبشیؓ کی جب وفات قریب آئی تو چہرہ بشاش، داڑھی کا ایک ایک بال کھلا ہوا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ خوشی ان کے دل سے ابلی پڑتی تھی۔فرمایا'' کل انشاءاللہ حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ اور ان کے اصحابؓ سے ملاقات ہو جائے گی اس کی خوشی ہے''۔یہ خوشی عین مطلوب ہے اس کے لیے اگر موت کی تمنا ہے تو یہ عین مطلوب ہے۔البتہ کسی مصیبت سے گھبرا کر موت کی تمنا یہ خلاف مطلوب ہے۔

ملائکہ علیہم السلام اور ملک الموت آ کر انہیں موت کی ترغیب دیتے ہیں کہتے ہیں کہ کس گندے عالم میں پڑے ہوئے ہو۔اس عالم کی طرف چلو جہاں روح و ریحان ہے اور اس رب کی طرف چلو جو کبھی نامہربان نہیں ہوگا اور اس کی مہربانی دوامی ہوگی۔جب اس کے دل میں انعام کی ذرا مضبوطی ہوتی ہے اور وہ راضی ہو جاتا ہے۔پھر نزع شروع ہو جاتا ہے لیکن بعض ایسے ہیں کہ ان کے چہرے دیکھ کر بھی پوری طرح آمادہ نہیں ہوتے کیونکہ طبعاً موت مکروہ ہے اور جان آمادہ کر کے نکالنی ہے۔گویا ظاہری طور پر جبراً اس کو کھینچنا نہیں ہے یہ مومن کے ساتھ لطف اور مدارات کا برتاؤ ہے۔تو حدیث میں ہے''اس وقت ملائکہ اس کو کچھ تحفے لا کر دکھلاتے ہیں یہ چیزیں جب سامنے آتی ہیں ان کو دیکھ کر پھر مومن اپنے قابو میں نہیں رہتا اور ایک دم بہادری کرنے کا جوش پیدا ہوتا ہے'' حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ'' پھر اس طرح سے روح نکلتی ہے جیسے پانی سے بھری ہوئی مشک کو تم الٹا کر دو تو غرغر کر ایک ایک قطرہ ٹپک جاتا ہے اور باقی نہیں رہتا اس طرح سے روح پرواز کر جاتی ہے اس وقت یہ کہا جاتا ہے

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝ (سورۃ الفجر، آیت نمبر 30-27)

ترجمہ:"اے اطمینان والی روح تو اپنے رب کیطرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش پس میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں چلی جا"۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ　　ترجمہ:"اے نفس مطمئنہ آ"۔　　اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے

ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً　　ترجمہ:"لوٹ اپنے رب کی طرف کہ خود بھی اپنے پروردگار سے راضی تھا اور تیرا پروردگار بھی تجھ سے راضی"۔

یہ اس وقت کا خطاب ہے جو اللہ کی طرف سے بندے کو ہوگا۔مگر یہ خطاب صرف مومن کیلئے ہوگا۔

مومن کیلئے اعلان رضا کی بشارت:۔ بشارت اس میں کیا ہے؟ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً یہ بشارت ہے۔یعنی اے نفس مطمینہ آ اور ہماری طرف لوٹ، اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی اور اللہ تجھ سے راضی، اعلان رضا یہ سب سے بڑی بشارت ہے۔مومن کو کہا جائے گا تو ہم سے اور ہم تجھ سے راضی۔مومن کے راضی ہونے کے کیا معنی؟ بظاہر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کا کون سا انسان ہے جو اللہ سے راضی نہیں ہے سوائے چند دہریوں کے جو خدا کے وجود کے ہی قائل نہیں۔باقی پوری دنیا خدا سے راضی ہے، خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں، مذہب کی بنیاد ہی خدا کے وجود پر اور اس کے ماننے پر اور اس کے راضی ہونے پر ہے کیا ایک یہودی کہہ دے گا میں اللہ سے راضی نہیں ہوں؟ کیا کوئی عیسائی کہہ دے گا میں اللہ سے ناراض ہوں؟ یا ایک مشرک جو سینکڑوں خداؤں کو مانتا ہے اور کہتا ہے بڑا خدا ایک ہی ہے، یہ بھی کہتا ہے کہ میں اس سے راضی ہوں۔غرض مومن کیلئے یہ کون سی بات نئی ہے۔سارے اللہ سے راضی ہیں۔مومن کی کیا خصوصیت ہے؟

احادیث کے اندر اس کی رضا کی تفسیر بیان فرمائی گئی ہے۔وہ یہ کہ ایک تو رضا خدا کی ذات کے ساتھ ہے ایمان کیلئے یہ تنہا کافی نہیں ہے۔یوں تو ہر قوم کہے گی کہ ہم خدا سے راضی ہیں جب تک ان افعال الٰہیہ کے ساتھ رضامندی نہ ہو جو بندے کے ساتھ کئے جاتے ہیں، یعنی ہر تقدیر پر راضی اور ہر اس فعل پر راضی ہو جو اللہ اپنے بندے کے ساتھ کر رہا ہے یہ ایمان کے لیے ضروری ہے۔حق تعالیٰ شانہ جیسے خالق و مالک ہیں، رب ہیں، رب کے معنی پالنے والے کے ہیں۔پرورش کے اندر وہ افعال بھی کیے جاتے ہیں جن سے ظاہری طور پر بندہ خوش ہو جائے اور ایسے افعال بھی کئے جاتے ہیں جن سے بظاہر وہ ناراض بھی ہے، ماں بچے کو پالتی ہے تو جیسے چمکارتی ہے تھپڑ بھی مارتی ہے، جیسے پیار کرتی ہے کبھی کبھی طمانچہ بھی مارتی ہے، باپ جیسے بچے کو کھلاتا پلاتا ہے، کبھی کبھی مکتب نہ جانے پر یا پڑھنے میں کوتاہی کرنے پر سزا بھی دیتا ہے،

کبھی یہ بھی کہہ لیتا ہے کہ میرے گھر سے نکل جا، تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتا، دل میں محبت موجود ہے، مگر کہہ رہا ہے میرے گھر سے نکل جا اور کبھی جوش میں کہہ دیتا ہے کہ اگر اب کوتاہی کی تو تجھے دیوار سے دے ماروں گا۔

کیا واقعی اس کا جذبہ یہ ہے کہ بچے کو دیوار پر دے مارے صرف ڈرانے دھمکانے کے لیے ایسا کہا ہے۔ غرض جیسے بچے سے پیار کرتا ہے کبھی کبھی سزا بھی دیتا ہے۔ تو ماں اپنی مامتا کے سبب جیسے پالتی اور پرورش کرتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی سختی بھی کرے۔ اسے بھی تربیت کہتے ہیں یہ تربیت سے خارج نہیں ہے۔ اگر ماں کے دودھ پلانے پر ہر بچہ خوش ہو جائے، روٹی کا نوالہ کھلائے تو بھی راضی رہے۔ اور جب تھپڑ مارے تو کہے کہ نہ تو میری ماں ہے نہ میں تیرا بیٹا ہوں، تو کہا جائے گا کہ بڑا نامعقول اور نا خلف بیٹا ہے، جسے ماں کے دودھ پلانے پر راضی ہونا چاہیے تھا ایسے ہی ماں کے تھپڑ مارنے پر بھی راضی ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ تھپڑ مارنا بھی اس کی مصلحت کے تحت تھا، کیونکہ ماں کا جذبہ عداوت کا نہیں، محبت کا ہے، اگر نہ مارے گی بچے کی راہ ہی درست نہ ہوگی، خلف، صالح وہ کہلائے گا جو باپ کے چمکارنے اور تھپڑ مارنے پر بھی راضی ہے، کھانا کھلانے پر بھی راضی اور سزا دینے پر کہ تو پڑھنے کیوں نہیں گیا ایک وقت کی روٹی بند کر دے تو بھی راضی ہے، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ میری ہی مصلحت کے تحت ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ایک دودھ پیتا بچہ اس وجہ کو سمجھتا ہے جسے کوئی شعور نہیں۔ جب ماں دودھ پلاتی ہے جب بھی ماں کی گود میں جاتا ہے۔ طمانچہ مارتی ہے تو روتا جاتا ہے مگر دوڑتا ماں ہی کی طرف ہے، سمجھتا ہے کہ اس کے سوا میرے لیے کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔ میرا ٹھکانہ یہی ہے۔، بہر حال جب کھانا پلانا اور سب چیزیں دینا یہ تربیت ہے، تو کبھی کبھی تھپڑ مارنا یہ بھی تو تربیت ہے، بندہ وہ ہے کہ اللہ کے ہر فعل پر راضی ہو، اگر وہ تونگر بنا دے، تو جتنا اس وقت ہو راضی ہو، اس پر بھی اتنا ہی راضی ہو، جب وہ ساری نعمتیں چھین کر مفلس بنا دے، تب کہا جائے گا یہ صحیح معنی میں اللہ کا بندہ ہے۔ اگر وہ مصیبت بھیج دے تو جتنی رضامندی نعمت میں تھی اتنی ہی مصیبت میں بھی ہو۔ اس لیے کہ اللہ بندے کو مصیبت بھیجتا ہے تو کسی عداوت کے سبب نہیں۔ یہ بھی محبت کا تقاضا ہے یہ بھی تربیت کا حصہ ہے۔ بعض دفعہ نعمت دے دی جاتی ہے، مثلاً بے شمار دولت دے دی، اقتدار دے دیا، مگر بندے نے اس کو غلط طریقے سے استعمال کرنا شروع کیا، بجائے اس کے کہ شکر گزاری کرے دن رات اپنے رب کے آگے جھکے، اس نے تعیش میں آ کر اسی دولت کو خدا سے بے گانہ ہونے کا ذریعہ بنالیا، تو انصاف اور عقل سے سوچیئے کہ تھپڑ مارنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ تنبیہ کی جائے اس لیے کبھی کبھی دولت چھین لیتے ہیں، حقیقتاً وہ چھیننا نہیں ہوتا۔ ورنہ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ معاذ اللہ ہمارے خزانے میں کمی تھی۔ لاؤ اس سے چھین کر بھر لو بلکہ تنبیہ مقصود تھی، شاید اس چھیننے سے عبرت پکڑے اور باز آ جائے اور جس طرح برائی کی طرف جا رہا تھا تو بہ کر کے ہماری طرف رجوع کرے جس کو قرآن میں فرمایا گیا (سورہ البقرہ، آیت نمبر 156-155)

ترجمہ: "اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور خوشخبری سنا ان صبر والوں کو- کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں ہم اللہ کے مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھرنا"-

بہت سی قومیں ہیں کہ عبرت پکڑ کر جھک جاتی ہیں، پھر ان پر انعامات کی بارش ہوتی ہے۔ لیکن بہت سے ہیں کہ پھر بھی نہیں جھکتے۔

(سورہ الانعام، آیت نمبر 43-42)

ترجمہ: "اور بیشک ہم نے تم سے پہلی اُمتوں کی طرف رسول بھیجے تو انہیں سختی اور تکلیف سے پکڑا کہ وہ کسی طرح گڑگڑائیں- تو کیوں نہ ہوا کہ جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو گڑگڑائے ہوتے لیکن ان کے دل تو سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کے کام ان کی نگاہ میں بھلے کر دکھائے"- اس درجہ ان کے سامنے دنیا مزین ہو جاتی ہے کہ اسی کی رنگینیوں میں الجھ کے رہ جاتے ہیں، دوسری طرف دھیان نہیں جاتا۔ تو جسے دینا آتا ہے اسے لینا بھی آتا ہے۔

(سورہ الانعام، آیت نمبر 45-44)

ترجمہ: "پھر جب انہوں نے بھلا دیا جو نصیحتیں ان کو کی گئیں تھیں ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے یہاں تک کہ جب خوش ہوئے اس پر جو انہیں ملا تو ہم نے اچانک انہیں پکڑ لیا اب وہ آس ٹوٹے رہ گئے، تو جڑ کاٹ دی گئی ظالموں کی اور سب خوبیاں سراہا اللہ رب سارے جہاں کا"-

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ربوبیت الٰہیہ میں جیسے انعام واکرام ہیں ویسے انتقام بھی ربوبیت کے لیے ہے، جیسے دینا ربوبیت ہے، چھیننا بھی ربوبیت ہے تو عبرت و نصیحت دلانے کیلئے کبھی کبھی ایسا بھی کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں راضی بارضا رہنا ہے- راضی بارضا رہنے والے شخص کی نسبت اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جاتی ہے-

حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ فرماتے تھے "میں اسٹیشن پہنچوں، گاڑی چلنے کے لئے تیار کھڑی ہو، میرا ایک قدم پائیدان پر ہو، اور دوسرا قدم پلیٹ فارم پر، گارڈ سیٹی دے چکا ہو، گاڑی چلنے لگے تو ایک آدمی دوڑتا ہوا آئے اور پکارے "احمد علی! اللہ کا قرآن پاک سمجھا کے جاؤ"، میرا دوسرا قدم پائیدان پر بعد میں پہنچے گا، میں آنے والے کو پورا قرآن پاک سمجھا کے جاؤں گا"۔ کسی نے پوچھا" قرآن پاک کے تیس پارے پائیدان پر کیسے سمجھائیں گے "؟ جواب دیا" قرآن پاک کا خلاصہ تین چیزیں ہیں:

(۱) رب کو راضی کرو عبادت کے ساتھ۔

(۲) نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کو راضی کرو اطاعت کے ساتھ۔

(۳) اللہ تعالی کی مخلوق کو راضی کرو خدمت کے ساتھ۔

عبادت اللہ کی، اطاعت نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی، خدمت خلق خدا کی۔

مقام صاحب نسبت:۔ اس مقام کے بارے میں نبی کریم خاتم النبیین ﷺ حضرت عمرؓ کے بارے میں فرماتے ہیں "اللہ نے عمرؓ کی زبان اور دل پر حق جاری کر دیا ہے"۔(جامع ترمذی) جب عمرؓ رضائے حق کے اندر اتنے فانی ہو چکے تھے کہ اب وہ جو بھی کرتے تھے وہ عین مرضی خداوندی ہوتا تھا تو حضرت عمرؓ کو اللہ کی رضا خود ڈھونڈتی تھی جو وہ کہہ دیں بس وہی حق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بارہ امور میں حضرت عمرؓ کی رائے وحی میں مل گئی جو رائے دی اسی کے مطابق وحی نازل ہوگئی۔

1۔　حدیث پاک میں ہے کہ ابتداء میں عام عورتوں کا پردہ نہیں تھا، مجلس میں ازواج مطہرات بیٹھتی تھیں، ذکر و تلاوت اور علم کی باتیں سنتی تھیں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ آپ کی مجلس میں ہر قسم کے لوگ آتے ہیں، جہاں صحابہ کرامؓ ہیں بعض منافق بھی شامل ہیں مجھے یہ پسند نہیں آتا کہ ازواج مطہرات چہرے کھول کر بیٹھیں"۔ یہ رائے دی تھی اور اسی دن وحی نازل ہوگئی کہ:

فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاۗءِ حِجَابٍ ؕ اور وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ　　(سورۃ الاحزاب آیت نمبر 53 اور 33)

ترجمہ:" کوئی چیز مانگو تو پردے کے باہر سے مانگو"۔　اور　" گھروں میں ٹھہری رہو، باہر مت نکلو"۔

جو رائے دی اسی کے مطابق وحی آگئی اسی طرح سے متعدد واقعات گزرے کہ عمرؓ نے رائے دی اور وحی آگئی حدیث میں ہے کہ

2۔" مقام ابراہیم پر (حج کرنے والے جانتے ہیں کہ) طواف کرنے کے بعد دو رکعت اس طرح پڑھی جاتی ہے کہ مقام ابراہیم کو بیچ میں لے لیا جاتا ہے تاکہ استقبال قبلہ کا کیا جائے اور بیچ میں مقام ابراہیم آجائے، طواف دوگانہ واجب ہے مگر اس شان کے ساتھ یہ ابتدائے اسلام میں نہیں تھا۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے مقام ابراہیم کے فضائل بیان کئے کہ یہ وہ پتھر ہے جس کے اوپر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی اور اس پر حضرت ابراہیمؑ کے پیروں کے نشان بھی ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ یہ فضائل بیان فرمارہے تھے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کیسا اچھا ہوتا کہ مقام ابراہیم کو بیچ میں لے کر نماز پڑھیں جس دن یہ کہا شام کو آیت نازل ہوگئی "مقام ابراہیم کو مصلّٰی بناؤ" اور اسے درمیان میں لے کر دوگانہ ادا کرو۔ اس طرح متعدد چیزیں جو تقریباً بارہ ہیں جن کے بارے میں حضرت عمرؓ نے جو رائے دی وحی بعینہ اس طرح نازل ہوئی، گویا ان کا ضمیر وحی خداوندی کا اتباع کرتا تھا۔ ادھر ہی چلتا تھا جدھر وحی خداوندی آنے والی ہوتی تھی۔

اس لیے حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا" اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتا"۔ (جامع ترمذی)

مناسبت نبوت سے اتنی ہے کہ جو رائے دیتے ہیں وحی اس کے مطابق آتی ہے مگر یہ صورت کب ہوئی؟ یہ صورت جب ہوئی کہ جب حضرت عمرؓ کا نفس بالکل رضائے الٰہی میں فانی ہو گیا۔ اپنے نفس کی کوئی خواہش باقی نہ رہی اس حالت میں نفس میں جو بھی خواہش آتی ہے وہ بھی پسندیدہ ہے، حق اور مرضی خداوندی کے مطابق ہوتی ہے۔ تو اللہ کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کے ہر فعل پر اللہ راضی ہو جائے حتیٰ کہ اگر نفسانی خواہش بھی پیدا ہو تو اس پر بھی اللہ راضی ہو، اس لیے کہ اسے منشاءِ حق کی طلب ہے اور بندے کے راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ہر تقدیر پر راضی، نعمت دے دے جب بھی راضی، مصیبت دے دے جب بھی راضی۔

بشاشت کے ساتھ رضا کا اعتبار ہے مجبوری کے ساتھ نہیں:۔ تو انسان کے نفس میں اللہ سے محبت، تعلق اور اتنا اطمینان پیدا ہو جائے کہ اس کی ہر تقدیر پر وہ بشاشت کے ساتھ راضی ہو، مجبوری کے ساتھ نہیں، صبر بشاشت کے ساتھ ہو، مجبوری کا صبر سبھی کو آتا ہے کسی کے ہاں خدانخواستہ میت ہو جائے تین چار دن کے بعد خود ہی صبر آجاتا ہے، مگر صبر وہ ہے جو بروقت کیا جائے، جب کہ غم کا پہاڑ ٹوٹ رہا ہو اسے صبر کہتے ہیں۔

جیسے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کا گزر ایک عورت پر ہوا جو قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "اللہ سے ڈر اور صبر کر"۔ وہ بولی "جاؤ جی پرے ہٹو۔ یہ مصیبت تم پر پڑی ہوتی تو پتہ چلتا"۔ وہ آپ خاتم النبیین ﷺ کو پہچان نہ سکی تھی۔ پھر جب لوگوں نے اسے بتایا "یہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ تھے" تو اب وہ (گھبرا کر) نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے دروازہ پر پہنچی۔ وہاں اسے کوئی دربان نہ ملا۔ پھر اس نے کہا "میں آپ خاتم النبیین ﷺ کو پہچان نہ سکی تھی۔ (معاف فرمایئے)" تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "صبر تو جب صدمہ شروع ہو اس وقت کرنا چاہیے (اب کیا ہوتا ہے)"۔ (صحیح بخاری)

یہ تو مجبوری کا صبر ہے سب کو حاصل ہو جائے گا۔ صبر وہ ہے جو ارادے سے اور اختیار سے کیا جائے اور اس حالت میں ہو جب کہ غم پڑا ہوا ہے اس وقت بندہ مطمئن ہو کہ جو کچھ ہے من جانب اللہ ہے اور خیر اسی کے اندر ہے۔ میں راضی ہوں اور مطمئن ہوں درحقیقت یہ اطمینان رضا ہے۔

رضاءِ الٰہی پر اُخروی و ابدی انعام:- غرض مومن کو یہ بشارت مرنے کے بعد دی جائے گی کہ اے نفس مطمئنہ! تجھے اللہ کے ہر فعل اور تقدیر پر اطمینان حاصل تھا۔ راحت ہو یا پریشانی ہو، نعمت ہو یا مصیبت ہو، خوشی ہو یا غمی ہو تو ہر حالت میں اللہ سے مطمئن تھا کہ جو ہو رہا ہے میرے لیے خیر ہو رہا ہے۔ تو اے نفس! جس کی یہ کیفیت تھی کہ اسے اللہ کے افعال پر طمانیت و بشاشت حاصل ہو گئی تھی اب تو اس حالت میں ''ارجعی'' ہماری طرف لوٹ کہ تو بھی ہم سے راضی، ہم بھی تجھ سے راضی تو نے اپنی عمر ہماری رضا میں گزار دی ہم اب تیری ابدی عمر اپنی رضا میں گزاریں گے۔ ہم تجھ سے راضی ہیں، کبھی ناراض نہیں ہونگے۔ جب تو اس مقام پر ہے تو ''**فادخلی فی عبادی**'' اب تیرا نام میرے بندگان خاص میں لکھ لیا گیا ہے۔ تو ان میں داخل ہے۔ مطلقاً بندے تو سبھی ہیں، کفار و فجار بھی اس کے بندے ہیں، ابلیس بھی اسی کا بندہ ہے، مگر عبادِ خاص نہیں ہیں جن کو مقرب کیا جائے جن پر عبد کا اطلاق آئے، **عبد وہ ہے جس میں عبدیت ہو اور عبدیت مطلقاً، عبدیت کے معنی غلامی کے ہیں یعنی اللہ کے سامنے ایسی غلامی ہو کہ جو بھی وہ کرے یا کہے بس اس کے سامنے راضی ہی راضی ہو، ناخوشی کا سوال ہی نہ ہو، اسے ''عبدِ مطلق'' کہتے ہیں** دوسرے لفظوں میں قرآن کریم نے اسے تفویض کہا ہے (سورہ المومن، آیت نمبر 44)

اُفَوِّضُ اَمْرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ **ترجمہ:** "ہر معاملہ اللہ کو سونپتا ہوں"۔

اسی لیے تفویض میں راحت، تجویز میں مصیبت ہے جو وہ کرے میں مطمئن اور راضی ہوں۔

واقع یہ ہے کہ بندے کیلئے راحت بشاشت جتنی ہے (تفویض) کے اندر ہے جتنی مصیبتیں ہیں سب تجویز سے آتی ہیں۔ خود ہم تجویز کرتے ہیں کہ ایسا ہونا چاہیے۔ ویسا ہوتا نہیں، تو بیٹھ کر گھٹتے ہیں یہ مصیبت ہے اور اگر شروع سے یہ کہہ دیں کہ جو اللہ تعالیٰ کر دے میں اسی پر راضی ہوں، پھر خلاف طبع کوئی چیز پیش نہیں آئے گی جب خلاف طبع نہیں پھر مصیبت کیا ہوئی۔ مصیبت ہے ہی اپنی تجویز اور جب تفویض کر دی، سارا معاملہ اللہ کو سونپ دیا اور یہ سمجھ لیا جو ہوگا خیر ہوگا قلب کے اندر گھٹن پیدا نہیں ہوگی نعمت آ جائے جب بھی راضی، مصیبت آ جائے جب بھی راضی۔

دنیا میں قانون مکافات کا عمل جاری ہے:- دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مکافات جاری کیا ہوا ہے یعنی ادل بدل کا قانون کہ جیسا تم کرو گے ویسا ہی تمہارے ساتھ برتاؤ ہو گا۔ جیسی تم راہ اختیار کرو گے ویسے ہی تمہارے متعلق ادھر سے اختیار کی جائے گی۔ اگر تم گناہ کرنے سے لوٹ جاؤ گے تو اللہ بھی عذاب دینے سے لوٹ جائیں گے، تم بدی کی طرف لوٹو گے، اللہ عذاب دینے کی طرف لوٹیں گے، جیسا تم کرو گے، ویسا اللہ کریں گے، جو اللہ سے ملنا پسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملنا پسند کریں گے، جو اللہ سے ملنا مکروہ جانتا ہے اللہ بھی اس سے ملنا مکروہ جانتے ہیں، اللہ بھی اس سے نہیں ملیں گے، تم اللہ کی مدد کرو گے اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ تم اللہ کو یاد کرو گے، اللہ بھی تمہیں یاد کریں گے۔ غرض قانون مکافات میں ہے جو برتاؤ بندے کا ہوگا وہی اللہ کا بندے کے ساتھ ہوگا۔

مومن کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے کافر کو نہیں:- اس کو فرمایا گیا ہے اِرۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ اے نفس لوٹ کر آ۔ یعنی ہم نے تجھے دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا تھا تو دنیا کی چیز نہیں، تو آخرت کی چیز ہے اب تو نے اپنی رضا و اطمینان دے دیا، اس لیے مقصد پورا ہو گیا، اس لیے اب لوٹ کر ہماری طرف آ جا، اس حالت میں کہ تو ہم سے راضی، ہم تجھ سے راضی۔ اب جو بندہ مطمئن نہیں ہے، اسے ارجعی کہ لوٹ کر آ کا خطاب نہیں دیا جائے گا۔ تو دنیا کا تھا دنیا ہی میں رہ۔ حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے کہ کافر کی روح جب چڑھتی ہے ملائکہ اس کو لے کر جاتے ہیں تو آسمانوں کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اس پر نفرین و لعنت کی جاتی ہے۔ وہیں سے اس کو پٹخ دیتے ہیں اور وہ جہنم کے طبقے تحت الثریٰ میں پہنچ جاتی ہے۔ شیخ اکبرؒ نے ایک موقع پر لکھا ہے کہ آسمان سے نیچے نیچے جتنا علاقہ ہے وہ سب جہنم کا ہے۔ آسمان سے اوپر جتنا علاقہ ہے وہ سب جنت کا ہے گویا ہم اور آپ اس وقت جہنم میں موجود ہیں اس سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں، حق تعالیٰ نے ایک رسی ٹانگ دی ہے کہ جو اس کو پکڑ لے گا وہ اس تہہ خانہ سے نکل کر ہم تک پہنچ جائے گا اور وہ

رسی کیا ہے؟(سورہ آل عمران،آیت نمبر103)　　　وَاعۡتَصِمُوۡ بِحَبۡلِ اللّٰہِ ترجمہ:"اللہ کی رسی کو مضبوط تھامو-"

یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو اللہ نے آسمان سے ٹانگ دی ہے جو اس کو تھام لے گا اسے جہنم سے نکال کر اللہ تک پہنچادے گی گو یا مومن اس جہنم سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔کفار نے ایمان اختیار نہیں کیا، وہ جہنم میں موجود ہیں،جہنم میں رہیں گے یہ نہیں کہ وہ جہنم میں داخل کئے جائیں گے وہ اب بھی جہنم میں ہیں، نکلنے والے نکل جائیں گے، رہنے والے رہ جائیں گے۔تو حق تعالیٰ نے اس عالم میں مومن کو اس لیے بھیجا ہے کہ اپنا امتحان دے کر لوٹ کر آئے ،کافر اس لیے بھیجا ہے کہ تو جا رہا ہے تو ابدالا باد تک وہیں رہے گا۔اس کو ہم جہنم کی شکل دے دیں گے۔اس لیے کافر کو دنیا سے نہیں نکلنا ہے،مومن کو نکل بھاگنا ہے۔اس لیے''ارجعی'' رجوع کرو۔تو پہلے بھیجا گیا ہے بعد میں رجوع کرایا گیا ہے کہ ہم نے چند دن بھیجا تھا۔اب لوٹ آؤ۔

علت رجوع اور کس حالت میں لوٹ آؤ؟ یہ گویا، رجوع کی علت ہے کہ کیوں لوٹ کے آؤ؟ کیوں ہم اپنی طرف بلا رہے ہیں کہ تم ہم سے راضی ہو چکے ہو۔ جو ہم سے ناراض ہے اسے ہم اپنے پاس نہیں بلانا چاہتے تو''ارجعی'' کی حکمت یا علت''رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً'' ہے کہ لوگو!اس لیے کہ تم ہم سے اور ہم تم سے راضی ہو چکے اور جب تم ہم سے راضی اور ہم تم سے راضی،تو تمہاری جگہ ہمارے قرب میں ہے،اس کے بعد کے عالم میں نہیں ہے جس کو ہم دنیا کہتے ہیں۔بعینہ وہی جہنم ہے۔مومن کو اس سے نکالنے کی کوشش کی جارہی ہے اس لیے کہ وہ ایمان قبول کر چکا ہے کافر نکلنا نہیں چاہتا۔اس لیے کہ اس نے ایمان قبول نہیں کیا۔

جو بندہ نہیں بننا چاہتا حق تعالیٰ اسے بندہ بنانا نہیں چاہتا اور جو ایسا بندہ ہو کہ وہ اللہ سے راضی اور اللہ اس سے راضی بندے کا اطلاق اسی پر آئے گا جتنی بندگی اس نے کی ہوگی۔ فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبَادِیۡ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ ترجمہ:''میرے ان بندوں میں داخل ہوجا جو میرے خاص بندے ہیں''-

جنہوں نے بندگی کا انکار کر دیا،جنہوں نے اللہ تعالی کا دین نہیں مانا،وہ بندہ بننا نہیں چاہتے تھے---وہ مطیع بننا نہیں چاہتے تھے---اللہ کی راہ اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے تو وہ اپنے ذمہ دار خود ہوں گے۔اور مومن کہتا ہے کہ''امن اللہ'' ہم ایمان لے آئے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم آپ کی ہر چیز پر راضی ہیں۔اللہ تعالی اس کو فرماتے ہیں" تو راضی ہے تو پھر ہم بھی راضی ہیں"۔پھر وہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں ہمارے پاس چلے آؤ اس لیے''ارجعی'' کا لفظ رکھا کہ لوٹ کر آ اور جب راضی و مرضی بن کر لوٹ کر آ گیا تو فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبَادِیۡ وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ میرے بندوں میں داخل ہوجا۔صحیح معنوں میں تو ہی بندہ ہے اور تو ہی میری جنت کا وارث اور مستحق ہے اور تو ہی اس کے قابل ہے کہ تو اس مقام کریم وقرب میں پہنچ جائے۔

تو خطاب موت کے وقت مومن بندے کے لیے ہے:(سورہ فجر،آیت نمبر30-27)

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ۝ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً۝فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ۝وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ۝

ترجمہ:"اے نفس مطمیئنہ واپس آ اپنے پروردگار کی طرف اس حالت میں کہ تو اللہ سے راضی اور اللہ تجھ سے راضی اور میرے خاص بندوں میں شامل ہوجا اور میری جنت میں داخل ہوجا"۔

****

معرفت الٰہی

حق تعالیٰ کو پہچاننے کے بیسیوں طریقے قرآن پاک میں ذکر کئے گئے ہیں سب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں انسان کے اندر موجود ہیں کائنات میں موجود ہیں جو ان کو پہچان لیتا ہے وہ اللہ کو پہچان لیتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ تعمیر کو دیکھ کر معمار پہچانا جاتا ہے لکھائی کو دیکھ کر لکھنے والا پہچانا جاتا ہے۔ شعر کو دیکھ کر شاعر کی پہچان ہوجاتی ہے۔ تو اتنی بڑی کائنات اور بڑی نشانیاں، انہیں دیکھ کر خود اقرار کرنا پڑتا ہے کہ بنانے والا کوئی بہت بڑا ہے اور بڑی عظیم الشان ذات ہے جس نے اتنی بڑی کائنات بنا کر رکھ دی۔ یہ کائنات خود بخود نہیں بن گئی ہے بلکہ یہ کسی نے بنائی ہے اور وہ ہی اس کو چلا رہا ہے۔ بہت سے دہریوں نے انکار کیا کہ اللہ کا کوئی وجود نہیں ہے اور یہ کائنات از خود بن گئی ہے۔ یہ جہالت ہے اور فطرت کے خلاف ہے دلیل سے انسان اللہ کو نہیں پہچانتا بلکہ دل پر ایک دباؤ ہے کہ اسے ماننا پڑتا ہے کہ ہے کوئی ذات۔

امام ابوحنیفہؒ کا واقعہ ہے کہ ان کے زمانے میں مہدی جو اموی خلیفہ تھا اس کے دربار میں ایک دہریہ آیا جو خدا کی ذات کا منکر تھا اس نے کہا کہ میں نہیں مانتا کہ کسی خدا کا وجود ہے یہ کائنات خود بخود بن گئی ہے اور خود بخود چل رہی ہے لوگ پیدا ہوتے مرتے ہیں یہ ایک طبعی کارخانہ ہے۔ اس کا بنانے والا کوئی نہیں ہے اس نے چیلنج کیا کہ مسلمانوں میں جو سب سے بڑا عالم ہو اسے میرے مقابلے میں لایا جائے تاکہ میں اس سے بحث کروں۔ لوگ غلطی میں مبتلا ہیں اپنی طاقتوں کو خواہ مخواہ ایک غیبی طاقت کے تابع کر دیا ہے جو سارے جہان کو چلا رہی ہے۔

اس زمانے میں سب سے بڑے عالم حضرت امام ابوحنیفہؒ تھے مہدی نے امام صاحب کے پاس ایک آدمی بھیجا رات کا وقت تھا۔ رات ہی کے وقت دربار منعقد ہوتا تھا کہ وہ آکر اس دہریے سے بحث کریں اور اس کو راہ راست پر لائیں۔ چنانچہ آدمی وہاں پہنچ گیا اور صورت حال سے امام صاحب کو آگاہ کر دیا اور کہا" آپ کو مناظرہ کے لئے بلوایا گیا ہے"۔ بغداد میں ایک بہت بڑا دریا ہے اسے دجلہ کہتے ہیں اس کی ایک جانب شہر اور دوسری جانب شاہی محلات۔ امام ابوحنیفہؒ شہر میں رہتے تھے اس لئے دریا پار کر کے آنا پڑتا تھا۔

امام صاحب نے پیغام لانے والے سے کہا" اچھا جاکر کہہ دو میں آرہا ہوں"۔ دربار لگا ہوا تھا خلیفہ اور امرا بیٹھے ہیں وہ دہریہ بھی بیٹھا ہوا ہے وہ آدمی واپس آگیا اور کہا" میں نے امام صاحب کو اطلاع کر دی ہے وہ آنے ہی والے ہیں"۔ اب دربار لگا ہوا ہے سب لوگ انتظار کر رہے ہیں امام صاحب نہیں آئے۔ رات کے بارہ بج گئے۔ دہریے نے کہا" معلوم ہوتا ہے تمہارے امام صاحب ڈر گئے ہیں"۔ سب لوگ پریشان۔ جب رات کا ایک بجا تو امام صاحب دربار میں حاضر ہوئے۔ خلیفہ نے تعظیم کی جیسا کہ علمائے ربّانی کی کی جاتی ہے۔ تمام دربار کھڑا ہوگیا۔ بیٹھنے کے بعد خلفیہ نے امام صاحب سے کہا'' آپ نے اتنی دیر کیوں کر دی رات 10 بجے بلایا گیا تھا اور آپ ایک بجے تشریف لائے ہیں''؟ امام صاحب نے فرمایا" ایک عجیب حادثہ ہوگیا تھا جس کی وجہ سے دیر ہوگئی"۔ سب لوگ حیران ہوئے کہ کیسا حادثہ؟ فرمایا" عجیب واقعہ تھا۔ خود مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ کیا ہوا؟ اور کیسے ہوا"؟ امیر المومنین نے کہا" فرمایئے ہوا کیا تھا"؟'' قصہ یہ ہوا کہ میں شاہی محل میں آنے کے لئے دریا کے کنارے پر پہنچا تو اندھیری رات تھی نہ کوئی ملاح تھا نہ کوئی کشتی۔ میں حیران تھا کہ دریا کس طرح پار کروں؟ اس شش و پنج میں کھڑا تھا کہ میں نے دیکھا کہ دریا کے اندر سے لکڑی کے عمدہ تختے نکلنا شروع ہوئے اور ایک کے بعد ایک نکلتے جارہے تھے۔ میں حیرت میں تھا کہ یکا یک تختے خود بخود جڑنے شروع ہوگئے اور کشتی کی صورت اختیار کرنے لگے میں حیران تھا کہ آخر ان کو کون جوڑ رہا ہے کہ بالکل ترتیب سے جڑتے چلے جارہے ہیں۔ ابھی میں دیکھ ہی رہا تھا کہ دریا کے اندر سے لوہے اور پیتل کی کیلیں نکلنی شروع ہوئیں اور خود بخود اس کے اندر ٹھکنے لگیں اور جڑ جڑ کر بہترین قسم کی کشتی بن گئی۔ ابھی میں حیرت میں تھا کہ وہ کشتی خود بخود میری طرف بڑھنا شروع ہوئی اور کنارے پر آگئی۔ میں اس میں سوار ہوگیا وہ خود بخود مجھے لے کر روانہ ہوگی۔ حیرت اس بات کی تھی کہ کشتی پانی کے بہاؤ کے خلاف چل رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ پانی کے بہاؤ کے مخالف یہ کیسے چل رہی ہے؟ آخر اس حیرت میں کنارہ آگیا۔ کشتی رک گئی اور میں اتر کر یہاں آگیا اور اب بھی سوچ رہا ہوں کہ یہ کیا واقعہ ہوا''؟

یہ تمام باتیں دہریے نے سنیں اور کہا" امام صاحب میں نے تو یہ سنا تھا کہ آپ بہت بڑے عالم ہیں مگر آپ تو بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کشتی بنانے والا نہیں، خود بن گئی۔ کوئی کیلیں ٹھوکنے والا نہیں۔ خود بخود ٹھک گئی۔ کوئی چلانے والا نہیں خود ہی چل پڑی، خود ہی سمجھ گئی کہ آپ کو شاہی محل جانا ہے یہ کوئی عقل میں آنے والی باتیں ہیں"؟ امام صاحب نے فرمایا" اچھا یہ بات نادانی اور بیوقوفی کی ہے"؟ اس نے کہا" جی ہاں"۔ امام صاحب نے فرمایا" ایک کشتی تو بغیر بنانے والے کے نہیں بن سکتی، بغیر کیلیں ٹھوکنے والے کے کیلیں نہیں ٹھک سکتیں اور بغیر چلانے والے کے کشتی چل نہیں سکتی؟ یہ معمولی کشتی جسے انسان بنا سکتا ہے یہ تو خود بخود بن نہیں

سکتی تو اتنا بڑا جہاں اتنی بڑی کائنات اتنے احسن طریقے سے بغیر بنانے والے اور چلانے والے کے کیسے بن گئی اور کیسے چل رہی ہے؟ ہے نا اس کے بنانے والا اور اس کو چلانے والا کوئی اور وہ ہے اللہ"۔

مناظرہ ختم۔ وہ دہریہ اپنا سا منہ لے کر دربار سے اٹھا اور فوراً دربار سے باہر چلا گیا۔

انسان اگر سوچے تو قدم قدم پر اللہ کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ ہزاروں کام کرتے ہیں۔ ہزاروں تمنائیں ہوتی ہیں لیکن کچھ میں کامیابی اور کچھ میں ناکامی ہوتی ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ اولاد ہو، علاج کرواتا ہے، دوائیاں استعمال کی جاتی ہیں لیکن نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ اولاد نہ ہو۔ برتھ کنٹرول کی دوائیاں استعمال کرتے ہیں لیکن اولاد ہوتی رہتی ہے آخیر یہ سب کچھ کرنے والا کون ہے؟ دنیا میں انسان ہزاروں باتیں چاہتا ہے کہ یہ ہوں مگر نہیں ہوتیں۔ لاکھ پریشانیاں ہوں لیکن جو ہونا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ کون چاہتا ہے کہ میں مرجاؤں؟ سارے زندگی چاہتے ہیں۔ بیمار ہوتے ہیں تو دوائیاں استعمال کرتے ہیں۔ غذائیں کھاتے ہیں۔ آب وہوا بدلتے ہیں لیکن جب وقت آجاتا ہے تو بادشاہ، نواب، لکھ پتی، سب مجبور اگر روپیہ خرچ کر کے جان بچائی جاسکتی تو امیر آدمی کبھی نہ مرتا۔ پھر یہ موت دینے والا کون ہے؟ ہم سب مجبور ہیں۔ کوئی ہے جس نے ہمیں مجبور کر دیا ہے، ہم مخلوق نہیں اور اگر مخلوق ہیں تو کوئی ہمارا خالق ضرور ہوگا۔ تو ہر قدم پر انسان اللہ کو اور اس کی نشانیوں کو پہچاننے پر مجبور ہے۔

عقل سے اللہ کا اقرار کیا جاتا تو فلاسفر عارفین کاملین ہوتے:

دلائل پر اللہ کا وجود نہیں ہے اگر دلائل پر موقوف ہوتا تو سب سے بڑے عارف اور خدا پرست یہ فلسفی لوگ ہوتے۔ حالانکہ فلسفی جو عقل پرست ہیں وہ ہی خدا سے دور ہیں۔ امام رازیؒ کا واقعہ ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے وجود پر 100 دلیلیں پڑھیں۔ بڑی فلسفیانہ اور مضبوط دلیلیں اور انہیں ناز تھا کہ میرا ایمان سب سے زیادہ مضبوط ہے۔ اس لئے کہ میں نے اللہ کے وجود پر سو دلیلیں قائم کی ہیں۔ ایک دن امام رازی ایک کھیت پر سے گزر رہے تھے کھیت کا کاشتکار سامنے آ گیا۔ بے چارہ اَن پڑھ، نہ مولوی، نہ فلسفی، نہ عالم۔ امام صاحب نے اس سے پوچھا "کون ہو"؟ کہا "مسلمان ہوں"۔ امام صاحب نے کہا "مسلمان کس کو کہتے ہیں"؟ اس نے کہا "جو یہ کہے کہ اللہ ایک ہے۔ رسول خاتم النبیین ﷺ ایک ہیں۔ آخرت حق ہے وہ مسلمان ہوتا ہے"۔ امام صاحب نے کہا "اچھا تو مسلمان ہے تیرے مسلمان ہونے کی دلیل کیا ہے"؟ دیہاتی نے کہا "اچھا معلوم ہوتا ہے تو کوئی دہریہ ہے"۔ لاٹھی اٹھائی۔ امام صاحب آگے آگے اور یہ دیہاتی پیچھے پیچھے۔ کہ مسلمان ہونے کی دلیل مانگتا ہے۔ "ارے بیوقوف مسلمان تو اللہ کو دل کے یقین سے پہچانتا ہے نہ کہ دلیل سے"۔ "دلائل کے پیر لکڑی کے ہوتے ہیں۔ لکڑی آگ میں جل جاتی ہے پانی میں بہہ جاتی ہے ہوا میں اڑ جاتی ہے"۔ پھر وہ دیہاتی واپس مڑ گیا۔ تو دلیلوں پر اللہ کا وجود نہیں۔ اللہ کا وجود دل کے یقین پر ہے۔

قرآن کریم نے مشاہدات اور واقعات سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت کیا ہے

قرآن پاک نے جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے وجود کے دلائل پیش کئے ہیں وہ منطقی اور فلسفیانہ انداز کے نہیں ہیں۔ بلکہ مشاہدات کو پیش کیا ہے کہ تم اس چیز کو دیکھو اور اس میں سے اللہ تعالیٰ کے وجود کو نکالو۔ اس کے متعلق امام شافعیؒ سے کسی نے پوچھا "تم نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو کیسے پہچانا"؟ فرمایا "میں نے شہتوت کے پتے سے پہچانا۔ اس طرح کہ شہتوت کا پتا بکری کھاتی ہے تو مینگنیاں نکلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ ہرن کھاتا ہے تو مشک نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔ ابریشم کا کیڑا کھاتا ہے۔ تو ریشم نکلنا شروع ہو جاتا ہے تو ایک پتا ہے کہیں مینگنی نکلی کہیں مشک نکلا اور کہیں ریشم نکلا۔ یہ پتے کی طبیعت نہیں ہے۔ طبیعت (خاصیت) ایک کام کر سکتی ہے اس طبیعت کے اوپر کوئی بنانے والا ہے کبھی یہ بنا دیا کبھی وہ بنا دیا تو میں نے اس حقیر سے پتے سے اللہ کے وجود کو سمجھا ہے"۔ اس لئے اگر انسان سمجھنا چاہے تو ایک حقیر سے پتے سے اللہ تعالیٰ کے وجود کو نکال سکتا ہے اور نہ سمجھنا چاہے تو انبیاء علیہ السلام نے ہزاروں دلیلیں پیش کر دیں۔ رات دن معجزے دکھائے۔ نہیں سمجھ سکا۔ ابوجہل کو نہیں سمجھنا تھا۔ نہیں سمجھا۔ ابولہب کو نہیں ماننا تھا آخری وقت تک نہ مانا اور مان لیا تو صدیق اکبرؓ نے عمر فاروقؓ نے جس نے مانا تو کوئی صدیق ہوا اور کوئی فاروق ہوا۔ نہیں مانا تو کوئی ابوجہل ہوا اور کوئی ابولہب رہ گیا۔

امام احمد بن حنبلؒ سے کسی نے پوچھا "آپ مسلمان ہیں"؟ فرمایا "ہاں الحمد للہ" اس نے کہا "مسلمان کون ہوتے ہیں"؟۔ آپ نے کہا "جو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل ہو"۔ اس نے کہا "آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اللہ ایک ہے؟ وہ موجود ہے اور کائنات بھی اسی نے بنائی ہے"؟ اب امام صاحب اگر یہ فرماتے کہ یہ باتیں ہمیں اللہ کی کتاب سے معلوم ہوئیں تو وہ جاہل نہ سمجھ پاتا۔ آپ نے فرمایا "میں جو اللہ کی ذات کو سمجھا ہوں تو ایک عجیب انداز سے سمجھا ہوں میں نے دیکھا ایک محل ہے چاندی کا بنا ہوا ہے اس میں کوئی درز نہیں ہے کوئی راستہ نہیں ہے۔ کوئی سوراخ نہیں ہے۔ کوئی روشن دان نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے اس محل کے اندر ایک سونے کا محل ہے۔ اس میں بھی کوئی دروازہ اور کھڑکی وغیرہ نہیں ہے۔ غرض یہ دو محل ہیں ایک محل دوسرے محل کے اندر ہے۔ ان دونوں کے اندر جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہوا گزرنے

کا راستہ بھی نہیں ہے۔ میں حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس محل کی دیوار ٹوٹی اور اس میں سے ایک جاندار نکلا اور پیدا ہوتے ہی اس نے وہ کام شروع کر دیا جو ایک تجربہ کار جانور کرتا ہے۔ اب اس محل میں باہر سے تو کوئی اندر گیا نہیں اور اندر سے یہ باہر نکلا ہے۔ تو کوئی اس محل کے اندر بنانے والا ہے۔ جس نے اندر ہی اندر اس کو تیار کر دیا اور میں سمجھ گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے"۔ لوگوں نے کہا "حضرت یہ محل کہاں ہے"؟ آپ نے فرمایا "تم نے انڈا نہیں دیکھا وہ چاندی کا محل ہی تو ہے۔ مرغی لے کر اسے بیٹھ گئی اچانک انیس دن کے بعد دونوں محلوں کی دیوار ٹوٹی اور بچہ نکل آیا۔ یہ بچہ نہ کسی سکول میں گیا نہ کہیں تربیت حاصل کی۔ نہ کوئی ڈگری۔ پیدا ہوتے ہی بالکل اپنی ماں کی طرح دانہ چگنا شروع کر دیا۔ تو انسان کے بچے کو جب تک مکتب میں نہ بیٹھائیں کچھ نہیں آتا۔ مادری زبان بھی سیکھنا پڑتی ہے۔ اس کے سامنے الفاظ دہرائے جاتے ہیں وہ گھر کے لوگوں کو الفاظ ادا کرتے ہوئے سنتا ہے تو آہستہ آہستہ سیکھتا ہے۔ اور یہ مرغی کا بچہ پڑھا پڑھایا۔ سیکھا سکھایا پیدا ہوا۔ گویا یہ ترقی یافتہ پیدا ہوا۔ یہ تعلیم اس محل کے اندر اس نے کہاں سے پائی؟ اس کو سکھانے والا اندر کون تھا"؟ یہ اس نے تعلیم دی جس نے فرمایا تمہارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پیدا کر کے ہر چیز کے مطابق اس کے قلب میں ہدایت ڈال دی''۔

انسان کا بچہ ہے تو انسانی حرکتیں خود بخود اس سے سرزد ہونا شروع ہو جاتی ہیں (علم کی بات الگ ہے) چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا کھانے کی خواہش سونے کی خواہش یہ بغیر کسی تعلیم کے خود بخود کرتا ہے۔ تو اندر کوئی تعلیم دینے والا ہے جس نے دل میں راہنمائی کی ہے۔ اور وہ ہے اللہ کی ذات جو دل کے اندر ہدایت دیتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جسم وجہت سے پاک ہے جیسے روح پاک ہے:

ہمارے جسم کے اندر روح ہے اور بدن کی تربیت اندر روح ہی کرتی ہے۔ یہ بدن کے اوپر تازگی اور چہرے پر جو سرخی ہے یہ روح ہی کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ روح نکل جائے تو بدن مرجھا، کملا جاتا ہے۔ مٹی ہو جاتا ہے تو جسم کے شیرازے کو روح نے جوڑ رکھا ہوتا ہے۔ لیکن روح ہمیں نظر نہیں آتی۔ لیکن ہم یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ روح ہے اور اگر نہیں ہے تو ہماری زندگی نہیں ہے۔ اگر کوئی زندہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر روح ہے؟ لیکن کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں۔ لیکن ہمیں معلوم ہے کہ روح ہے تو یہ ایک ایسی مخلوق ہے جس کو ہم نے بلا دلیل مان لیا ہے۔ تو اللہ کی ذات کو نہ مانیں یہ حیرت کی بات ہے۔

جب ہمارا یہ بدن روح کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو اتنا بڑا بدن جس کا سر آسمان ہے جس کے پیر زمین ہے تو اتنا بڑا بدن کس طرح قائم ہے؟ جب تک اس کے اندر کوئی روح موجود نہیں ہے اور وہ اسے چلا نہیں رہی ہے؟ غرض جس طرح سے ہم اپنی روح کے ماننے کے لئے دلیل کے محتاج نہیں۔ محض قوت یقین سے ماننے پر مجبور ہیں۔ اس طرح پوری کائنات کے مدبر اعظم اور روح اعلیٰ کو دلیل سے نہیں مانا گیا۔ قلب کے یقین سے مانا گیا ہے۔

حقیقت پسند انسان کی نظر روح پر ہوتی ہے صورت میں نہیں

اس لئے جو روحانی لوگ ہیں ان کے ہاں کالے گورے کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔ حقیقت پسند انسان کی نظر اوپری چمڑی پر نہیں ہوتی وہ صورت کو نہیں سیرت کو دیکھتا ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ میں حضرت بلال حبشیؓ سیاہ فام، موٹے موٹے ہونٹ جب انہیں نکاح کی ضرورت پیش آئی تو بڑے بڑے صحابہؓ نے کہا کہ سیدنا بلالؓ کے لئے ہماری بیٹیاں حاضر ہیں۔ تو صورت تو اللہ نے بنائی ہے۔ اللہ کو حسن سیرت مطلوب ہے۔ صورت ہمیشہ فتنوں میں ڈالتی ہے۔ سیرت ہمیشہ امن پیدا کرتی ہے۔ صورت تو خراب ہو جاتی ہے۔ سیرت انسان کو بلندی پر پہنچاتی ہے۔ تو صورت ترقی اور رفعت کا باعث نہیں ہے۔ جیسے ہم خوبصورت ہیں۔ بہت سے جانور بھی خوبصورت ہیں۔ مور کتنا خوبصورت ہے پہاڑوں کے اندر جو مرغ زرین ہوتا ہے کئی کئی رنگ اس کے پروں میں ہوتے ہیں۔ شیر کی کھال دیکھیں اعلیٰ قسم کا کمبل ہے۔ تو صورت بڑا نہیں بناتی سیرت کام بناتی ہے۔ ہمارے بہت سے بھائی بند ہیں صورت کے لحاظ سے کم رتبہ لیکن تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے بڑے بڑے ان کے آگے جھک جاتے ہیں۔ اگر صورت معیار ہوتی تو حضرت بلالؓ کی تعریف کوئی نہ کرتا۔ عطا ابن ابی رباحؓ کی تعریف امام ابوحنیفہؒ کبھی نہ کرتے تو معلوم ہوا کہ صورت سے انسان، انسان نہیں بنتا بلکہ سیرت سے آدمی، آدمی بنتا ہے۔

اہل سیرت ہی کو تاریخی عظمت نصیب ہوتی ہے

دنیا میں ہر دور میں ہزاروں حسین گزر گئے اور خاک میں خاک ہو گئے۔ کوئی جاننے والا نہیں لیکن جو سیرت والے گزرے ہیں آج تک ان کے نام عظمت کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ انبیاء کرام علیہ السلام کا ذکر آتا ہے تو ہم کہتے ہیں علیہ سلام۔ صحابہ کرامؓ کا آتا ہے تو ہم کہتے ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اولیا کرام کا ذکر آتا ہے تو ہم کہتے ہیں رحمتہ اللہ علیہم اجمعین اور آپ خاتم النبیین ﷺ کا ذکر آئے تو درود بھیجتے ہیں۔

ہمارے ان بزرگوں کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کرسکتا۔ یہ ہستیاں ہمارے سامنے نہیں ہیں لیکن ان کی سیرت کی وجہ سے ان کی عظمتیں آج بھی وہی ہیں جیسی ان کے اپنے زمانے میں تھیں۔ ان کی سیرت اور علم وفضل ہمارے سامنے ہے۔ اس لئے اصل بنانے کی چیز سیرت ہے۔ اسی کام کے لئے انبیاء کرام اس دنیا میں آئے۔ وہ صورتیں بنانے کے لئے نہیں آئے ان کی تعلیم تھی کہ دلوں کے اندر اخلاق ربانی اجاگر کرو۔ دلوں کے اندر محبت الٰہی پیدا کرو۔ انسان دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب بننے کے لئے آیا ہے۔ نائب میں بھی مالک کے اوصاف ہوں گے تو نائب مالک کی مرضی کے مطابق کام کرے گا۔ تو انسان اللہ کا خلیفہ ہے۔ یہ خلیفہ اور نائب الٰہی بن کر آیا ہے۔ صحابہؓ اور تابعین کی عظمت ہمارے دلوں میں ان کے کمالات کی وجہ سے ہے۔ یہ جان کر کہ ان کے اندر علم کا مادہ موجود ہے۔ ان کی ہم عظمت کرتے ہیں یہ علم ہی درحقیقت اللہ کی چیز ہے۔ یہ کسی انسان کی چیز نہیں ہے۔ انسان کی ذات میں نہ علم ہے نہ اخلاقی کمالات۔ یہ حاصل کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ محنت کر کے آدمی اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔

علم دینے کے لئے مدرسے ہوتے ہیں۔ برسوں محنت کرتا ہے تب آدمی عالم بنتا ہے۔ اخلاق درست کرنے کے لئے خانقاہیں ہوتی ہیں۔ شیوخ کی خدمت اور صحبت میں محنت اور ریاضت کرنی ہوتی ہے۔ تب جا کے اخلاقی کمالات حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے سیرت بنانے کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔ صورت تو من جانب اللہ جیسے ملتی ہے مل جاتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کو حسن سیرت مطلوب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خاندان اور قبیلے بنائے۔ خاندانوں سے پہچان اور وراثت ملتی ہے۔ خاندان فخر کرنے کے لئے نہیں ہوتے کہ ہم سید ہیں اور ہم شیخ ہیں اور ہم اعوان ہیں اسلام نے ان تمام اونچ نیچ کو مٹادیا ہے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (سورہ الحجرات، آیت نمبر 13)

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ　　ترجمہ: ''اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ اچھا وہ ہے جو تقویٰ میں اعلیٰ ہے''۔

اور تقویٰ حاصل کرنا انسان کا اختیاری فعل ہے۔ تو متقی بن کر جس کا جی چاہے باعزت بن جائے اور فاسق وفاجر بن کر جس کا دل چاہے وہ ذلیل بن جائے۔ خلقی طور پر (بنانے کے طور پر) جوہر میں فرق نہیں ہے کہ کسی کا جوہر اچھا ہے اور کسی کا اچھا نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ ہماری سمجھ میں ہماری محنت میں ہماری ریاضت میں فرق ہوتا ہے۔ ہم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کو اللہ نے مٹی سے پیدا کیا۔ یعنی جوہر سب کا مٹی ہے اور ایک جیسا ہے۔ کیونکہ ہم سب ہی آدم کی اولاد ہیں۔

مدار نجات فضل خداوندی ہے: نجات اللہ کے کرم اور اس کے فضل سے ہی ہوگی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس بات ہی کو پکڑ لیں کہ اللہ نے تو فضل سے بخشنا ہے ہمیں عمل کی ضرورت ہی نہیں۔ عمل کرنا ضروری ہے۔

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا ''مجھے کیسے معلوم ہو کہ اللہ کا فضل میری طرف متوجہ ہے'' ؟ انہوں نے جواب دیا'' برخوردار اپنے عمل کو دیکھ لو۔ اگر تم عمل کر رہے ہو تو فضل متوجہ ہے''۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ عمل علامت ہے اس بات کی کہ فضل متوجہ ہے۔ دنیا میں فضل متوجہ ہوتا ہے تو عمل کی توفیق ہوتی ہے اور آخرت میں جب فضل متوجہ ہوگا تو جنتوں کی صورت میں صلہ ملے گا۔ یہاں بھی فضل اور وہاں بھی فضل ہی کام کرے گا۔

جنت عمل نہیں ایمان کا صلہ ہے۔

جنت کا بدلہ ایمان پر ملے گا۔ عمل پر نہیں ملے گا۔ عمل محض علامت ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ انسان کا کمال شکل وصورت سے نہیں بلکہ سیرت سے ہے اور سیرت کا تعلق علم سے، اخلاق سے، اعمال صالحہ سے۔ ایمان باللہ سے، آخرت کو پہچاننے اور یاد کرنے سے ہے۔ اس سے سیرت بنتی ہے۔ یہی اصل مقصود ہے۔ اسے بنانے کی ضرورت ہے۔

دلائل قدرت:

اسی کے لئے حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں دلائل قائم کئے ہیں۔ اپنے وجود کو منوانے اور اپنے کمالات کو بتلانے کے لئے دلائل قائم کئے ہیں۔ اور وہ دلائل فلسفیانہ نہیں ہیں بلکہ دنیا کی چیزیں پیش کی تھیں کہ ان ہی میں غور کرو تا کہ اللہ کا وجود تمہاری سمجھ میں آجائے۔ یہ جو آیت ہے یہ بھی اللہ کے وجود کی مستقل دلیل ہے فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً　　(سورۃ الحج، آیت نمبر 63)

ترجمہ: ''اے مخاطب تو دیکھتا نہیں کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا ہے''۔

پانی کی طبیعت یہ ہے کہ نیچے کی طرف جاتا اسے اوپر چڑھا کے کون لے گیا؟ پانی نیچے سے ابلنا چاہیے۔ اسے نیچے جانا چاہیے یہ ہزاروں میل کی مسافت پر اوپر چڑھا کر کون لے گیا؟ کہ اوپر سے پانی کو گرانا شروع کیا تو پہلی دلیل تو یہاں سے معلوم ہوتی ہے کہ پانی کو نہ ہم بادلوں پر لے کر گئے اور نہ ہمارے آباواجداد۔ کوئی

بڑی ذات ہے کہ جس کے حکم سے پانی اوپر پہنچ گیا۔ اور اپنی طبیعت کے خلاف وہاں جانے پر مجبور ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا وجود پہلے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے آسمان سے پانی اتارا۔ پانی آ کر زمین میں جذب ہوا اور زمین سے پھل، پھول، غلہ، ترکاریاں اور مختلف چیزیں اگنا شروع ہوئیں۔ کاشت کار نے اگر بیج ڈال دیا تو کیا۔ منوں مٹی پھاڑ کر اسکے اندر سے ننھی سی نرم وملائم کونپل کون نکال رہا ہے؟ ہم نے نکالی یا ہمارے آباواجداد نے؟ کاشتکار نے بیج ڈالا پانی ڈالا اس کے بعد اسے معلوم نہیں کہ زمین کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ یہ کونپل ایسی نرم ونازک چیز ہے کہ آدمی اسے انگلیوں سے مسل دے لیکن طاقتور اتنی کہ زمین کو پھاڑ کر نکل رہی ہے۔ تو اس میں یہ طاقت کس نے پیدا کی؟۔ جبکہ اس کی طبیعت تو نیچے جانے کی ہے۔ گھاس کو ہم اوپر اچھالیں وہ نیچے آئے گی۔ نیچے سے اوپر چڑھانے والا کون ہے؟

تو پانی کا نیچے اتارنا، اوپر چڑھانا، پھر زمین کے اندر بیج میں طاقت پیدا کرنا، بیج کا پھٹنا اس میں سے کونپل کا نکلنا۔ منوں مٹی کو پھاڑ کر اوپر آ جانا۔ یہ سارے کام کرنے والا بجز خالق اور مالک اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اور آگے دلیل یہ بیان کی ہے کہ ''مُختَلِفُ اَلْوَانُها ہر پھل کا رنگ الگ الگ ہے۔ سیب، آم، انگور، کیلا ہر ایک کا رنگ الگ پر سیب، آم، انگور، کیلا ہر ایک میں الگ الگ اقسام بھی ہیں حالانکہ جنس ایک ہے۔ مزے بھی مختلف ہیں ''فَتَبٰرَکَ اَحسَنُ الْخٰلِقِینَ'' سبحان اللہ کیا بات ہے خالق کی، سب سے اچھا خالق حالانکہ سب کی اصل زمین ہے سب زمین کے اندر سے نکل رہے ہیں رنگ مختلف ہیں، اگر زمین کی طبیعت رنگ بناتی تو طبیعت تو ایک رفتار پر چلتی ہے۔ پھر پھولوں کو دیکھیں کتنے رنگ اور کتنے خوبصورت کہ انسان دیکھتا ہی رہ جائے پھر آگے دیکھئے کہ رنگ صرف پھلوں اور پھولوں میں ہی نہیں ہیں بلکہ دالوں، ترکاریوں، پہاڑوں، مٹی، کوئلہ ہر ایک میں مختلف رنگ پائے جاتے ہیں۔ انسان اگر اس کی صنائی کا نظارہ کرنے لگے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے اور قدرت دیکھئے کہ آم کے درخت پر ہمیشہ آم ہی لگیں گے، گلاب کا پودا گلاب کا پھول ہی دے گا۔ کہیں بھی کسی چیز میں کوئی غلطی، کوئی بے ترتیبی نظر نہیں آئے گی۔ کھجور کے درخت پر کہیں کیلے نہیں نظر آئیں گے اور کیلوں کے درخت پر کبھی کھجوریں نہیں لگیں گی۔ یہ قدرت کا ہاتھ ہے۔ انسانی ہاتھ نہیں کہ بھول چوک یا غلطی ہو جائے۔ اس طرح انسانوں کو دیکھو تو ان میں مختلف رنگ ہیں۔ عربوں کو دیکھو سرخ رنگ، حبشیوں کو دیکھو تو کالے، چین اور جاپان زرد دار پیلے رنگ، ہندوستان میں دیکھو تو کہیں کالے کہیں گورے سب گڈ مڈ۔

اگر انسان کی طبیعت کا تقاضہ تھا کہ وہ سفید ہو تو پھر کالے اور سفید کیوں ہو گئے؟ طبیعت تو سب کی انسان ہی ہے۔ طبیعت کے خلاف رنگ بھرنا، معلوم ہوتا ہے کہ کوئی رنگ بھرنے والا موجود ہے کہ کوئی ہے خالق کہ جیسا چاہتا ہے ویسا کر دیتا ہے۔ پھر انسانوں کو کیا چوپایوں کو پرندوں کو درندوں کو جس کو بھی دیکھیں مختلف ایک دوسرے سے بالکل رنگ میں شکل میں بناوٹ میں مختلف تو اللہ کی شان ان تمام چیزوں کے اختلاف کو دیکھ کر ثابت ہوئی۔ تو حق تعالیٰ شانہ نے اپنے وجود کو منوایا ہے اور دلیلیں بھی ایسی بیان کی ہیں جو فلسفیانہ انداز کی نہیں ہیں۔ ایسی ہیں کہ گاؤں کا رہنے والا اور شہر کا رہنے والا دونوں کی عقل میں آ جائیں۔ کیونکہ قرآن کریم تمام انسانوں کے لئے کتاب ہے اس میں ایسے دلائل ہونے چاہیے جس کو عوام وخواص یکساں سمجھ سکیں۔ اس لئے اس میں ایسے دلائل سے وجود باری تعالیٰ کو ثابت کیا گیا ہے کہ کم فہم سے کم فہم اور بے پڑھا لکھا بھی آسانی سے سمجھ جائے۔

تو اللہ کی ذات کو پہچانو---اس کائنات کو پہچانو- اس کے بعد اس کائنات کے ذریعے سے جب کائنات کی شناخت ہو تو اللہ تعالیٰ کی ذات سمجھ میں آ گئی اور جب اللہ تعالیٰ کی ذات کو پہچان لیا تو نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی ذات کو پہچانے - پھر نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) کے عمل کو دیکھیں --- پھر نبی (خاتم النبیین ﷺ) کے عمل کو اپنانا شروع کریں--- یہی نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) کا اتباع ہے--- نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) کی پیروی ہے اور جس نے نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) کی پیروی کی وہی متقی بن سکتا ہے- اللہ کو وہی لوگ پسند ہیں جو تقوی میں اعلی ہیں- اللہ تعالی کو حسن سیرت مطلوب ہے تو پہچانو--- پہچان ہم نے سب سے پہلے کی معرفت اللہ کی--- پھر اللہ کی معرفت سے اللہ کے رسول (خاتم النبیین ﷺ) کی--- پھر اللہ کے رسول (خاتم النبیین ﷺ) سے اللہ کے کلام کی--- پھر اللہ کے کلام سے ہم نے جانا کہ ہمیں کس طرح سے اللہ والا بننا ہے- ہم کس طرح سے اللہ کے قریب ہو سکتے ہیں--- ہم نے نبی (خاتم النبیین ﷺ) کی تابعداری کی، پیروی کی تو اللہ کا قرب ان شاء اللہ ہمیں حاصل ہو جائے گا- آخری وقت تک کوشش رکھنی ہے یعنی آخری وقت تک امید اور خوف کے درمیان رہنا ہے کہ کچھ پتہ نہیں نفس کل ہم سے کیا کام کروائے گا-

****

ذکر الٰہی (حصہ اوّل)

ذکر اللہ کے لیے کہا ہے "وَلَذِکْرُ اللہِ اَکْبَرْ" اللہ کا ذکر بہت ہی بڑی چیز ہے۔ ذکر اللہ تک پہنچنے کے لئے سب سے چھوٹی سیڑھی ہے ذکر اللہ اعمال شرعیہ کی روح ہے۔ اس لئے ذکر اللہ ہی اعمال میں سب سے افضل ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں بلکہ عمل مقبول ہوتا ہے ذکر اللہ ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر چیز کی زندگی روح سے ہے۔ محض بدن سے کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔ جب تک بدن کے اندر روح نہ ہو روح نکل جاتی ہے تو پھر آدمی کو مردہ کہتے ہیں۔ پھر وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اسے باقی رکھا جائے بدن کو لے جا کر دفن کر دیتے ہیں یا جلا دیتے ہیں یا پانی میں بہا دیتے ہیں۔ غرض وہی انسان جس سے محبت کا ایک تعلق ہوتا ہے جس کی طرف کشش ہوتی ہے ایک منٹ اس سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ جہاں روح نکلی ہر شخص کو وحشت ہوتی ہے اور چاہتا ہے کہ اسے جلد از جلد دفن کر دیا جائے۔ تو معلوم ہوا کہ محبت درحقیقت بدن سے نہیں ہوتی۔ بدن کے اندر جو روح ساوی ہوئی ہوتی ہے اس سے تعلق ہوتا ہے۔ وہ نکل گئی تو تعلق ختم ہو گیا۔

تو اصل بنیادی چیز اس دنیا میں روح ہے۔ بغیر روح کے نہ زندگی ہے اور نہ کسی شے کے لئے بقا ہے۔ زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ کا ذکر کرتی ہے۔ جس طرح ان مادی چیزوں میں روح ہی سے بقا ہے اسی طرح اعمال شریعت بھی ڈھانچے ہیں۔ جب تک ان میں ذکر اللہ کی روح نہ ہو وہ لاشے کی مانند ہیں۔ ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اگر نماز میں یاد خداوندی کے بجائے غفلت آ جائے تو نماز ختم۔ اس لئے فرمایا گیا ''اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِی''۞ ترجمہ: نماز قائم کرو میرے ذکر کے لئے۔ جب ذکر نہ رہا تو روح نماز ختم ہو گئی۔ اب محض ایک اٹھک بیٹھک اور ایک بدنی ورزش ہے جس کی کوئی قدر و قیمت اللہ کے نزدیک نہیں ہے۔۔ اسی طرح سے اگر روزے کے اندر ذکر، تلاوت، تراویح وغیرہ نہ ہوں تو روزے کا وہ ثواب وہ اجر نہیں جو ان چیزوں کے ساتھ ہے یعنی ذکر اللہ کے ساتھ۔ نیت کے سچے اور اس میں ذکر اللہ یا، یاد خداوندی ہونے سے اعمال میں جان پڑ جاتی ہے (روح) اسی کو عبادت کہتے ہیں۔ یہ جان یہ روح نکل جائے تو یہی عبادت، عادت بن جاتی ہے۔

تو عبادت اور عادت میں یہی فرق ہے کہ عادت محض ایک ڈھانچہ ہوتا ہے۔ جس میں یاد نہیں۔ یاد ہے تو کم ہے (دھیان ہی نہیں) اگر یاد بھی ہے تو نفس کی یعنی (اپنی دنیا کی خواہشات کی طرف توجہ ہے) اور عبادت میں اللہ تعالیٰ کی یاد ہوتی ہے۔ نفس کی یاد نہیں ہوتی۔ اس طرح اگر حج میں ذکر اللہ نہیں (یاد خداوندی نہیں) تو بس سیر و سیاحت ہے۔ ذکر اللہ اور سچی نیت آ جائے تو حج ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ عادت میں نفس کا جذبہ کام کرتا ہے اور عبادت میں جذبہ یاد حق۔ اور یاد حق میں کیا گیا ہر کام عبادت ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ جب اس کائنات کی روح اللہ کی یاد ہے تو اسی طرح پوری شریعت کی روح بھی اللہ کی یاد ہے۔ اگر دنیا میں سے روح نکل جائے تو دنیا ڈھانچہ بن جائے۔ شریعت میں سے کوئی اس روح کو نکال دے تو شریعت عادت بن جائے گی۔ عبادت نہیں رہے گی۔

حدیث پاک میں ہے۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا '' قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک اس دنیا میں ایک آدمی بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے۔ جب ایک بھی باقی نہ رہے گا تو قیامت قائم کر دی جائے گی''۔ (صحیح مسلم)

قیامت کا مطلب دراصل عالم کی موت کے ہیں جیسے کہ مرنے کے بعد انسان کا جسم پھول، پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح قیامت کے دن صور پھونکنے کے بعد آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ زمین ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ پہاڑ گالوں کی طرح اُڑتے پھیریں گے۔ پانی مٹی میں اور مٹی پانی میں۔ سارا کارخانہ گڑبڑ اور درہم برہم ہو جائے گا۔ یہ قیامت ہے۔ معلوم ہوا کہ اس دنیا کی روح ذکر اللہ ہے۔ تو پوری دنیا میں زندگی یعنی روح درحقیقت یاد خداوندی سے ہے۔

دنیا کے ایک ایک جز میں ذکر اللہ سے ہی زندگی ہے:- قرآن پاک سورہ بنی اسرائیل، آیت نمبر 44 میں ارشاد خداوندی ہے:

ترجمہ: '' کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح (کی کیفیت) کو سمجھ نہیں سکتے، بے شک وہ بڑا بردبار بڑا بخشنے والا ہے''۔

چلتا ہوا پانی اللہ کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ رک جاتا ہے تو تسبیح بند ہو جاتی ہے۔ تو وہی وقت اس کی موت کا ہوتا ہے۔ جہاں پانی ٹھہرا، چند دن کے بعد خراب ہو جاتا ہے۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں پاکی نہیں رہتی۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ اس لئے کہ اس کے اندر سے روح ختم ہو گئی تو چلتا ہوا پانی اللہ کی تسبیح کرتا ہے اور ٹھہرا ہوا پانی تسبیح سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور وہی وقت اس کی موت کا ہوتا ہے۔

درخت کی پتیاں، ٹہنیاں جب تک سرسبز ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہیں۔ تسبیح بند ہوئی جبھی ان پر زردی آ جاتی ہے۔ خشک ہو جاتی ہیں۔ وہی جلانے کے

قابل بن جاتی ہیں۔گویا جہاں ذکر کی روح نکلی جلانے کی چیزیں بن گئیں۔پھر انہیں جلادیا جاتا ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ انسان ہو یا دنیا کا کوئی بھی جز و ہو وہ جبھی تک زندہ ہے جب تک اس میں ذکر اللہ (یاد خداوندی ہے) ذکر نہ ہو تو عالم کے لئے فنا ہے۔نتیجہ یہ نکلا کہ اس دنیا کو اللہ اللہ کرنے والوں نے سنبھال رکھا ہے۔

دنیا اللہ کی محبت اور خوف خدا سے قائم ہے:- دنیا کے بہت سے طبقات کو یہ دعویٰ ہے کہ اس دنیا کو ہم نے سنبھال رکھا ہے۔کاشتکار دعویٰ کرتا ہے کہ ''دنیا کو میں نے سنبھال رکھا ہے۔اس لئے کہ دنیا کھانے پینے سے قائم ہے میں اگر غلہ (اُگاتا ہوں، گیہوں، چاول، چنا سب میری وجہ سے اُگتا ہے) اُگانا چھوڑ دوں لوگوں کو کھانے کو نہ ملے ساری دنیا فنا ہو جائے۔تو دنیا کی زندگی تو میرے دم سے قائم ہے۔اگر کاشتکار اور زمین دار نہ ہوں تو دنیا ختم ہو جائے''۔تاجر نے آکر کہا کہ ''دنیا کو تو میں نے سنبھال رکھا ہے۔اس لئے کہ تو کچی جنس اُگاتا ہے۔ان اجناس کو بنا سنوار کر میں دوکان پر نہ لاؤں۔کپڑا، غلہ، پھل پھول سپلائی نہ کروں۔دنیا بھوکی مر جائے گی۔تو میری بدولت یہ دنیا قائم ہے۔تو نے غلے کا انبار لگا دیا۔روٹی کے ڈھیر رکھ دیئے میں نے آٹا بنوا کر، کپڑا بنا کر رکھا تو لوگوں کے کام آیا تو دنیا کو سنبھالنے والا تو میں ہوں۔ان دونوں کے بالمقابل ایک سیاسی اور حکومت کا آدمی ان دونوں کو کہتا ہے کہ تم دونوں غلط ہو۔دنیا کو تو میں نے سنبھال رکھا ہے۔کیونکہ میں نے امن قائم کر رکھا ہے۔اگر میں امن قائم نہ کروں تو کاشتکار تاجر کو ختم کر دے اور تاجر کاشتکار کو۔سرمایہ دار مزدور کو مار دے اور مزدور سرمایہ دار کو۔کاشتکار اور تاجر کی دوکانوں پر ڈاکے مارے جائیں۔یہ میں نے عدل وانصاف سے دنیا کو سنبھال رکھا ہے''۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''تم سب غلط کہتے ہو۔دنیا کو سنبھالنے والا ہمارا نام لینے والا ہے۔جو ہماری یاد میں مصروف ہے اس نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے''۔غور کریں تو اللہ تعالیٰ کا دعویٰ ہی سچا ہے۔اگر کاشتکار دیانت داری سے کام کرتا ہے۔جتنا غلہ اس کے ہاں اُگتا ہے۔اس کو بازار میں جا کر بیچ دیتا ہے۔نہ بے ایمانی کرتا ہے نہ دوسرے کے غلے کو اپنے غلے میں ملاتا ہے تو جب تک وہ دیانت داری سے کام کرتا ہے اس کا کام بھی خوب چلتا ہے اور دنیا کا کام بھی چلتا رہتا ہے۔کاشتکار کی یہ دیانت داری اس کی طرف سے ذکر اللہ ہے۔ اس نے دیانت داری کیوں کی؟ اس لئے کہ اسے خوف خداوندی ہے۔وہ اللہ سے محبت رکھتا ہے۔اس کو راضی رکھنا چاہتا ہے۔اس طرح زمین دار نے اگر سنبھال رکھا ہے تو دیانت داری سے۔سیاسی آدمی نے اگر سنبھال رکھا ہے تو عدل وانصاف سے۔تو زمیندار کی دیانت داری اور تاجر کا عدل وانصاف ان کی طرف سے ذکر اللہ ہے۔انہیں اللہ یاد ہے جبھی انہوں نے دیانت اور عدل سے کام لیا۔اس طرح یہ دنیا کو سنبھالنے والوں میں شامل ہو گئے۔

درحقیقت تاجر کی دیانت داری نے دنیا کو سنبھالا ہے۔یہاں تاجر کی طرف سے اس کی یہ دیانت داری ذکر اللہ ہے۔تو اللہ کا نام لینے والے دنیا کو سنبھالنے والے ہیں۔کرسی عدالت پر بیٹھنے والا جج یا کرسی پر بیٹھنے والا حاکم۔بے شک اس نے امن کا نظام قائم کر رکھا ہے مگر کب؟ جبکہ وہ عدل وانصاف کرے اور کسی پر ظلم نہ کرے۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اے ایمان والو' اقوام بالقسط بن جاؤ''۔یعنی عدل وانصاف سے فیصلے کرو۔دیانت داری سے فیصلے کرو اگرچہ دیانت داری سے تمہارے نفس کے خلاف ہی فیصلہ ہو۔تو اپنے اوپر برداشت کرو۔مگر فیصلہ حق کا کرو۔اگرچہ تمہاری اولاد پر بن جائے۔مت پرواہ کرو۔عدل سے کام لو۔

امیرالمومنین حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک دعویٰ کیا اور قاضی شریح نے امیر المومنین کو عدالت میں طلب کیا۔حالانکہ حضرت علیؓ خلیفۃ المسلمین ہیں اور قاضی شریح ان کے ماتحت ہیں لیکن عدل اور انصاف کا مقام اتنا بڑا ہے کہ امیر ہو، غریب، عوام ہو خلیفہ اسے عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ایک مدعی اور مدعا علیہ کی طرح سے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑے گا۔وہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ امیر المومنین ہیں تو ان کے لئے کرسی بچھا دی جائے اور مدعی بن کر آئے گا تو اسے وہیں کھڑا ہونا ہوگا جہاں عام مدعی اور مدعا علیہ کھڑے ہوں گے۔

حضرت علیؓ کے پاس سمن پہنچا کہ آپ عدالت میں حاضر ہو جائیں۔اور یہودی کو بھی عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔امیر المومنین کے سامنے یہودی کی کیا حیثیت، دونوں کو حاضر ہونا پڑا اور دونوں کو ایک درجے میں کھڑا ہونا پڑا۔قاضی کی نگاہ میں دونوں ایک درجے کے تھے اس لئے دونوں کو برابر برابر کھڑا کیا گیا۔قاضی شریح نے فرمایا کیا دعویٰ ہے؟ امیر المومنین نے فرمایا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے میری زرہ پر زبردستی قبضہ کر لیا ہے۔مجھے دیتا نہیں ہے حالانکہ زرہ میری ہے۔یہودی نے کہا ان کی زرہ نہیں ہے یہ میری ہے۔حالانکہ زرہ حضرت علیؓ کی تھی۔قاضی شریح نے کہا کہ کوئی گواہ ہے۔حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ''ہاں ایک تو میرا غلام ہے اور ایک میرا بیٹا حضرت حسنؓ ہیں''۔قاضی نے کہا کہ ''بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں اور دو گواہ کے بغیر دعویٰ ثابت نہیں ہو سکتا۔کوئی اور گواہ لاؤ''۔حضرت علیؓ نے فرمایا ''یہی دو گواہ ہیں ایک میرا بیٹا اور ایک میرا غلام۔قاضی نے کہا ایک گواہ کی موجودگی ناکافی ہے آپ کو ڈگری نہیں دی جا سکتی۔یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا کہ زرہ اسی کی ہے۔

حضرت علیؓ کو نہیں مل سکتی۔ حالانکہ حضرت علیؓ کا دعویٰ سچا تھا۔ مگر ضابطے کا ثبوت میسر نہیں ہوا۔ اس لئے فیصلہ ان کے خلاف ہو گیا۔ یہودی پر اس عدل کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے وہاں کھڑے کھڑے ہی کہا: " اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمد رسول الله " اور سچے دل سے دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا اور کہا کہ "جس دین کے اندر اتنا عدل وانصاف ہے کہ ایک امیر المومنین اور ایک غریب سے غریب غیر مسلم کو ایک نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ میں اس کی حقانیت کا قائل ہو گیا ہوں اور علی الا اعلان کہتا ہوں کہ میرا دعویٰ غلط تھا۔ سچے حضرت علیؓ ہی ہیں اور اپنی زرہ ان کو دے دی"۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "اب مجھے زرہ کی ضرورت نہیں۔ زرہ بھی تو رکھ لے تیرا دین جب میرا دین بن گیا تو مجھے سب کچھ مل گیا"۔ تو ایک سچائی نے کتنوں کو فائدہ پہنچایا؟۔ امیر المومنین کی حقانیت کھلی، یہودی کو دین نصیب ہوا، زرہ بھی اس کو مل گئی، اسلام کی عظمت واضح ہو گئی۔ ایک سچائی سے کتنی برکات حاصل ہوئیں؟ اور کتنے فائدے حاصل ہوئے۔ افراد کے حق میں الگ، دین کے حق میں الگ اور اسلام کی عدالت کے حق میں الگ۔

اس لئے اگر ایک حاکم عدل سے فیصلے کر رہا ہے تو درحقیقت اس نے دنیا کو سنبھال رکھا ہے۔ مگر حاکم نے نہیں اس کی دیانت داری اور عدل نے سنبھال رکھا ہے۔ اب حاکم کی طرف سے اس کا عدل ذکر اللہ ہے (اسے اللہ یاد ہے ، اسے خوف الٰہی ہے، اسے اللہ سے محبت ہے تو وہ عدل کر رہا ہے) تو بات وہی نکلی کہ اس دنیا کو اللہ اللہ کرنے والوں نے سنبھال رکھا ہے۔ اگر حاکم عدالت دیانت چھوڑ دے تو یہ سب دنیا کی تباہی کا ذریعہ بنیں گے۔

حضرت عمرؓ کا زمانہ ہے، خلافت کا دور ہے، حضرت عمرؓ کا رعب اور دبدبہ وہ ہے کہ ان کا نام سن کر تمام دنیا کے بادشاہوں کے پتے پانی ہوتے ہیں۔ ان کے زمانے میں جبلہ ابن اوھم جو روم کا بادشاہ یا گورنر تھا دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔ اسلام قبول کر کے مدینہ منورہ گیا اور پھر حج کے لئے مکہ مکرمہ چلا گیا۔ وہ طواف کر رہا تھا تو قبیلہ فزار کا ایک بدوی دیہاتی بھی طواف کر رہا تھا۔ جو لوگ حج کرنے گئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مطاف کے اندر ہجوم ہوتا ہے۔ لاکھوں آدمی ایک وقت میں طواف کر رہے ہوتے ہیں تو دھکے بھی لگتے ہیں، ٹکراؤ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن نہ تو کوئی جان بوجھ کر وہاں دھکے دیتا ہے اور نہ جان بوجھ کر کوئی کسی کو گراتا ہے۔ تو کوئی کسی سے ٹکرا جائے یا گر جائے تو کوئی برا نہیں مانتا، نہ بدلہ لیتا ہے اور نہ ہی مقابلہ کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا وہ دیہاتی بدو بھی طواف کر رہا تھا۔ جبلہ ابن اوھم بھی طواف کر رہا تھا تو جبلہ ابن اوھم کی لنگی پر اس دیہاتی کا پیر پڑ گیا اور لنگی کی گرہ کھل گئی جبلہ نے جلدی سے لنگی کو سنبھالا وہ اپنے ہاں کا بادشاہ تھا جذبات اس کے وہی تھے اس نے دیکھا کہ اس کی لنگی پر ایک دیہاتی کا پیر پڑا ہے اس نے زور سے ایک طمانچہ مارا۔ وہ دیہاتی بے چارہ چوٹ کھا کر گرا۔ اس نے جبلہ بن اوھم کو دیکھا اور پھر کھڑا ہو گیا اور طواف میں مشغول ہو گیا۔ دیہاتی نے حضرت عمرؓ کے ہاں دعویٰ کیا کہ اس نے ناحق مجھے طمانچہ مارا ہے۔ اس کی لنگی پر میں نے جان بوجھ کر پیر نہیں رکھا تھا اور وہاں کوئی وجہ بھی نہیں ہو سکتی کہ لنگی پر آدمی جان بوجھ کر پیر ڈالے گا۔ مجمع کے اندر کوئی کسی کی لنگی کھول کر تھوڑی لے جائے گا۔ اس نے کہا یہ عقل کے بھی خلاف ہے اور میں نے اس پر بدنیتی سے بھی پیر نہیں ڈالا۔ ہزاروں آدمی وہاں موجود تھے۔ دھکے مکے میں میرا پیر لگ گیا تو یہ غلطی ہو گئی مگر یہ ارادی غلطی نہیں تھی یہ مجھے تنبیہ کر سکتا تھا۔ دھول مارنے کا کونسا موقعہ تھا؟ اس کا کیا حق تھا؟ یہ دعویٰ دائر کر دیا۔

حضرت عمرؓ کی عدالت میں جبلہ بن اوھم کے نام پر سمن جاری ہوا کہ عدالت میں حاضر ہو وہ حاضر ہوا۔ آپؓ نے اس سے فرمایا "تو نے دیہاتی کو چپت کیوں ماری"؟ اس نے کہا" اس نے میری لنگی پر پیر ڈالا تھا"۔ حضرت عمرؓ نے کہا" لنگی پر پیر ضرور پڑا لیکن وہ جگہ ایسی ہے کہ وہاں ایسا ہو جاتا ہے۔ وہاں ارادے سے کوئی کسی پر پیر نہیں ڈال سکتا۔ اس لئے تم سے قصاص لیا جائے گا۔ یا تو یہ دیہاتی تمہارے بھی اتنی ہی زور سے چپت مارے جیسے تم نے اس کو ماری تھی یا پھر تم مالی طور پر اس کو کچھ ادا کرو؟ اس نے جو چوٹ کھائی ہے۔ اس کے بدلے میں کچھ مال اسے دے دو"۔ جبلہ نے کہا" ایک بادشاہ اور ایک دیہاتی برابر ہیں" ؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا" اسلام میں دونوں برابر ہیں۔ یہاں پر کوئی اونچ نیچ نہیں ہے۔ اللہ کے گھر میں ایک دیہاتی اور ایک امیر بالکل برابر ہیں۔ یہاں سب بندے ہیں۔ بندہ نواز کوئی نہیں۔ بندہ نواز تو اللہ کی ذات ہے جو ہر دم اپنے بندوں کو نوازتا رہتا ہے۔ اس عدالت میں بھی میں اور یہ دیہاتی برابر ہیں۔ بادشاہ اور فقیر ایک جیسے ہیں"۔ جبلہ کو یہ باتیں سخت ناگوار گزریں۔ اس وقت وہ خاموشی سے واپس آ گیا۔ راتوں رات بھاگ گیا۔ اسلام چھوڑ کر مرتد ہو گیا اور دوبارہ عیسائی بن گیا۔ عیسائیوں نے خوشیاں منائیں۔ اس کی بادشاہت اس کو واپس مل گئی۔ اسلام نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

مورخین لکھتے ہیں کہ ایک صحابیؓ قسطنطنیہ بلا ارادہ ہجرت، تجارت کے سلسلے میں تشریف لے گئے تو جبلہ ابن اوھم کو اس کی خبر ہوئی کہ ایک صحابیؓ آئے ہیں آخر مسلمان تو ہوا تھا۔ کچھ نہ کچھ اسلام کا دھیان اس کو تھا ہی۔ ان صحابی کو اس نے دعوت دی اور بلایا۔ صحابی دعوت پر پہنچ گئے تو اس نے کہا" آپ کو معلوم ہے میں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور ایک دیہاتی بدو کے ساتھ میرا مقدمہ ہوا تھا اور تمام باتیں ان صحابیؓ کو بتائیں اور بتایا کہ میں یہ کہہ کر چلا آیا تھا کہ ایک بادشاہ اور ایک دیہاتی برابر

نہیں ہو سکتے۔لیکن آنے کے بعد میں نے دیکھا کہ آج تک مجھے سکون نہیں ملا۔ میں ہر وقت بے سکون اور بے چین رہتا ہوں۔ سچی بات وہی تھی جو حضرت عمرؓ نے فرمائی تھی۔ میں اس پر نادم ہوں کہ میں مرتد ہوا۔ گو مجھے ظاہری بادشاہت تو مل گئی لیکن میرے دل کا سکون اور چین ختم ہو گیا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں پھر اسلام قبول کرلوں مگر چونکہ بادشاہ ہوں اس لئے اپنے وقار کو بھی قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ کوئی ایسا حیلہ ہو جائے جو میں اپنی قوم کو یہ کہہ سکوں کہ میں نے اسلام قبول کرلیا تو کیا ہوا مجھے فلاں نعمت بھی تو مل گئی اور وہ یہ کہ اگر امیر المومنین حضرت عمرؓ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کر دیں اور اس کا وعدہ دے دیں تو میں اس کو حیلہ بنا کر اسلام میں داخل ہو جاؤں گا۔ بعد میں چاہے وہ شادی کریں یا نہ کریں۔ یا میں ہی انکار کر دوں گا لیکن میرے لئے ایک بات بن جائے گی اور میں اپنی قوم سے کہوں گا کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ جیسا بادشاہ جس سے دنیا کے بادشاہ ڈرتے ہیں جب وہ اپنی بیٹی مجھے دے رہا ہے تو میری اس سلطنت سے اس کی بیٹی زیادہ عزت والی ہے۔ اس لئے میں پھر اسلام قبول کر رہا ہوں'۔

ان صحابی نے کہا کہ ''میں امیر المومنین حضرت عمرؓ کے پاس جا کر اس کا ذکر کروں گا اور پھر آپ کے پاس آ کر جواب دوں گا''۔ چنانچہ یہ واپس ہوئے اور حضرت عمرؓ کو سارا واقعہ سنایا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ''تم نے کیوں نہ وہیں وعدہ دے دیا عمرؓ کی بیٹی اسلام کے مقابلے میں کیا چیز ہے؟ اگر ایک شخص اسلام میں آئے اور عمر کی بیٹی اس کے نکاح میں چلی جائے میری بیٹی کی اسلام کے مقابلے میں کیا وقعت ہے''؟ تمہیں وعدہ کر کے آنا چاہیے تھا۔ انہوں نے کہا ''امیر المومنین میں تو ڈر رہا تھا۔ میں کیسے وعدہ کر سکتا تھا؟'' فرمایا " نہیں فوراً واپس قسطنطنیہ جاؤ اور جبلہ سے کہو کہ عمر کی بیٹی حاضر ہے تو اسلام قبول کر"۔ چنانچہ وہ واپس ہوئے لیکن جب قسطنطنیہ میں داخل ہوئے تو جبلہ ابن اُدھم کا جنازہ جا رہا تھا۔ اس کی قسمت میں اسلام قبول کرنا نہیں تھا۔ صحابی بے چارے واپس آ گئے۔

تو ایک حاکم عدالت یا امیر کرسی عدالت پر بیٹھ کر دنیا کو سنبھال رہا ہے اور امن قائم کر رہا ہے تو حاکم عدالت دنیا کو نہیں سنبھال رہا بلکہ اس کا عدل دنیا کو سنبھال رہا ہے۔ اب حاکم کی طرف سے اس کا عدل ہی ذکر اللہ ہے۔ بس دنیا کو سنبھالنے والے اللہ اللہ کرنے والے ہیں۔

سلاطین دنیا بدنوں پر اور اہل اللہ قلوب پر حکومت کرتے ہیں:- ظاہر میں یہ بے چارے اللہ اللہ کرنے والے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ کوئی مال و دولت نہیں رکھتے، کوئی لاؤ لشکر اور فوج ان کے پاس نہیں۔ مگر ان کا سب سے بڑا لشکر اور فوج اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی مقبولیت ہے۔

مولانا جامی کہتے ہیں کہ ''یہ جو اللہ اللہ کرنے والے ہوتے ہیں یہ اللہ کے عشاق ہیں یہ عاشقین خداوندی ہیں۔ انہیں حقارت سے مت دیکھو یہ بادشاہ ہیں اگرچہ ان کے سر پر تاج نہیں ہے اور لاکھوں کا پٹکا ان کے سر پر بندھا ہوا نہیں۔ یہ بے تاج بادشاہ ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ تاج والا بادشاہ بدنوں پر حکومت کرتا ہے اور یہ دلوں پر حکومت کرتے ہیں''۔

پھر یہ کہ ان کی عظمت کے لئے ان کی موجودگی ضروری نہیں ہے۔ وہ نگاہوں کے سامنے چھوڑ، دنیا میں بھی نہ ہوں پھر بھی عظمت کی جاتی ہے۔ آج حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے نام آئے تو ہمارے قلوب جھک جاتے ہیں اور ہم کہتے ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہ (اللہ ان سے راضی ہو) آج حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا نام آئے تو ہم عقیدت سے اپنی گردن جھکا لیتے ہیں اور کہتے ہیں رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اللہ ان پر اپنی رحمت نازل کرے۔

سب لوگ اللہ کے مقبول بندے تھے۔ ان کی برکات ان کے قلوب میں موجود تھیں ان کی عظمت کی وجہ سے آج تک ہماری گردن جھکی ہوئی ہے۔ تو ان کی حکومت دلوں پر ہے اور ایسی کہ وہ دنیا میں بھی نہیں۔ جب بھی حکومت قائم ہے۔

مسٹر آرنلڈ سر سید کے زمانے میں علی گڑھ یونیورسٹی کا پروفیسر تھا۔ انہوں نے ایک کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' لکھی ہے۔ اس نے اسلامی تہذیب کے دور دہرائے ہیں کہ اسلام دنیا میں کس کس طرح پھیلا؟ عرب ہندوستان چین وغیرہ میں کیسے آیا؟۔ اسلامی طور طریقے، آداب، مبلغین اسلام کی محنتیں او جانفشانیاں اور ان کی جدو جہد ان سب پر اس نے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں اس نے ایک حقیقت کو واضح کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ہندوستان میں میں نے ایک عجیب چیز دیکھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب میں اجمیر گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا ہے اور پوری ہندوستان پر حکومت کر رہا ہے۔ اس کو لوگ امیر الہند، امام الہند، سلطان الہند کے نام سے پکارتے ہیں۔ یعنی حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیر غریب نوازؒ۔

اس لئے کہ خواجہ صاحب نے ہندوستان میں آ کر اسلام کو پھیلایا، اجمیر شریف میں چھپر کی ایک کٹیا ڈال کر بیٹھ گئے۔ ہندو مسلم اور دیگر غیر مسلم ان کے دربار میں حاضر ہوتے۔ عقیدت سے بیٹھتے ان کی زبان ترجمان سے کلمات حق سنتے ان کی دیانت ان کے معاملات کی صفائی اور خدا پرستی دیکھ کر قلوب پر اثر ہوتا۔ ہزاروں آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ خود اس آرنلڈ نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ غریب نواز کے ہاتھ پر بلا واسطہ ننانوے لاکھ آدمی مسلمان ہوئے ہیں۔ ان کے خلفاء کے ہاتھ پر

جو لوگ مسلمان ہوئے ہیں ان کی تعداد الگ ہے۔تو وہ کہتا ہے کہ اجمیر میں ایک انوکھا واقعہ ہے کہ ایک شخص قبر میں لیٹا ہوا پورے ہندوستان کا سلطان بنا ہوا ہے اور سب کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔ حالانکہ خواجہ صاحب دنیا میں نہیں ہیں ۔مگر اس کے باوجود ان کی عظمت ایسی قائم ہے جیسے اگر خواجہ صاحب دنیا میں ہوتے تو ان کی عظمت اورعزت ہوتی۔ یہی بات ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اللہ والے دلوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ دلوں پر ان کی عظمت اور حکمت قائم ہوتی ہے۔آخر ان لوگوں کی عظمت ہمارے دلوں میں کیوں ہے؟ اس لئے کہ ان کے دلوں میں ذکر اللہ اور یاد خداوندی ہے۔ یادِ حق نے ان کو اللہ سے ملا دیا ہے۔خاصانِ خدا، خدا نہیں ہوتے لیکن خدا سے جدا بھی نہیں ہوتے۔ جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو اہل اللہ کا ذکر بھی آتا ہے اور جب اہل اللہ کا ذکر آتا ہے تو اللہ اور اس کے رسول خاتم النبیین ﷺ کا ذکر بھی آتا ہے۔

تو ذکر اللہ درحقیقت سب سے بڑی سلطنت ہے۔ جب یہ سلطنت آجاتی ہے تو ان لوگوں کی حکومت لوگوں کے قلوب پر قائم ہو جاتی ہے۔انبیاء کرام علیہ السلام اور اولیا عظامؒ کی محبت لوگوں کے دلوں میں ذکر اللہ ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اہل اللہ کی سلطنت کی وسعت:- حضرت بایزید بسطامیؒ اولیا اللہ میں سے ہیں۔ایک دن ان کی زبان سے ایک بڑا بھاری کلمہ نکلا وہ یہ کہ جب وجد طاری ہوا اور معرفت الٰہی کا غلبہ ان پر طاری ہوا تو زبان سے نکلا ''ملکی اعظم من ملک اللہ'' ترجمہ: ''میری سلطنت اللہ کی سلطنت سے بڑی ہے''۔تمام مرید پریشان دم بخود جب شیخ کو ہوش آیا اور آفاقہ ہوا تو انہوں نے کہا حضرت آج آپ کی زبان سے کفر کا کلمہ نکل گیا تھا۔فرمایا کفر کا کلمہ؟ انہوں نے عرض کی جی ہاں۔انہوں نے کہا کہ "تم نے مجھے اسی وقت کیوں نہ خبردار کیا؟ تم نے کیسے برداشت کیا؟ آپ ناراض ہوئے اور یہ بھی کہا کہ آئندہ کبھی میری زبان سے کوئی کفریہ کلمہ نکلے تو مجھے سزا دینا۔کفریہ کلمہ منہ سے نکالنے والا ایسا نہیں ہوتا کہ اسے معاف کیا جائے۔فوراً ہی اس کو تنبیہ کی جائے اور اس کی خبر لی جائے''۔

شیخ پر دو چار دن کے بعد پھر غلبہ حق ہوا۔ پھر وجد میں آئے، پھر وہی کلمہ منہ سے نکلا ''مُلکی اعظم من ملک اللہ'' مریدین کے لئے شیخ کا حکم تھا۔انہوں نے شیخ کے کہنے کے مطابق گھر میں رکھا ہوا کوڑا اٹھایا اور اس کو شیخ پر مارا (منشاء شیخ کو ہوش میں لانا تھا) لیکن وہ کوڑا دوبارہ مارنے والے کی طرف پلٹا اور اس کی اپنی پیٹھ پر پڑا۔اس کے بعد دوسرے مرید نے اٹھایا۔ ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔ یہ بیچارے مرتے کیا نہ کرتے شیخ کا حکم بجالانے کے لیے کوڑا اٹھاتے اور کوڑا ان کی پیٹھ پر پڑتا۔ کچھ ہی دیر میں یہ سب تھک گئے اتنے میں شیخ کو ہوش آ گیا۔تو سب کو تکلیف میں پایا۔وجہ معلوم کی تو انہوں نے بتایا کہ ہمارے ساتھ یہ ہوا ہے۔شیخ نے پھر پوچھا مجھے یہ تو بتاؤ کہ وہ کلمہ کیا تھا؟۔مریدوں نے بتایا کہ آپ نے کہا تھا ''ملکی اعظم من ملک اللہ'' میرا ملک اللہ کے ملک سے بڑا ہے۔

شیخ نے کہا بیوقوفو، نامعقولو یہ کلمہ کفر کا کلمہ کہاں ہے؟ یہ تو عین توحید کا کلمہ ہے۔انہوں نے کہا حضرت یہ کیسے ایمان کا کلمہ ہے؟ فرمایا اس کا مطلب سمجھ لو۔یہ بتاؤ کہ اللہ کا ملک کیا ہے؟ اور وہ کہاں ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا اللہ کا ملک ہے یہ زمین، یہ آسمان، یہ پہاڑ، یہ سورج، چاند، تارے میں ہوں۔تم ہو یہ سب اللہ کا ملک ہے اور میرا ملک کیا ہے؟ میرا ملک کہاں ہے؟ میرا ملک ہے اللہ۔اس کی ذات اس کی صفات، میں اسی میں گھیرا رہتا ہوں تو میرا ملک اللہ کی ذات اور اللہ کا ملک میری ذات۔اب بتاؤ کہ میرا ملک بڑا ہے یا اللہ کا ملک؟

تو بظاہر یہ کلمہ کفر تھا مگر شیخ نے بتایا کہ یہ تو عین ایمان کا کلمہ ہے تو میرا ملک اللہ کی ذات ہے تو ملک میرا بڑا رہا۔جس کو وہ ملک ہاتھ آجائے وہ تو اس پورے جہان کی پرواہ نہیں کرے گا۔اب دیکھئے نماز ذکر اللہ ہے۔اب اگر نماز پڑھنے کے باوجود انسان فحش اور برائی سے نہیں بچتا تو نماز کا صرف ڈھانچہ قائم ہے اور نماز کے اندر جو ذکر ہے اس کی روح ہے۔روح ہوتی تو نماز جاندار ہوتی تو یقیناً جاندار نماز ہر برائی سے بچاتی ہے۔نماز عظمت خداوندی ہے اور یادِ حق ہے کہ دل اللہ تعالیٰ کی یاد میں غرق رہے دوسری چیزیں دل سے فنا ہو جائیں تو یاد جتنی زیادہ ہوگی اتنا ہی زیادہ بے حیائی سے بچے گا۔ یاد نہیں ہوگی تو چاہے پانچوں وقت نماز پڑھے جب بھی نہیں بچے گا۔لیکن روح نہ ہونے کی وجہ سے محض صورت عمل کو ترک نہ کیا جائے۔یعنی حاضری اور وقت پر حاضری ضروری رکھی جائے۔حضوری کے لئے دعا کرتے رہیں۔ یہ بھی اللہ کے فضل وکرم سے کسی نہ کسی وقت نصیب ہو ہی جائے گی---ذکر یعنی اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز ہے-

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں تیرا نام رہے
کیا یہ ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

****

فضائل ذکر الٰہی (حصہ دوم)

حدیث قدسی ہے (حدیث قدسی اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں آپ خاتم النبیین ﷺ اللہ تعالیٰ کے کسی قول یا فعل کو روایت کریں) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں جیسا وہ میرے متعلق گمان رکھتا ہے میں ویسا ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ اپنے دل میں (تنہائی میں) میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی اپنی تنہائی میں اسے یاد کرتا ہوں اور اگر وہ کسی مجمع میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی ان کے مجمع میں (فرشتوں کے مجمع میں) اس کا ذکر کرتا ہوں''۔ (مسلم، بخاری، ترمذی، نسائی)

1- قرآن پاک سورہ العنکبوت، آیت نمبر 45 میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: "کوئی چیز (عمل خیر) اللہ کے ذکر سے افضل نہیں ہے"۔

2- قرآن پاک، سورہ طٰہٰ، آیت نمبر 14 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''نماز قائم کرو میرے ذکر کے لیے''۔

3- قرآن پاک، سورہ الاحزاب، آیت نمبر 41 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **یٰاَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا**

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرو''۔

4- قرآن پاک، سورہ البقرہ، آیت نمبر 152 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ترجمہ: ''تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کروں گا''۔

<u>احادیث مبارکہ میں ذکر کی اہمیت وفضیلت:</u>

1- ایک حدیث میں آیا ہے کہ: ''رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے بتلایا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے (اس پر مامور ہیں کہ راستوں میں گھوم پھر کر اللہ کا ذکر کرنے والوں کو تلاش کریں۔ پس وہ کسی جماعت کو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے پاتے ہیں تو آپس میں ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں کہ آؤ اپنے مقصود (ذکر اللہ) کی طرف آجاؤ۔ تو وہ سب فرشتے مل کر آسمان تک ان ذکر کرنے والوں کو اپنے بازوؤں کے سائے میں لے لیتے ہیں"۔ (مسلم، بخاری)

2- حدیث: حضور اقدس خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ دنیا میں نرم نرم بستروں پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ جنت کے اعلیٰ درجوں تک انہیں پہنچا دیتا ہے"۔ (مسلم، ترمذی)

3- حدیث: حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے اور جو نہیں کرتا ان دونوں کی مثال زندہ اور مردے کی سی ہے کہ ذکر کرنے والا زندہ ہے اور ذکر نہ کرنے والا مردہ ہے"۔ (مسلم، بخاری، بیہقی)

4- حدیث: حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "اگر ایک شخص کے پاس بہت سے روپے ہیں اور وہ ان کو تقسیم کر رہا ہے اور دوسرا شخص اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہے تو ذکر کرنے والا افضل ہے"۔ (طبرانی)

5- حدیث: حضور اقدس خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "جنت میں جانے کے بعد اہل جنت کو دنیا کی کسی چیز کا بھی قلق اور افسوس نہ ہوگا سوائے اس گھڑی کہ جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر گزر گئی ہوگی"۔ (طبرانی، بیہقی)

6- حدیث: حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "جو لوگ بھی اللہ کے ذکر کے لیے جمع ہوتے ہیں اور ان کا مقصد صرف اللہ کی رضا ہوتا ہے تو آسمان سے ایک فرشتہ ندا کرتا ہے کہ تم لوگ بخش دیئے گئے اور تمہاری برائیاں نیکیوں سے بدل دی گئیں ہیں"۔ (طبرانی، احمد، بیہقی)

7- حدیث: نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد ہے "اللہ کے ذکر سے بڑھ کر کسی آدمی کا کوئی عمل عذاب قبر سے زیادہ نجات دینے والا نہیں ہے"۔ (طبرانی، ترمذی)

8- حدیث: حضرت زیدؓ ارشاد فرماتے ہیں نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد ہے ''مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تم ڈر اور خوف کی وجہ سے مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے ورنہ میں اس کی دعا کرتا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی عذاب قبر دکھا دے''۔ (السلسلۃ الصحیحۃ)

9- حدیث: حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد ہے "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ بعض قوموں کا حشر اس طرح فرمائیں گے کہ ان کے چہروں پر نور چمکتا ہوا ہوگا وہ موتیوں کے ممبروں پر ہوں گے۔ لوگ ان پر رشک کرتے ہوں گے وہ انبیاء اور شہداء نہیں ہوں گے"۔ کسی نے عرض کیا "یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ آپ خاتم النبیین ﷺ ان کا حال بیان کر دیجئے تا کہ ہم ان کو پہچان لیں"۔ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی محبت میں مختلف جگہوں اور مختلف

خاندانوں سے آ کر ایک جگہ جمع ہوں گے اور اللہ کے ذکر میں مشغول ہوں گے‘‘۔(طبرانی)

10- حدیث : حدیث میں ہے "جنت میں یاقوت کے ستون ہوں گے جن پر زمرد (زبرجد) کے بالا خانے ہوں گے۔ان میں چاروں طرف دروازے کھلے ہوئے ہوں گے وہ ایسے چمکتے ہوں گے جیسے کوئی روشن ستارہ چمکتا ہے۔ان بالا خانوں میں وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ ہی کے واسطے ایک جگہ اکٹھے ہوں اور وہ لوگ جو اللہ ہی کے واسطے آپس میں ملتے جلتے ہوں"۔(جامع صغیر،بیہقی)

11- حدیث : حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "جب جنت کے باغوں پر گزرو تو خوب چرو"، کسی نے عرض کیا "یارسول اللہ جنت کے باغ کیا ہیں"؟ارشاد فرمایا" ذکر کے حلقے"۔(ترمذی،بیہقی)

12- حدیث : حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا "جو تم میں سے عاجز ہو راتوں کو محنت کرنے سے اور بخل کی وجہ سے مال بھی خرچ نہ کیا جاتا ہو اور بزدلی کی وجہ سے جہاد میں بھی شرکت نہ کر سکتا ہو اس کو چاہیے کہ اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کرے"۔(طبرانی،بیہقی)

13- حدیث : حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد ہے "اللہ تعالیٰ کا ذکر اس قدر کثرت سے کیا کرو کہ لوگ تمہیں مجنون کہنے لگیں"۔(ابن حبان،حاکم)

14- حدیث : ایک حدیث میں ہے "(ذکر اللہ) سے غافل لوگوں میں اللہ کا ذکر کرنے والا اس مجاہد کی مانند ہے جو (میدان جنگ سے) بھاگنے والوں (کی جماعت) میں ثابت قدم رہا"۔(مشکوۃ المصابیح)

15- حدیث : ایک حدیث میں ہے "ذاکرین ہنستے ہوئے جنت میں جائیں گے"۔(صحیح ابن حبان)

حضرت عثمانؓ جب کسی قبر پر تشریف لے جاتے تو اس قدر روتے تھے کہ داڑھی مبارک تر ہو جاتی تھی۔کسی نے آپؓ سے پوچھا کہ آپ جنت اور دوزخ کے ذکر سے ایسا نہیں روتے جتنا کہ قبر کے سامنے آجانے پر روتے ہیں؟۔آپؓ نے ارشاد فرمایا "قبر آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے۔جو شخص اس سے نجات پالے، بعد کی تمام منزلیں اس پر سہل ہو جاتیں ہیں اور جو اس سے نجات نہ پائے بعد کی تمام منزلیں دشوار ہوتی چلی جاتی ہیں"۔پھر آپؓ نے حضور اقدس خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد سنایا حضور پاک خاتم النبیین ﷺ یہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ ’’کوئی منظر قبر سے زیادہ گھبراہٹ والا نہیں ہے‘‘۔حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ’’ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ ہر نماز کے بعد عذاب قبر سے پناہ مانگا کرتے تھے‘‘۔(بیہقی)

16- حدیث : حضور پاک خاتم النبیین ﷺ ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے پاس تشریف لے گئے اور دریافت فرمایا "کس بات نے تم کو یہاں بٹھایا ہے"؟عرض کیا "یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہے ہیں اور اس بات پر اس کی حمد وثنا کر رہے ہیں کہ اس نے ہم لوگوں کو اسلام کی دولت سے نوازا یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی احسان ہم پر ہے"۔حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "اللہ کی قسم کیا صرف اسی وجہ سے بیٹھے ہو"،صحابہ کرامؓ نے عرض کیا "اللہ تعالیٰ کی قسم صرف اسی وجہ سے بیٹھے ہیں"۔حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "کسی بدگمانی کی وجہ سے میں نے تم لوگوں کو قسم نہیں دی بلکہ جرائیل ابھی ابھی میرے پاس آئے تھے اور مجھے یہ خبر سنا گئے کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کی وجہ سے ملائکہ پر فخر فرمارہے ہیں"۔(مسلم،احمد،ترمذی،نسائی)

17- حدیث : ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:’’کیا میں تمہیں وہ عمل نہ بتاؤں؟ جو تمہارے اعمال میں سب سے بہتر اور تمہارے پروردگار کے نزدیک سب سے زیادہ پاکیزہ اور تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا اور سونے چاندی کے (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) خرچ کرنے سے بہتر ہے۔اور اس سے بھی بہتر ہے کہ تم اپنے دشمن سے (میدان جہاد میں) مقابلہ کرو اور پھر تم ان کی گردنیں کاٹو۔اور وہ تمہاری گردنیں کاٹیں"؟صحابہؓ نے عرض کیا "کیوں نہیں یا رسول اللہ ضرور بتلایئے" آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "وہ عمل اللہ کا ذکر کرنا ہے‘‘۔(ترمذی،ابن ماجہ،بیہقی)

18- حدیث: حضور اقدس خاتم النبیین ﷺ دولت کدہ میں تھے کہ آیت:(سورہ الکھف،آیت نمبر 28)

واصبر نفسک مع الّذین یدعون ربھم بالغدوۃ والعشی

نازل ہوئی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ’’اپنے آپ کو ان لوگوں کے پاس بیٹھنے کا پابند کیجئے جو صبح شام اپنے رب کو پکارتے ہیں‘‘۔

حضور اقدس خاتم النبیین ﷺ اس آیت کے نازل ہونے پر لوگوں کی تلاش میں نکلے۔ایک جماعت کو دیکھا کہ اللہ کے ذکر میں مشغول ہے۔بعض لوگ ان میں بکھرے ہوئے بالوں والے اور خشک کھالوں والے اور صرف ایک کپڑے والے ہیں (کہ ننگے بدن ایک لنگی صرف ان کے پاس ہے) جب حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے

ان کو دیکھا تو ان کے پاس بیٹھ گئے اور ارشاد فرمایا" تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا فرمائے کہ خود مجھے ان کے پاس بیٹھنے کا حکم ہے"۔(طبرانی)

19- حدیث: حضرت سیدنا ابوایوب انصاریؓ سے مروی ہے کہ:

''جو شخص صبح کی نماز کے بعد اُسی ہیت سے بیٹھے ہوئے بولنے سے قبل یہ دعا دس مرتبہ پڑھے گا

لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد یحی ویمیت وھو علی کل شی قدیرہ

ترجمہ:''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں کہ وہ اپنی ذات اور صفات میں اکیلا ہے کوئی اس کا شریک نہیں سارا ملک دنیا اور آخرت اس کا ہے جتنی خوبیاں ہیں وہ اسی پاک ذات کے لیے ہیں وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہی ہر چیز پر قادر ہے"۔

تو اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جائیں گی دس برائیاں معاف فرما دی جائیں گی اور جنت میں دس درجے بلند کئے جائیں گے اور تمام دن شیطان اور مکروہات سے محفوظ رہے گا"۔(مسند احمد)

20- حدیث: رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" جو کسی جگہ بیٹھے اور اس میں وہ اللہ کا ذکر نہ کرے، تو یہ بیٹھک اللہ کی طرف سے اس کے لیے باعث حسرت ونقصان ہوگی اور جو کسی جگہ لیٹے اور اس میں اللہ کو یاد نہ کرے تو یہ لیٹنا اس کے لیے اللہ کی طرف سے باعث حسرت ونقصان ہوگا"۔(سنن ابی داوٗد)

21- حدیث: ایک اور حدیث میں ہے کہ "جو کوئی جماعت کسی بھی مجلس میں جمع ہوئی اور اللہ کا ذکر کئے بغیر وہاں سے منتشر ہوگئی تو ان کی یہ مجلس قیامت کے دن ان کے لیے بڑی حسرت اور افسوس کا باعث ہوگی"۔(السلسۃ الصحیحۃ)

22- حدیث: ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ سے دریافت کیا گیا" روز قیامت کون لوگ اللہ کے ہاں فضیلت ورفعت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوں گے "؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:''کثرت سے اللہ کا ذکر کرنے والے مرد اور کثرت سے ذکر کرنے والی عورتیں۔'' عرض کیا گیا" اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ! اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے سے بھی افضل"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:''اگر چہ وہ کفار ومشرکین سے اس قدر تلوار کے ساتھ لڑائی کرے کہ وہ تلوار ٹوٹ جائے اور وہ خون سے رنگین ہو جائے تب بھی اللہ کا ذکر کرنے والا اس سے درجہ میں افضل ہے۔''(مشکوۃ المصابیح)

حافظ ابن حجرؒ نے منبہات میں لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ سے قرآن پاک کے ارشاد **وکان تحتہ کنز لھما** (سورہ الکھف، آیت نمبر 82) کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: کہ وہ سونے کی ایک تختی تھی جس پر سات سطریں لکھیں ہوئیں تھیں جن کا ترجمہ یہ ہے۔

1۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو موت کو جانتا ہے پھر بھی ہنسے۔
2۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو جانتا ہے کہ دنیا آخر ایک دن ختم ہونے والی ہے پھر بھی اس میں رغبت کرے۔
3۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو جانتا ہے کہ ہر چیز مقدر سے ہے پھر بھی کسی چیز کے جاتے رہنے پر افسوس کرے۔
4۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جس کو آخرت میں حساب کا یقین ہو پھر بھی مال جمع کرے۔
5۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جس کو جہنم کی آگ کا علم ہو پھر بھی گناہ کرے۔
6۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو اللہ تعالیٰ کو جانتا ہو اور پھر کسی اور چیز کا ذکر کرے۔
7۔ مجھے تعجب ہے اس شخص پر جس کو جنت کی خبر ہو پھر بھی دنیا کی کسی چیز سے راحت پائے۔

بعض نسخوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ

مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو شیطان کو دشمن سمجھے پھر بھی اس کی اطاعت کرے۔ حافظؒ ابن حجر نے حضرت جابرؓ سے حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد بھی نقل کیا ہے ''حضرت جبرائیلؑ مجھے اللہ کے ذکر کی تاکید اس قدر کرتے رہے کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ بغیر ذکر کے کوئی چیز نفع نہ دے گی۔''(فضائل اعمال-مولانا محمد زکریا)

کلمہ طیبہ افضل الذکر ہے----اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنا ذکر، شکر اور فکر کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)۔

****

قرب الٰہی

قرب الٰہی کی منزل کو پا لینا ناممکن نہیں، دشوار بھی نہیں بس محنت طلب ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس منزل کو پا لینے کے آسان ترین راستوں کی طرف ہماری راہنمائی فرمادی ہے جس میں نہ محنت نہ مشقت نہ ریاضت نہ مجاہدہ یہ ''ذکر اللہ ہے'' اس کے بعد بہت سے راستے ہیں۔ سورۃ العلق، آیت نمبر 19 میں اللہ تعالیٰ اپنے قریب آنے کا راستہ بھی بتاتا ہے: ترجمہ: ''سجدہ کرو اور اپنے رب کے قریب ہو جاؤ''۔

جب قرب الٰہی ہر ایک لئے ضروری ہو تو یہ بھی ضروری ہوا کہ اس کا حصول ہر ایک کے بس میں ہو اس کا راستہ آسان ہو کہ یہ دین آسان ہے۔اس کے حصول کا آسان راستہ، اتباع رسول خاتم النبیین ﷺ ہے۔قرآن پاک ہمارے پاس علمی شکل میں اور تفسیر قرآن عملی شکل میں موجود ہے۔آپ خاتم النبیین ﷺ قرآن پاک کی عملی تفسیر ہیں۔یعنی اللہ تعالیٰ کے رسول کے پیچھے پیچھے چلنا جو آپ خاتم النبیین ﷺ نے کیا ہے جس طرح کیا ہے اسی طرح اُسی درجے میں ادا کرنا۔اس طرح کرنے اور اپنی زندگی کو سنت رسول خاتم النبیین ﷺ کے طریقے پر گزارنے کی کوشش میں لگے رہنا یہ ہے قرب الٰہی کا آسان راستہ۔قرآن پاک سورہ آل عمران، آیت نمبر 31 میں فرمان الٰہی ہے: ترجمہ: ''اگر تم اللہ کی محبت رکھتے ہو تو میری راہ پر چلو۔اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کردے گا''۔

باوجود یہ کہ شاہی اعلان (فرمان الٰہی) ہو چکا ہے کہ فلاں بن فلاں کو ہم نے اپنا وزیر اعظم مقرر کردیا ہے وہ ہمارے قانون سے باہر کوئی حکم نہیں کرتا۔جس نے اس کے حکم واحکامات کو تسلیم نہ کیا اس نے بادشاہ کے حکم کو تسلیم نہ کیا۔بادشاہ کی خوشنودی رعایا کے لیے وزیر اعظم اور اس کے کل عملے کے احکامات تسلیم کرنے پر موقوف ہے۔اگر کوئی وزیر اعظم یا اس کے عملے کے احکامات تسلیم نہ کرے تو وہ موجب سزا ہوگا۔خواص وعوام کی بہبود وزیر اعظم کے فرمان کے مطابق عمل کرنے پر موقوف ہے۔

سورہ آل عمران، آیت نمبر 31 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اے پیغمبر لوگوں سے کہہ دو اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا اور وہ تمہارے گناہ، معاف کردے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔

پس حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی پیروی کرنا اللہ تعالیٰ کی دوستی کا مکمل ثبوت ہے۔

پھر سورۃ النور، آیت 56 میں فرمایا: ترجمہ: ''نماز پڑھتے رہو، زکوٰۃ دیتے رہو اور پیغمبر خدا کے فرمان پر چلتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے''۔

معلوم ہوا کہ خدا کی رحمت کا نزول صرف اور صرف پیغمبر خدا کے فرمان پر چلنے پر موقوف ہے۔قرآن پاک میں سورہ توبہ کی آیت نمبر 128 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ترجمہ: ''لوگو تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں، تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں، تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے۔مومنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں''۔

سورہ نور، آیت نمبر 63 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ترجمہ: ''جو لوگ رسول (خاتم النبیین ﷺ) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو ڈرنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ ان پر کوئی آفت آپڑے یا تکلیف دینے والا عذاب نازل ہوجائے۔''

قرب الٰہی کا بہترین طریقہ:-

سورہ آل عمران، آیت نمبر 104 میں اللہ تعالیٰ مومنوں کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ ''تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے۔پھر فرمایا کہ یہی لوگ فلاح اور نجات پانے والے ہیں''۔

پس ایک جماعت کثیر صحابہ کرامؓ نے بعد وصال رسول خاتم النبیین ﷺ کے اس فریضہ کو ادا کیا۔جمع قرآن اور زیر زبر پیش کا لگانا، صحابہ کرامؓ اور تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں ہوا۔عشق رسول خاتم النبیین ﷺ میں قرآن مجید اور احادیث شریفہ کو خود بھی پڑھا اور دوسروں کو بھی پڑھایا۔اپنے ملک اور دوسرے ملکوں میں تبلیغ کی جس سے کوئی گوشہ دنیا کا باقی نہ رہا۔حضرات ائمہ کرام نے قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں مسائل دینی کو مخلوق خدا کے سامنے پیش کیا۔جس سے لاتعداد لوگوں کو آج تک نفع پہنچ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید سورۃ التوبہ، آیت 119 میں ارشاد فرماتے ہیں: ترجمہ: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو۔''

یہاں پر سچوں سے مراد صدیقین، شہدا، صالحین جیسے حضرات آئمہ شریعت و آئمہ طریقت ہیں۔ جنہوں نے لوگوں کو شریعت وطریقت سے آراستہ کر کے محمد خاتم النبیین ﷺ کے سیدھے راستے سے اللہ تک پہنچایا۔ جن کے حالات کلام اللہ اور کلام رسول خاتم النبیین ﷺ کے مطابق ہیں اور ان کی زیارت ان کی محبت اور ان کی صحبت موجب نجات ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ حم السجدہ، آیت نمبر 33 میں فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''اس شخص سے بات کا اچھا کون ہوسکتا ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے، نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں''۔

سورہ النساء، آیت نمبر 14 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''جو خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدوں سے نکل جائے گا اس کو اللہ دوزخ میں ڈالے گا۔ جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو ذلت کا عذاب ہوگا"۔

احادیث رسول خاتم النبیین ﷺ سے انکار کرنا اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری سے انکار کرنا ہے۔ یہی شیطان کے باطنی زہریلے اثرات ہیں جو فوراً سمجھ میں نہیں آتے۔

اسلامی تعلیمات میں جنت کے دو درجات بیان کئے گئے ہیں:- **1۔ عام جنتی** **2۔ مقربین**

اس دوسرے درجے یعنی **مقربین** کے درجے کو حاصل کرنے کے لئے **نزول قرآن کے وقت** اپنے مال و جان سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کر کے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کی شرط لگائی گئی تھی۔ سورۃ النساء آیت نمبر 95 میں ارشاد خداوندی ہے:

ترجمہ:- ''اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مومن اور بغیر عذر سے بیٹھے رہنے والے مومن برابر نہیں''۔ اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اللہ نے درجوں میں بہت فضیلت دے رکھی ہے۔ یوں تو اللہ نے ہر ایک کو خوبی اور اچھائی کا وعدہ دیا ہے۔ لیکن مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر بہت بڑے اجر کی فضیلت دے رکھی ہے۔ چنانچہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ اور تابعین کے دور میں مسلمانوں نے اپنے مال و جان اللہ تعالیٰ کی راہ میں دیئے اور پھر مقربین کے درجے پر پہنچے۔ اس لیے کہ اس دور میں پروردگار عالم کا یہ قرب اور اس کے حضور بلند مقام کا حاصل کر لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کسی عام آدمی کے لیے ممکن ہی نہ تھا کہ وہ معمول کی زندگی گزارتے ہوئے اس قرب کا تصور بھی کر سکتا۔

ختم نبوت اور مسلمانوں کے سیاسی زوال کے بعد انسانی تاریخ میں غالباً دور جدید کا زمانہ وہ واحد زمانہ ہے جب اللہ تعالیٰ کے قرب اور جنت کے اعلیٰ ترین درجات کے حصول کے لیے سخت ترین قربانیوں کی شرائط اٹھالی گئی ہیں۔ دور جدید میں اسلام کی اصل دعوت اس طرح اجنبی ہو چکی ہے۔ جس طرح زمانہ نبوت کے آغاز پر تھی۔ اُس دور میں اسلام قبول کر کے دین کی دعوت کا ایک حصّہ بننے کا مطلب بدترین ظلم و ستم کو دعوت دینا اور جان و مال کی قربانی کے ساتھ میدان میں اترنا تھا۔ **مگر آج کے دور میں جو شخص اللہ تعالیٰ کو اپنی اولین ترجیح اور دین کی اصل دعوت (تبلیغ) عام کرنے کو اپنا مشن بنالے تو وہ بلاشبہ مقربین کے مقام کا حقدار ہو جائے گا۔** جبکہ بدلے میں اس کو اس طرح کی قربانیاں بھی نہیں پیش کرنی پڑیں گی۔ جس طرح کی قربانی اگلے لوگوں کو دینی ہوتی تھیں۔

چنانچہ آج کے مسلمان کو میدان جنگ میں دشمنوں سے لڑنے کے بجائے صرف اپنے تعصّبات اور اپنی خواہشات سے لڑنا ہوگا۔ اسے ہر مسلکی تعصب سے بلند ہو کر قرآن پاک کی دعوت کو قبول کرنا اور اپنی خواہشات کو محدود کر کے اس دعوت کو دوسروں تک پہنچانا ہوگا۔

اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ اپنی رسالت کی پوری زندگی میں جو کام کرنے میں لگے رہے وہ ہے اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا، اور ان کو اللہ کی طرف بلانا۔ عوام الناس کو اللہ کی طرف اور اس کی راہ میں جدوجہد کے لئے پکارنا اور جمع کرنا اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چلنا یہ رسول خاتم النبیین ﷺ کی راہ ہے۔ یہی قرب الٰہی کے حصول کا سبب ہے یعنی راستہ ہے۔ اس کام کو نہ ترک کیا جاسکتا ہے نہ موخر کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس سے غفلت برتی جاسکتی ہے۔

اس کام کو صحیح طور پر انجام دینے کے لئے ضروری ہے کہ راہ رسول خاتم النبیین ﷺ پر چلنے والا مخلوق خدا کی طرف توجہ اور ان کی مشغولیت میں خود اپنی ذات کی طرف توجہ اور اس کام کے لئے زاد راہ جمع کرنے سے غافل نہ ہو اور دوسروں کو پکارنے میں خود اپنے نفس کو پکارنا نہ بھول جائے۔

عام مخلوق خدا کی ہدایت بڑی بھاری ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ ایک پر خار راہ ہے اس ہدایت کو ''قول ثقیل'' کہا گیا ہے اور اس کام کو ایک کمر توڑ دینے والا بھاری بوجھ کہا گیا ہے۔

مخلوق کی ہدایت کا کام اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو سونپا تھا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ آخری نبی ہیں۔ کسی نبی کی امت کو (یہ لوگوں کی ہدایت کا کام) یہ کام نہیں سونپا گیا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی آمد پر تکمیل نبوت ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے یہ کام امر بالمعروف ونہی عن المنکر امت کے سپرد کر دیا۔ اتنی بڑی ہستی یعنی اللہ تعالیٰ نے جب یہ کام نبی خاتم النبیین ﷺ کی امت کو سونپا تو ضروری ہوا کہ اس امت میں یہ بوجھ اٹھانے کی ہمت بھی ہوگی اور صلاحیت بھی۔

سورہ بقرہ، آیت نمبر 286 ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کسی نفس پر اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جتنی اس کو اس بوجھ کے اٹھانے کی طاقت دی ہے۔''

اب اس کام (کار رسالت خاتم النبیین ﷺ) کو صحیح طور سے انجام دینے کے لئے زادِراہ کیا ہے؟ سب سے بڑھ کر جس کے بغیر یہ کام ہو ہی نہیں سکتا وہ ہے سب سے کٹ کر صرف اللہ کا ہو رہنا۔ اس کا مطلب گوشہ نشین ہو جانا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب ''دنیا میں رہ اور دنیا میں نہ رہ''، یعنی دنیا کو بقدرِ ضرورت ہاتھ میں رکھ اور اللہ کا ہو جا- پھر اخلاص کے ساتھ بلند سے بلند مقام کی آرزو کو اپنا مطلوب بنالیں اور رسول پاک خاتم النبیین ﷺ کی طرح دعوت کے کام کے ساتھ ساتھ ان اعمال کو بھی بجا لائیں جو اس مقام کے حصول کا ذریعہ ہوں۔

(سورۃ البینۃ، آیت نمبر 5) ترجمہ: ''اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ اللہ کی بندگی کریں اور اپنے دین کو اس کے لئے خالص کر کے بالکل یکسو ہو جائیں''۔

ہر وہ کوشش جو کلمۃ اللہ کو بلند کرنے کے لئے کی جائے جہاد ہے۔ ترجمہ: ''اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے''۔ (سورۃ الحج، آیت نمبر 78)

یہ حکم دیا تو ساتھ ہی معنوی و روحانی ساز و سامان کا بیان بھی کر دیا: ترجمہ: ''پس نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ دو اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو''۔ (سورۃ الحج، آیت نمبر 78)

دعوت و جہاد کی راہ اس زادِراہ کے بغیر طے نہیں ہو سکتی جس کو اللہ تعالیٰ نے اتنی تاکید کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کو ہر لمحہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ دین اسلام کے جھنڈے تلے آ جائیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ دن رات دعوت کا کام کرتے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کاروبار، حکومت، صلح و جنگ، تعلیم و تزکیہ اور عام انسانی روابط اور تعلقات جیسے کاموں میں مشغول رہتے لیکن اس کے ساتھ ساتھ راتوں کو اللہ کی عبادت کے لئے کھڑے رہتے توبہ و استغفار کرتے، ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے اور دن رات پوری یکسوئی اور قلب کے پورے انہماک کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہا کرتے تھے۔

بے شک آپ خاتم النبیین ﷺ کی طرح کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو بھی کسی نہ کسی درجہ میں دعوت عام اور ہر وہ کوشش جو کلمۃ اللہ کو بلند کرنے کے لئے کی جائے۔ وہی کام کرنا چاہتا ہو جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے واسطے سے امت مسلمہ کے سپرد کیا ہے۔ وہ بھی آپ خاتم النبیین ﷺ کی طرح ان تمام ہدایت الٰہی کا مخاطب ہے اور آپ خاتم النبیین ﷺ سے کہیں زیادہ اس زادِراہ اور ساز و سامان کا محتاج ہے۔ اس کو ہر وقت ہدایت قرآنی اور آپ خاتم النبیین ﷺ کے اسوۂ حسنیٰ کی کوشش میں لگا رہنا چاہئے کہ اس کے بغیر اس پرخطر راہ پر نہ چل سکے گا اور نہ قائم رہ سکے گا۔

اللہ تعالیٰ سورہ النحل، آیت نمبر 119 میں ارشاد فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''پھر جن لوگوں نے نادانی سے برا کام کیا پھر اس کے بعد توبہ کی اور نیکوکار ہو گئے تو پروردگار ان کی توبہ قبول فرمائے گا اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے''

جہاں تک توبہ کا تعلق ہے تو شیطان جب راندہ گیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کو چیلنج کیا کہ: (سورہ الاعراف، آیت نمبر 17)

ترجمہ: ''میں تیرے ان بندوں کو کچھ کو آگے سے پکڑوں گا، کچھ کو پیچھے سے، کچھ کو دائیں سے پکڑوں گا، کچھ کو بائیں سے اور تو ان میں سے بہتوں کو نافرمان پائے گا''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (سورہ الحجر، آیت نمبر 42-41)

ترجمہ: ''فرمایا یہ راستہ سیدھا میری طرف آتا ہے، بیشک میرے بندوں پر تیرا کچھ قابو نہیں سوا ان گمراہوں کے جو تیرا ساتھ دیں۔''

ابلیس کا ایک لشکر صحابہ کرامؓ کے زمانے میں اپنے سروں پر راکھ ڈالتا ہوا ابلیس کے پاس آیا، ابلیس نے پوچھا" کیا ہوا"؟ کہا" ان لوگوں پر (صحابہ کرامؓ) پر ہمارا کوئی وار ہی نہیں چلتا"۔ ابلیس نے جواب دیا" کوئی بات نہیں آئندہ ایسے لوگ آئیں گے جن پر تمہارا وار خوب چلے گا"۔ پھر یہی لشکر تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں ابلیس کے پاس آیا اور کہا" ہم ان لوگوں سے کچھ سستی اعمال میں کروا لیتے ہیں یعنی ان لوگوں پر ہمارا وار چل جاتا ہے۔ لیکن پھر یہ لوگ اپنے اعمال پر نادم (غفلت پر) ہو کر اتنا روتے اور توبہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اجر کو دگنا کر دیتا ہے"۔ ابلیس نے کہا" کوئی بات نہیں آئندہ ایسے لوگ آئیں گے جو تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈا کریں گے وہ گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھیں گے اور جب گناہ کو گناہ نہیں سمجھیں گے تو توبہ نہیں کریں گے اور توبہ نہیں کریں گے، تو بغیر توبہ کئے مر جائیں گے اور جہنم کے مستحق ہوں گے"۔

تو اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ لوگ گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ من چاہی زندگی گزارتے ہیں۔ رب چاہی زندگی کو بھلا دیا۔ اپنی مرضی سے اوقات کار بنالیے رب کے بنائے ہوئے اوقات کار بھول گئے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی رضا کی کسی کو پرواہ ہی نہیں رہی۔ یاد رہے کہ "ایمان لانا کمال کی بات نہیں، ایمان رکھنا بھی کمال کی بات نہیں، اس دنیا سے ایمان لے جانا کمال کی بات ہے۔ یعنی کمال کی بات خاتمہ بخیر ہونا، یعنی ایمان کو سلامتی کے ساتھ لے جانا ہے"۔

قرآن پاک میں سورہ یونس، آیت نمبر 103 میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

ترجمہ:''ہم اپنے پیغمبروں کواور مومنوں کونجات دیتے رہے ہیں اس طرح ہمارا ذمہ ہے کہ ہم مومنوں کونجات دیں گے''۔

لیکن کون سے مومن؟ فرض قرض ہے۔ہم مومن ہونے کے دعوے دار ہیں،عمر بھر میں ایک مرتبہ حج فرض ہے وہ بھی ادانہیں کر پاتے ،ایک سال میں ایک ماہ کے روزے فرض ہیں،کسی کے ایک ماہ میں تین ، پانچ ،اورسات روزے رہ گئے وہ بھی عمر بھر پورے نہیں کئے گئے-بارہ برس کی عمر سے نماز فرض ہے وہ بھی پوری نہیں۔ سجدہ تلاوت قرآن پاک کاادا کرنا فرض ہے وہ بھی ادانہیں کئے تو اتنے بہت سے قرض کے ساتھ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم مومن ہیں۔دنیا میں کسی کادوسوروپے کا قرض دینا ہوتو ہم فکر پال لیتے ہیں اوراس کوسر سے اتار کردم لیتے ہیں اوراللہ تعالیٰ کا قرضہ اتارنے کی فکر ہی نہیں کرتے۔

سورہ العلق،آیت نمبر 7-6 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے　　　ترجہ:''انسان سرکش ہوجاتا ہے جبکہ اپنے آپ کوغنی دیکھتا ہے''۔

سورہ ہود،آیت نمبر 9 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ترجمہ:''جب ہم انسان کواپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں توخوش ہوجاتا ہے اوراگراس کواس کے اعمال کی وجہ سے کوئی سختی پہنچتی ہے(توسب احسانوں کوبھول جاتا ہے)بےشک انسان بڑا ناشکرا ہے"۔سورہ حم السجدہ،آیت نمبر 50 میں ایک اورجگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ترجمہ:''انسان بھلائی کی دعائیں کرتے کرتے تو تھکتا نہیں،کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو ناامید ہوجاتا ہے اورآس توڑ بیٹھتا ہے۔اوراگرتکلیف کے بعد ہم اس کواپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو میرا حق تھا''۔

ایک اورجگہ سورہ حم السجدہ،آیت نمبر 51 میں فرماتے ہیں:

ترجمہ:''جب ہم انسان پراپنا کرم کرتے ہیں تو پہلوتہی کرتا ہے اور پہلو پھیر کر چل دیتا ہے اور جب اس کوتکلیف پہنچتی ہے تو لمبی لمبی دعائیں کرنے لگتا ہے''۔

سورہ زمر،آیت نمبر 49 میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ترجمہ:''جب انسان کوتکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے پھر جب ہم اس کواپنی طرف سے نعمت بخشتے ہیں تو کہتا ہے کہ نعمت تو میرے علم اوردانش کے سبب سے ملی ہے (نہیں) بلکہ یہ آزمائش ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے''۔

یادرکھیں!سب سے بڑی عبادت جس سے رحمت الٰہی کے دروازے کھلتے ہیں وہ دعا ہے۔اللہ تعالیٰ کواپنے سے مانگنے والے سب سے زیادہ پسند آتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''جوشخص اللہ تعالیٰ سے دعانہیں کرتا اللہ اس پرغصہ کرتا ہے-اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے بڑھ کر کوئی چیز قدر کی نہیں''حضرت ابوہریرہؓ سے ہی روایت ہے کہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''رات کے پچھلے پہر میں رب تبارک تعالیٰ نچلے آسمان کی طرف نزول فرماتے ہیں اورفرماتا ہے" کون ہے جومجھ سے دعا کرے اورمیں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جومجھ سے سوال کرے اورمیں اس کا سوال پورا کروں؟ کون ہے جومجھ سے بخشش مانگے اورمیں اس کوبخش دوں"؟(صحیح مسلم)

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''جس شخص کودعا کی توفیق ہوگئی اس کے لیے قبولیت کے دروازے کھل گئے''-(جامع ترمذی)

یہ ضرور ہے کہ ہرشخص بقدراستطاعت ہی سعی کرے گا اورسعی بھی بقدرتوفیق الٰہی کرسکتا ہے۔لیکن ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ توجہ الٰہی اورقرب الٰہی کے مقامات کے لئے مطلوب اعمال کچھ اتنے مشکل ہیں کہ صرف خواص ہی ان کوکرسکتے ہیں اور یہ کہ یہ مقام صرف انہیں کا نصیب ہیں۔یادرکھیں کہ ان میں سے کوئی عمل بھی ایسا نہیں ہے جوکسی نہ کسی درجہ میں ایک عام انسان کے لئے کرنا ممکن نہ ہو یا کوئی مشکل ہو۔حصول جنت اورقرب الٰہی کے راستے کوآسان راستہ کہا گیا اورہمیں''الدین یسر''(آسان دین) کی بشارت دی گئی ہے۔

قرب الٰہی کی جستجو یاان اعمال کوکرنا یا کرنے کی کوشش کرتے رہنا ہرلحہ کا کام ہے لیکن بعض لمحات ایسے ہوتے ہیں جب ان کا حصول نسبتاً زیادہ آسان ہوجاتا ہے اوران کے نتائج میں کئی گنا اضافہ ہوسکتا ہے۔ہرشب وروز میں ایسے کئی لمحات ہیں اسی طرح رمضان المبارک کا مہینہ بھی ایسا ہی وقت ہے یہ بات کہ ہررات میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پرنزول فرماتا ہے اوراپنا دست کرم پھیلاتا ہے۔رات کے لمحات کی قدروقیمت اورنتیجہ خیزی ظاہر کرتی ہے اور یہ کہ رمضان المبارک میں شیطان کوباندھ دیا جاتا ہے۔جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔فرض کا ثواب ستر فرض کے برابراورنوافل کا فرض کے برابر کردیا جاتا ہے۔ رمضان کی قدروقیمت ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔رات ہرروزآتی ہے اوررمضان ہرسال ہم ان قیمتی اوقات سے جتنا فائدہ اٹھاسکتے ہیں اٹھائیں۔

اس ختم ہونے والی زندگی میں جولحہ بھی میسر ہواسی لمحے سے ان اعمال کوکرنے کا عزم کرلینا چاہیے۔ہم مسلمان ہیں تو یہ راہ ہم چھوڑنہیں سکتے۔اس لئے کہ یہ

رسول پاک خاتم النبیین ﷺ کی راہ ہے اور خیر کی راہ پر خود چلنا بھی فرض ہے اور دوسرے مسلمانوں کو اس راہ پر چلانا بھی فرض ہے اور قرب الٰہی کے لئے عبادات اور دوسرے عمل کرتے ہوئے یہ بات بھی ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ سب سے زیادہ کارگر نسخہ ''دعوت الی الخیر'' کا ہے اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ان اعمال میں کوئی عمل بھی ایسا نہیں ہے جس کو کرنے کے لئے زندگی کے عام معمولات کو ترک کرنا پڑے یا ان میں خلل پڑے یا مشغول ترین زندگی میں اس کی گنجائش ہی نہ نکل سکے۔اصل چیز توجہ الی اللہ اور اصل نسخہ عام معمولات ہی کو قرب الٰہی کے حصول کا ذریعہ بنالینا ہے۔

جس شخص نے اس کام کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا۔اور اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد اپنے اضافی مال اور اپنے پیسے کو اس کام میں لگا دیا۔تو کل روز جزا میں اسکو اسکے بدلے میں جنت کے عظیم ترین درجات سے نواز دیا جائے گا۔

کتنا مشکل تھا نزول قرآن کے وقت ''مقام قرب'' کا حاصل کرنا۔اور کتنے زیادہ تھے وہ لوگ جنہوں نے آپ خاتم النبیین ﷺ کے زمانے میں اور خلفائے راشدین کے زمانے میں یہ ''مقام قرب'' حاصل کرلیا۔کتنا آسان ہے آج کے دور میں اس مقام کا حاصل کرنا اور کتنے کم ہیں اس راستے پر چلنے والے مسلمان۔

اللہ سے محبت، اللہ کی محبت اور اس کی قربت اس سے بڑھ کر ہمیں زندگی میں اور کیا چاہیے؟ یہ بہت بلند مقام ہے اور یہ دولت بے حد قیمتی ہے اور اس محبت وقربت کی طلب اور کوشش ہر مسلمان کے لئے کسی نہ کسی درجہ میں ضروری ہے۔

آسان عملی طریقے:-

1۔نماز 2-روزہ 3-زکوۃ 4-ذکر 5-تلاوت قرآن پاک 6-صدقہ خیرات وغیرہ

یعنی شریعت کی پوری طرح پابندی اور برائیوں سے پوری طرح رک جانا-

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:''جو دائمی فرض ادا نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس کا وقتی فرض بھی قبول نہیں فرماتے''۔(ترمذی)

دائمی فرض ''**صدق**'' ہے-جھوٹ سو برائیوں کو جنم دیتا ہے اور شیطان صرف کمزور لمحہ میں انسان پر حملہ کرتا ہے(یعنی جس وقت انسان کسی برائی میں مبتلا ہو) جھوٹ بولتے وقت اس کا حملہ سب سے زیادہ تیز ہوتا ہے-اس لئے کہ اس کے بعد وہ بہت سے جھوٹ بلواتا ہے اور بہت سی برائیاں کرواتا ہے-

لہٰذا قرآن پاک اور احادیث شریف کے مطابق دعائیں مانگنی چاہیں کیونکہ جب بادشاہِ وقت اور اس کے مقرر کردہ وزیر نے عرضی کا مضمون خود بنا دیا ہے تو اس عرضی کی منظوری میں کوئی تردد باقی نہیں رہتا اور دعا میں عاجزی اور گریہ زاری کرنا تقرب الی اللہ کے وسیلوں میں سے ایک وسیلہ ہے۔اسلام کے معنی عربی زبان میں اطاعت اور فرمانبرداری کے ہیں اور مذہب اسلام کا نام اسلام اس لیے رکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمابرداری میں لگ جاؤ،یعنی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینے کا نام اسلام ہے یا اللہ تعالیٰ کے معاملے میں اپنی آزادی اور خودمختاری سے دستبردار ہونا اسلام ہے۔جو شخص اپنے سارے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے وہ مسلمان ہے اور جو معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے وہ مسلمان نہیں۔دوسرے لفظوں میں رب چاہی زندگی گزارنے والے مسلمان اور من چاہی زندگی گزارنے والے مسلمان نہیں۔اللہ تعالیٰ کو وہ عبادت پسند ہے جو باقاعدگی سے کی جائے اگر یہ تھوڑی ہی کیوں نہ ہو،عبادت میں استقامت ہونی چاہیے اس کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔سب سے پہلے نفس آگے بڑھتا ہے، پھر شیطان پکڑتا ہے، پھر علائق دنیا گھیر لیتے ہیں لیکن داعی حق کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر استقامت پیدا کرے کہ اللہ کی راہ میں مستقل مزاجی سے چلے جب تک جسم میں قوت ہے چلتا رہے۔ٹانگیں جواب دے دیں تو گھسٹنا شروع کر دے اور گھسٹتا رہے اور جب یہ بھی نہ ہو تو مسرت بھری نگاہوں سے اور پیار بھری زبان سے دوسرں کو منزل کی طرف اشارہ کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ سے خاتمہ بخیر کی دعا کرتے ہوئے اس جہان فانی سے کوچ کر جائے-(آمین)

اس دنیا سے سب چلے جائیں گے-لیکن وہ لوگ باقی رہیں گے جنہوں نے اپنی زبان سے لوگوں کے دل جیتے،اپنے لہجے سے لوگوں کو عزت اور احترام دیا،اپنے اخلاق سے لوگوں کے دلوں میں گھر بنالیا،اور اپنی زبان سے لوگوں کی عزت کی حفاظت کی-ایسے لوگ کبھی نہیں مرتے-یہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں-یہی لوگ ہیں جو قرب الٰہی کے درجے پر پہنچ گئے-

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

توفیق الٰہی

توفیق ایک انعام ایک عطیہ ہے جو بندے کے لیے نیکی کی راہ کھول دیتی ہے۔

پارہ چار سورہ آل عمران، آیت نمبر 101

ترجمہ: ''اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑتا ہے تو ضرور راہ راست دکھایا گیا''۔

مندرجہ بالا آیت میں اس بات کی گارنٹی ہے کہ جو شخص نیک نیتی اور یکسوئی سے اللہ تعالیٰ کی جانب رجوع کرے تو یقیناً اسے راہ راست پر ثابت قدمی سے گامزن رہنے کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے۔

پارہ پانچ میں سورہ النساء، آیت نمبر 137

ترجمہ ''بلاشبہ جو مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے۔ پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے، پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ تعالیٰ ایسوں کو ہرگز نہ بخشے گا اور نہ ان کو راہ ہدایت دکھلائے گا''

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر خلوص کے ساتھ ایمان لا کر اس پر قائم رہیں تب بھی مقبول نہیں۔ بلکہ اس نفی کا مقصد یہ ہے کہ بار بار کفر اختیار کرنے سے اور اس پر اصرار کرنے سے عادتاً قلب مسخ ہو جاتا ہے جس کے بعد اکثر ایمان کی توفیق نہیں ہوتی اور ہدایت کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔

پارہ چھ سورہ مائدہ، آیت نمبر 16

ترجمہ: ''اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو کہ رضائے حق کے طالب ہوتے ہیں۔ سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں اور ان کو راہ دیتے ہیں''۔

یہاں پر توفیق کا دارومدار اس بات پر ہے کہ انسان رضائے الٰہی کا طالب ہو اگر اس کی نیت اور عمل رضائے حق کے حصول کے لیے مخصوص ہوں تو اسے تاریکی سے نکل کر نور کی طرف آنے اور راہ راست پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا ہوتی ہے۔''

پارہ چھ سورہ مائدہ، آیت نمبر 71

ترجمہ: ''اور یہی گمان کیا کہ کچھ سزا نہ ہوگی تو وہ اندھے اور بہرے بن گئے''۔

اس میں یہ دلیل ہے کہ اگر انسان بار بار گناہوں میں مبتلا ہو کر توبہ کرنے کی بجائے اسی خام خیالی میں مبتلا رہے کہ ان بداعمالیوں کی اسے سزا نہ ملے گی تو اس سے نیکی کرنے کی استعداد ختم اور توفیق بند ہو جاتی ہے۔

پارہ نمبر 10 سورہ انفال، آیت نمبر 53

ترجمہ ''یہ بات اس سبب سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت کو جو کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتے جب تک وہی لوگ اپنے ذاتی اعمال نہیں بدل ڈالتے''

یعنی اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ ہاں بندے اپنے اوپر خود ظلم کرتے ہیں تو حالات بدل جاتے ہیں۔

پارہ بارہ سورہ ہود، آیت نمبر 114

ترجمہ: '' اور آپ (خاتم النبیین ﷺ) نماز کی پابندی رکھیے دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں بے شک نیک کام مٹا دیتے ہیں برے کاموں کو یہ بات ایک نصیحت ہے نصیحت ماننے والوں کے لیے''۔

اس میں یہ اصول ہے کہ اطاعت کے انوار سے گناہوں کی ظلمت دور ہو جاتی ہے اور اطاعت کا غلبہ جس قدر بڑھے گا گناہ گاری کا رجحان اس قدر کمزور ہوگا۔ اس سے بھی توفیق کی راہ کشادہ ہوتی ہے۔

پارہ نمبر 21 سورہ العنکبوت، آیت نمبر 69

ترجمہ: ''اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں، ہم ضرور ان کو اپنے راستے دکھائیں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے''

اس سے ثابت ہوا کہ اگر خلوص دل سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں مشقت برداشت کی جائے تو راہ راست کے مشاہدے کی توفیق عطا ہونا، ایک یقینی امر ہے۔

پارہ25 سورہ شوریٰ، آیت نمبر 13

ترجمہ: ''اللہ ہی اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے اور جو شخص رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے۔''

اس میں انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی شرط ہے۔ جونہی یہ شرط پوری ہو جائے اسے اللہ تعالیٰ کے قرب کی جانب ترقی حاصل کرنے کی توفیق عطا ہو جاتی ہے''

پارہ نمبر 28 سورہ طلاق، آیت نمبر 3-2

ترجمہ'' اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے نجات کی راہ نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے کہ (پہنچاتا ہے) جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا اور جو اللہ پر توکل کرتا ہے تو وہ اس کے لیے کافی ہے''

اللہ کا خوف خشوع کا باعث ہوتا ہے کہ خشوع سے عبادت آسان ہو جاتی ہے اور پھر رسوخ کا درجہ پا کر ایسے اعمال صالح کی توفیق نصیب ہوتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ اس کی نجات کی راہ نکال دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انفرادی سطح پر توفیق الٰہی ایک عظیم نعمت ہے اگر کوئی گناہ کرتا رہے تو بہ نہ کرے اطاعت سے رک جائے تو اس سے انوار و برکات منقطع ہو جاتے ہیں اور توفیق سلب ہو جاتی ہے۔

مندرجہ بالا تمام آیات پر مجموعی طور پر غور کرنے سے یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ توفیق کا دارومدار انسان کے اعمال پر ہے۔ ان اعمال کا مختصر ذکر مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے وہ یہ کہ'' اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت میں پہل کرنا ہر انسان کا اپنا بنیادی فرض ہے۔ اگر نیت میں خلوص اور ثبات ہو تو اللہ تعالیٰ کی رحمت خود آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیتی ہے۔ ہر اطاعت کے اپنے انوار و برکات ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر اطاعت سے دوسری اطاعت کا سلسلہ چلا کرتا ہے۔ اور اس میں ایسا سامان جمع ہونے لگتا ہے جس کو توفیق کہتے ہیں۔ عبادت اور اطاعت سے جس طرح توفیق شروع ہوتی ہے، نافرمانی اور گناہوں سے اسی طرح بند بھی ہو جاتی ہے۔ اس بات کو اس حدیث قدسی سے اچھی طرح واضح کیا جا سکتا ہے۔

'' کہ جب بندہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی (طرف متوجہ ہوتا ہوں) ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جب وہ ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف دو ہاتھ بڑھتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کے پاس دوڑ کر آجاتا ہوں''۔ (صحیح بخاری)

اب جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے۔

کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی عبادت میں پہل کرنا انسان کا بنیادی فرض ہے۔ تو بنیادی بات مندرجہ بالا حدیث قدسی کی رو سے بندے کا اللہ تعالیٰ کی طرف ایک بالشت بڑھنا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا اعمال ہیں جن کو کرنے سے بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف ایک بالشت بڑھ سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فرائض کی پابندی سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرتا ہے اور نوافل کی زیادتی سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتا ہے۔ اب فرائض میں سب سے زیادہ زور نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے نماز پر دیا ہے۔ سورہ ھود آیت نمبر 114 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ترجمہ:'' اور آپ (خاتم النبیین ﷺ) نماز کی پابندی رکھیے دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصوں میں بے شک نیک کام مٹا دیتے ہیں برے کاموں کو یہ ایک نصیحت ہے، نصیحت ماننے والوں کے لیے''۔

اگر انسان پانچ وقت کی نماز پابندی سے ادا کرے، چلتے پھرتے اللہ کا ذکر کرے، جھوٹ نہ بولے، دھوکا اور غیبت سے بچے، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے محبت کرتا رہے تو بندہ اللہ کی طرف ایک بالشت بڑھ جائے گا اور فوراً ہی اللہ اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھ جائے گا یہ توفیق ہو گی۔ اب معلوم کرنے کی بات یہ ہے کہ ہمیں یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف ایک بالشت بڑھ گئے ہیں اور اس کے جواب میں باری تعالیٰ ایک ہاتھ بڑھ گیا ہے؟ (یہاں بڑھ جانے سے مراد متوجہ ہونا ہے) ایسا بندہ جس کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے اپنے موجودہ اعمال، نماز، ذکر، تلاوت وغیرہ کو ناکافی محسوس کرتا ہے، کیونکہ مندرجہ بالا توفیق کی وجہ سے اس کے دل کی آنکھوں پر سے معاصی کی جو کالک لگی ہوئی تھی وہ چھٹ گئی۔ تو اب ایسے بندے کو اپنے اعمال کم اور اللہ تعالیٰ کی عنایات اور نوازشات زیادہ اچھی طرح نظر آنے لگیں گی اور پھر اس توفیق (اللہ تعالیٰ کا بڑھنا) کی وجہ سے اس کو یہ سوچ سوچ کر خوف کی لہریں ابھرنے لگتی ہیں کہ میں نے کتنا وقت ضائع کر دیا۔ مجھے کچھ کر لینا چاہیے، وقت کم ہے وغیرہ وغیرہ۔ اب چونکہ ایسے بندے کو اپنی عبادات کم لگنے لگیں گی تو اب وہ اور زیادہ اہتمام عبادت الٰہی کا کرے گا۔ تہجد، اشراق، چاشت وغیرہ پر توجہ دے گا اور وہ یاد الٰہی میں ان عبادات کو کر کے

ایک خاص قسم کی لذت محسوس کرے گا۔ کچھ عرصہ اگر وہ اسی حال میں رہتا ہے تو یہ بندے کا اللہ کی طرف ایک ہاتھ بڑھنا ہے۔ جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ اس کی طرف دو ہاتھ بڑھ جاتا ہے اور جیسے ہی اسے یہ توفیق نصیب ہوتی ہے۔ بندے کو پھر اپنی عبادت کم اور عنایت الٰہی زیادہ محسوس ہوتی ہیں اور اس کی بے چینی اور بے قراری بڑھ جاتی ہے اور وہ اپنی عبادت میں اور زیادتی کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو بہت ہی بہتر طریقہ سے انجام دینے کی بھرپور کوشش بھی کرتا ہے اور ساتھ ساتھ خوف الٰہی سے کانپتا بھی رہتا ہے کہ معلوم نہیں میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟

اب بندے کی طرف سے ان اعمال کی بجا آوری اور ان میں زیادتی کا سبب توفیق الٰہی ہے جس نے اس کے دل کی آنکھوں کو روشن کیا کہ اب پہلے سے اور بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں نظر آنے لگیں۔ اب بندے کو پھر اپنے اعمال کم اور رب کی عنایات، نعمتیں اور نوازشات زیادہ محسوس ہونے لگیں گی اور یہ احساس توفیق اللہ کا بندے کی طرف بڑھنے کی نشانی ہے۔ ایسا انسان اب پہلے سے زیادہ اعمال کرنا چاہتا ہے۔ اب دین سیکھنے کی تمنا اسے تنگ کرنے لگتی ہے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر 70 مرتبہ شفقت کی نگاہ ڈالتا ہے تب اس کے قدم دین سیکھنے کے لیے نکلتے ہیں'' اور پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ جب کسی سے محبت کرتا ہے تو اسے اپنے ایک ایسے چاہنے والے سے ملا دیتا ہے جو اس کی ذات کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے ملا دے (متعارف کروادے)

اس طرح ایک انسان جتنا زیادہ اپنے اوپر انعامات کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کو اس کی نوازشات کو محسوس کرے گا۔ اتنا ہی شکرانہ ادا کرے گا اور زیادہ سے زیادہ اعمال بجالائے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کے انعامات، اور نوازشات اور احسانات کا نظر آنا اور محسوس ہونا ہی توفیق الٰہی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا بندے کی طرف بڑھ جانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب انسان اپنی کی ہوئی عبادت اور اطاعت کو کم اور رب کی عنایات اور احسانات کو زیادہ محسوس کرے تو جان لے کہ رب اس کی طرف متوجہ ہے یعنی توفیق الٰہی ہو رہی ہے اور اگر اپنی عبادات کو اور اعمال کو زیادہ اور رب کی نوازشات کو کم محسوس کرے تو جان لے کہ اب معاصی کی کثرت نے دل پر پردہ ڈال دیا ہے جس سے اُس ذات کے احسانات نظر آنا بند ہو گئے ہیں اس طرح ناشکری کے رجحانات بڑھ جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ توفیق سلب ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے میں انسان کا توبہ کرنا بہت کام آتا ہے اگر بندہ توبہ کرتا ہے اور کرتا رہتا ہے تو توفیق الٰہی متوجہ ہو جاتی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ شیطان ہماری رگوں میں خون کے ساتھ ساتھ گردش کرتا ہے اور کوئی کسر انسان کو بہکانے کی نہیں چھوڑتا۔ اس لیے توبہ کا دروازہ کھٹکھٹائیں جو کہ کبھی بند نہیں ہوتا۔

انسان کو چاہیے کہ اپنے اعمال پر نظر رکھے غلطی اور غفلت پر توبہ کرے لیکن ایک بات یاد رکھیں کہ عوام کی توبہ گناہ پر اور خواص کی توبہ غفلت پر ہوتی ہے۔ چنانچہ باری تعالیٰ کا خوف ہی انسان کے اندر خشوع پیدا کرتا ہے اور خشوع کے بعد عبادت کا شوق پیدا ہوتا ہے اور پھر انسان کو اعمال صالح کرنے کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے اس کے بعد انسان اپنے انہی اعمال صالح کی وجہ سے نجات کی راہ پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اطاعت جس قدر زیادہ ہوگی اتنی ہی ہمارے باطن کی صفائی ہوگی اور نور پیدا ہوتا جائے گا۔ کیونکہ گناہوں کی ظلمت کا اندھیرا چھٹ چکا ہے اب اطاعت کا نور ظاہر ہوگا۔ اطاعت کا مطلب اللہ تعالیٰ کی ہر طرح سے فرمانبرداری اور یہ فرمانبرداری اعمال صالح کی توفیق سے حاصل ہوئی۔ اب جب نور پیدا ہوا تو نجات کی راہ روشن ہوگئی اور بندے نے ذات باری تعالیٰ تک رسائی پائی، یہی اطاعت کا جذبہ جس قدر بڑھتا جاتا ہے، گناہ کے رجحانات کم ہوتے جاتے ہیں اور توفیق کی راہ کھلتی چلی جاتی ہے۔ فرمان الٰہی ہے۔ (سورہ العنکبوت آیت نمبر 69)

ترجمہ: ''اور جو لوگ ہماری خاطر مشقتیں برداشت کرتے ہیں، ہم ان کو اپنی طرف آنے کے راستے ضرور دکھائیں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے "۔

فرض عبادت سے نوافل اور پھر مجاہدہ اور ریاضات توفیق الٰہی ہی سے یہ تمام راہیں ہموار ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جب انسان فرائض کی ادائیگی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ توفیق ہوئی اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کیا کرتا ہے۔

ترجمہ: ''جو شخص رجوع کرے اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف آنے کی رسائی دے دیتا ہے اور اللہ ہی اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے''

جیسا کہ سورہ آل عمران آیت نمبر 101 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ترجمہ: ''جو شخص اللہ کو مضبوط پکڑ لیتا ہے وہ ضرور راہ راست کی ہدایت (توفیق) پاتا ہے''

یہ اللہ تعالیٰ کا بہت ہی بڑا کرم ہے کہ وہ ندامت کے دو آنسوؤں پر 70 برس کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور ہمیں بار بار معاف کرتا ہے اور کرتا ہی رہتا ہے لیکن جیسا کہ ہمیں معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ معافی کی درخواست کرنے والے کو کبھی بھی رد نہیں کرتا یہ اس کی شان کریمی کے خلاف ہے۔ تو اس عطائے درگزر سے ہمیں ناجائز فائدہ

نہیں اٹھانا چاہیے، دیکھئے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں؟

ایک شخص جو توفیق الٰہی سے گناہوں سے ڈر کر توبہ بھی کرتا رہتا ہے اور گناہوں کے نزدیک نہیں جاتا۔ کیا اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو بار بار گناہ کرتا اور معافی چاہتا رہتا ہے؟ گناہ سے انسان کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے اور توبہ کرنے سے مٹا دیا جاتا ہے پھر گناہ کرنے سے یہ نقطہ پھر لگ جاتا ہے اور توبہ کرنے سے مٹا دیا جاتا ہے۔ غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ ایک اس شخص کا دل ہے جس نے گناہ کیا ہی نہیں اور ایک یہ بار بار صاف ہونے والا دل۔ کیا دونوں دل اپنی چمک دمک میں برابر ہو سکتے ہیں؟ نہیں، کبھی نہیں تو جو مرتبہ گناہ سے بچنے والے، گناہ نہ کرنے والے کا ہو گا وہ اس شخص کا نہ ہو گا جو بار بار توبہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے بار بار معاف فرما دیتا ہے۔ یہ تو اس کی شان کریمی ہے کہ دعا مانگنے والے ہاتھ وہ کبھی بھی خالی نہیں لوٹاتا۔ توبہ کرنے والوں کی توبہ وہ ضرور قبول کرتا ہے۔ لیکن کوشش یہ کرنی چاہیے کہ گناہ سے بچا ہی جائے اور گناہ ہونے ہی نہ پائے اور پھر بھی اللہ سے ڈر کر توبہ کرتے رہنا چاہیے۔ اب اگر کوئی شخص اس زعم میں رہے کہ اللہ تو معاف کرنے والا ہے۔ وہ معاف کر ہی دے گا اور پھر اس خام خیالی میں رہے کہ شفاعت تو ہو ہی جائے گی یا پھر اس کی بداعمالیوں کی اسے سزا نہ ملے گی تو ایسے بندے سے آخیر کار نیکی کرنے اور توبہ کرنے کی توفیق سلب کر دی جائے گی کیونکہ دینے والا، واپس بھی لے سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ پیش نظر ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں سے ہم کلام ہونے کی قدرت رکھتے تھے، پرندوں نے جب حضرت سلیمان علیہ السلام کو زبان دان اپنا محرم راز پایا تو انہوں نے اپنی چوں چوں ترک کی اور پیغمبر خدا کی صحبت اختیار کر لی، حضرت سلیمانؑ کے دربار میں چرند پرند کیا ہر قسم کے جاندار جن وانس ہر وقت موجود رہتے اور حضرت سلیمانؑ کے ساتھ دانائی اور حکمت کی باتیں کیا کرتے۔ ایک دن دربار لگا ہوا تھا تجربے اور دانائی کی نہریں رواں دواں تھیں۔ تمام پرندے باری باری اپنی اپنی صفات اور اپنا اپنا ہنر بیان کر رہے تھے کہ آخیر میں ہدہد کی باری آئی، اس نے کہا ''اے علم وحکمت کے بادشاہ مجھ میں ایک خوبی ہے اور وہ یہ کہ میں اڑتے ہوئے بلندی سے زیر زمین پانی کا اندازہ لگا لیتا ہوں اور یہ بھی کہ پانی کتنی گہرائی میں ہے؟، پانی کی خاصیت کیا ہے؟، میٹھا ہے یا نمکین، یہ زمین سے نکل رہا ہے یا پتھر سے چشمہ ہے، یا نہر کا پانی'' حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد کی اس خوبی کی بہت تعریف کی اور کہا کہ آئندہ سے بے آب وگیاہ صحراؤں میں سفر کے دوران تو ہمارے ہراول دستہ کے ساتھ رہ تاکہ پانی کا کھوج لگاتا رہے۔ کوے نے جب یہ سنا کہ ہدہد کو ہراول دستے میں شامل ہونے کا اعزاز مل گیا تو مارے حسد کے انگاروں میں لوٹنے لگا۔ فوراً ہی بولا "اے بادشاہ یہ ہدہد نے آپ سے جھوٹ بولا ہے، اس نے یہ جھوٹا دعویٰ کیا ہے؟ اس سے پوچھیئے کہ تیری نظر ایسی ہی تیز ہے کہ تو پاتال میں چھپے ہوئے پانی کو دیکھ لیتا ہے تو پھر تجھے زمین پر بچھایا ہوا وہ جال کیوں نظر نہیں آتا جو شکاری تجھے پھانسنے کے لیے زمین پر لگاتا ہے؟ ایسا ہنر تیرے پاس ہے تو تو جال میں گرفتار کیوں ہو جاتا ہے"؟ کوے کی بات سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہدہد سے کہا کہ ''اپنے دعوے کی صداقت کا ثبوت پیش کرو'' ہدہد نے بے خوف ہو کر جواب دیا، "اے بادشاہ میرا یہ دعویٰ ٹھیک نہ ہو تو یہ گردن حاضر ہے، یہ صفت مجھے قدرت نے عطا کی ہے، جب قدرت ہی یہ صفت سلب کر لے جب فرمان قضا وقدر جاری ہو جائے اور آخری وقت آ جائے تو نگاہ کی یہ خوبی کیا کام آئے گی؟ ایسے موقع پر عقل کام نہیں کرتی، چاند سیاہ ہو جاتا ہے اور سورج کو گرہن لگ جاتا ہے "۔ یعنی اس باری تعالیٰ کے آگے کسی کی نہیں چلتی وہ اپنی مصلحت کے مطابق تدبیروں کو توڑ دیتا ہے۔ تو توفیق دینے والا توفیق سلب بھی کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف فرمائے۔ (آمین)

****

یادِ الٰہی

اِس دنیا میں ہر چیز کا ایک بدن اور ایک اِس کی روح ہے، یہ ظاہری بدن جو ہمیں دیا گیا ہے یہ انسان نہیں ہے، یہ انسان کی محض ایک صورت اور علامت ہے۔ انسانیت اِس جِسّے کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ جِسے روح یا حقیقت کہتے ہیں۔ اصل میں ہماری انسانیت وہی ہے اور اُس کا نام زندگی ہے، اگر وہ انسان کے جسم سے نکال دی جائے تو بدن کا کوئی وجود نہیں، بدن گلنا، سڑنا اور پھٹنا شروع ہوجائے گا اور اِس کا ریزہ ریزہ بکھر جائے گا، مٹی مٹی ہوجائے گی اور پانی پانی ہوجائے گا۔

گویا روح نکلتے ہی بدن کی کوئی اصلیت نہیں رہ جاتی، یہی حال اِس پوری کائنات کا ہے، یہ کائنات بھی کسی روح سے زندہ ہے، جب روح نکال لی جائے گی تو ساری کائنات کا خیمہ آ پڑے گا۔ درہم برہم ہوجائے گا اور ریزہ ریزہ بکھر جائے گا۔ یہ روح کیا چیز ہے؟

انسانی روح کے بارے میں قرآن پاک سورہ بنی اسرائیل، آیت نمبر 85 میں ارشاد کیا گیا ہے:

ترجمہ: "اے پیغمبر یہ لوگ آپ خاتم النبیین ﷺ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دیجیے کہ روح اللہ کا ایک امر ہے (اللہ کا ایک حکم)"

یہ حکم اور لطیفہ خداوندی ہے۔ اِس سے یہ کثیف جسم انسانی سنبھلا ہوا ہے۔ اِس طرح پوری کائنات کی روح بھی درحقیقت ایک لطیفہ ربّانی ہے اور اِس کا نام "ذکر اللہ یا یادِ خُداوندی" ہے۔ گویا ذکرِ الٰہی یا یادِ حق سے یہ کائنات کھڑی ہوئی ہے۔ جب اِس سے ذکر اللہ یا یادِ خُداوندی ختم ہوجائے گا جبھی یہ خیمہ آ پڑے گا۔

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا "قیامت اُس وقت تک قائم نہیں ہوگی۔ جب تک اس کائنات میں ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے"۔ (صحیح مسلم)

قیامت کے نزدیک لوگ نہ اچھائی کو اچھائی جانیں گے اور نہ بُرائی کو بُرائی، سڑکوں پر اِس طرح بدکاری ہوگی جیسے جانور پھرتے ہیں، نہ حیا ہوگی نہ غیرت، جب ساری کائنات اور سارے انسان ایسے بن جائیں گے، اُس وقت قیامت قائم ہوجائے گی۔ تو قیامت اس عالم کے ذرّہ ذرّہ کے بکھیر دینے کا نام ہے، جب ذِکر اللہ نہ رہا تو کائنات نہ رہے گی۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اِس کائنات کی روح ذکرِ خُداوندی ہے۔ تو ذکرِ خُداوندی ہم سے اور آپ سے ہے، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اِس عالم کو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں نے سنبھال رکھا ہے، جب یہ ختم ہوجائیں گے تو کائنات بھی ختم ہوجائے گی۔

کائنات کا ذرہ ذرہ یادِ حق میں مصروف ہے:- شریعتِ اسلام بتلاتی ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ یادِ خُداوندی میں مصروف ہے۔ ہر وقت یادِ حق کرتا رہتا ہے اور جب یاد منقطع ہوتی ہے وہی اِس ذرّے کے مٹنے اور فنا ہونے کا وقت ہوتا ہے۔ جسم روح کا لباس ہے، ایک وقت وہ ہوتا ہے کہ نیا اور خوبصورت ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ پرانا ہوتا چلا جاتا ہے۔ کبھی کہیں سے سینا اور رفو کرنا پڑ جاتا ہے، رفتہ رفتہ یہ لباس پرانا ہوتا چلا جاتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ روح کے لیے یہ لباس پہننے کے قابل نہیں رہتا اور پھر روح اِس لباس کو اُتار پھینکتی ہے، اگر روح نیک ہے تو اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً ہی نوری لباس پہنا دیا جاتا ہے۔ میت جو مرنے کے بعد باقی رہ جاتی ہے وہ تو روح کے میلے کپڑے ہوتے ہیں، اِس لیے اِن روح کے میلے کپڑوں کے پاس بیٹھ کر رونا بالکل فضول ہوتا ہے۔ ہاں اگر کچھ نوری کلام پڑھا جائے تو نوری کلام، نور کے لباس، اور نوری بدن (روح) کے پاس پہنچ کر اُس کو اور منور کر دیتا ہے۔ "ذکر اللہ" نوری کلام ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو بھی اپنے کلام میں "ذکر" فرمایا ہے۔ یعنی اِس موقعہ پر تلاوت کر کے نوری کلام روح تک پہنچایا جائے تو فائدہ ہوگا۔

ہری ٹہنی اللہ کا ذکر کرتی ہے، جب ذکر ختم ہوجاتا ہے تو ٹہنیاں خشک ہوجاتی ہیں، پتے جھڑ جاتے ہیں، ذرّہ ذرّہ اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے۔ کائنات کا کوئی ذرّہ نہیں جو اللہ کے ذکر میں (مصروف نہ ہو) مشغول نہ ہو، مگر ہم اُن کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے، ہماری زبان اور ہے اور کائنات کے ذرّوں کی زبان اور، پرندوں کی زبان اور۔

اہلِ باطن کو کبھی کبھی علم دے دیا جاتا ہے، وہ ان تمام چیزوں کی تسبیح کو سُنتے ہیں اور سمجھتے ہیں، انبیاء کرامؑ کو بطور معجزے کے یہ علم دیا گیا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ وہ پرندوں کی بولیاں سمجھ لیا کرتے تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام کا معقولہ قرآن پاک میں نقل ہے۔ "اے لوگو ہمیں پرندوں کی بولیاں سمجھائی گئی ہیں" حضرت سلیمان علیہ السلام یہ بتادیا کرتے تھے کہ دو کوّے کیا بات کر رہے ہیں، دو چڑیاں کیا بات کر رہی ہیں۔ اور چیونٹیوں کے لشکر کو جس چیونٹی نے مخاطب کر کے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لشکر سے بچنے کے لیے کہا تھا، اُس کا ذکر بھی قرآن میں موجود ہے۔ "اے چیونٹیو تم جلدی جلدی اپنے گھروں میں داخل ہوجاؤ ایسا نہ ہو کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر یہاں سے گزرے اور تم سب کو روند ڈالے"۔

احادیث مبارکہ میں کچھ جانوروں کی مثالیں بھی بیان کی گئی ہیں، اور ان کی تسبیح بھی ذکر کی گئی ہے۔ کہ تیتر یہ کہتا ہے اور مور یہ کہتا ہے۔ تیتر کے بارے میں

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ تیتر کی تسبیح ہے " جیسا کرو گئے ویسا بھرو گے "۔ کچھ تیتر پکارتے ہیں "سچ سبحان تیری قدرت" (صبح کا نظارہ) بلبل کہتا ہے " صبح شام اللہ کی حمد کرو" -ایک جانور کی تسبیح ہے "ادے کا بدلہ "۔بعض کی یہ تسبیح بھی بیان کی گئی ہے " پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو داڑھیوں اور عورتوں کو مینڈھیوں اور چوٹیوں سے زینت بخشی" گویا مختلف قسم کی نصیحتیں اور عبرتیں پرندوں کی زبان سے ادا ہوتی ہیں، پرندہ بھی کہہ سکتا ہے کہ "مَیں تو نصیحت کرتا رہا، لیکن انسان میری زبان ہی نہیں پہچان سکے، یعنی وہ اوصاف ہی پیدا نہ کر سکے کہ مجھے سمجھ سکتے۔

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے جانوروں کی گفتگو:- جناب رسول پاک خاتم النبیین ﷺ جانوروں کی بولیاں سمجھتے تھے۔ نہ صرف جانوروں کی زبان سمجھتے تھے بلکہ بعض اوقات اِن کے معاملات اور جھگڑوں کا فیصلہ فرماتے تھے۔

حدیث پاک میں ہے کہ ایک اونٹ بلبلاتا ہوا اور اپنی زبان میں کچھ بڑبڑاتا ہوا نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا، اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور آ کر حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کے قدموں میں اپنا منہ ڈال دیا۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا "اِس کے مالک کو بلاؤ" اُونٹ کا مالک بلایا گیا، آپ خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا "یہ شکایت کر رہا ہے کہ تم اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ اس پر لاد دیتے ہو "؟ مالک نے اقرار کیا اور کہا " یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ بے شک مَیں ایسا ہی کرتا ہوں، مَیں مجرم ہوں"، آپ خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا " آئندہ ایسا مت کرنا" اُونٹ خوش ہو گیا اور اپنے مالک کے ساتھ واپس چلا گیا۔ تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے اُونٹ کی زبان کو سمجھا اور اُس کی دادرسی کی اور اُس کے حق میں فیصلہ دیا۔ (دلائل النبوت)

غرض نبی کریم خاتم النبیین ﷺ جانوروں کی بولیوں پر مطلع تھے۔ انبیاء علیہ السلام کو بطور معجزے کے جانوروں کی بولیوں کا علم دیا گیا حتیٰ کہ پرندوں کی زبانوں کا بھی۔

نوعِ انسانی کے سوا دنیا کی ہر نوع کی ایک ہی زبان ہے:- حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اِنسانوں کی زبان کا علم دیا گیا تھا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ترجمہ:"اور آدم علیہ السلام کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے گئے"۔ (سورہ البقرہ، آیت نمبر 31)

اِس کی تفسیر یہ بھی ہے کہ آدم علیہ السلام کو تمام لغات سکھا دی گئیں، جو قیامت تک انسانوں کے اندر بولی جانے والی تھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پہلی نسل ان تمام زبانوں کو جانتی تھی لیکن جب یہ نسلیں تمام دنیا میں منتشر ہوئیں تو کوئی قبیلہ کہیں آباد ہوا کوئی کہیں، تو ایک ایک قبیلہ ایک ایک لغت کا ماہر ہو گیا۔ باقی زبانیں آہستہ آہستہ بھول گئیں۔ یعنی دوسری زبانوں کو سمجھنا چھوڑ دیا، پھر سمجھنے سے محروم ہو گئے۔ اِس طرح زبانیں الگ الگ ہو گئیں، اِس کو بھی حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانی بتایا ہے۔ اُس کی قدرت کی نشانیوں میں سے، اِنسان کا اپنا بنایا جانا، آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش اور نوعِ انسانی کی زبانوں اور رنگوں کا اختلاف، یعنی بنی آدم اِس میں مختلف ہیں، حالانکہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔

لیکن ایک دوسرے کی صورت نہیں ملتی، رنگ نہیں ملتا، زبان نہیں ملتی، ایک پنجابی بولتا ہے، ایک پشتو، ایک ہندی بولتا ہے تو ایک بنگالی اور ایک انگریزی، دنیا کے جتنے جاندار ہیں۔ ہر قسم کی ایک زبان ہے۔ مثلاً طوطے کوّے لیجیے، طوطے نے ٹیں ٹیں ہی کرنی ہے۔ چاہے وہ طوطا ہندوستان کا ہو یا پاکستان کا ہو، افغانستان کا ہو یا ترکستان کا ہو۔ مور ایک بولی بولے گا، چاہے ایشیا کا ہو یا یورپ کا یا افریقہ کا ہو، کبوتر ایک طرح بولے گا چاہے پاکستان کا ہو یا سعودی عرب کا یا کہیں اور کا۔

لیکن انسان بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں، ترکی کی اور زبان، پاکستانی کی اور زبان، یورپین کی اور زبان ایشین اور افریقہ کی اور زبان۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں کہ ایک ہی جنس کے انسان ہیں۔ لیکن زبان الگ الگ ہے اور کوئی ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتا ہے۔ بحر حال ہر چیز اپنی اپنی زبان میں تسبیح کرتی ہے لیکن ہم ان کی زبانوں کو نہیں سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم ایک دوسرے کی زبانوں کو نہیں سمجھتے ہیں، غرض " کنکریاں تسبیح کرتی ہیں"، "سفید کپڑا تسبیح کرتا ہے"، "چلتا ہوا پانی تسبیح کرتا ہے"۔ "ہری ٹہنیاں تسبیح کرتی ہیں"، اگر نہیں ذکر کرتا تو انسان نہیں ذکر کرتا۔ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہے تو اِنسان، حالانکہ سب سے زیادہ ذاکر اِنسان کو ہونا چاہیے تھا۔ اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں انسان کو دی ہیں ساری کائنات میں وہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے کسی اور کو عطا نہیں کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور تمام جہان کو اِس کی خدمت میں لگا دیا۔

(1) ساری کائنات انسان کی غذا ہے:- ہر جانور کا لباس اِس کی کھال ہے، انسان کو الگ لباس دیا، رنگ برنگ کا لباس، رنگ برنگ کے کپڑے، ہر نوع کی غذا ایک ہے کوئی نوع گھاس کھاتی ہے، کوئی دانہ کھاتی ہے کوئی پتے کھاتی ہے تو کوئی مٹی کھاتی ہے تو کوئی گوشت کھاتی ہے اور کوئی کیڑے مکوڑے کھاتی ہے۔ لیکن انسان کو ہر چیز پر قادر کیا گیا ہے۔ ہر چیز اِس کی غذا ہے۔ گوشت یہ کھائے، چونا یہ کھائے، سونا یہ کھائے اور چاندی یہ کھائے، غرض جمادیات، نباتات اور حیوانات ساری چیزیں

انسان کی غذائیں ہیں۔ چاندی اور تانبے کے ورق نگل جائے گا۔ سونے اور چاندی کے کشتے کھا جائے گا۔ دنیا بھر کی ہر چیز اس کے پیٹ میں چلی جاتی ہے۔ تو کائنات کی ہر نوع کی ایک غذا ہے اور پوری کائنات انسان کی غذا ہے۔

(2) ساری کائنات انسان کی سواری ہے:- ہر چیز اپنے پیروں سے چلتی ہے۔ انسان کو سواریوں پر چلایا گیا، حیوانات اِس کی سواریاں ہیں، نباتات اِس کی سواریاں، درختوں پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے اور جنگلی جانوروں سے بچاؤ کے لیے اوپر بسیرا کر لیتا ہے۔ جمادیات انسان کی سواریاں، یہ تمام جہاز اور ریل گاڑیاں وغیرہ اور حیوانات اِس کی سواریاں ہیں۔ گویا اُونٹ، بیل، خچر، گدھا، یہ سب انسان کی سواریاں ہیں۔ تو حیوانات کے سروں پر یہ سوار، جمادیات کے سروں پر یہ سوار اور نباتات کے سروں پر یہ سوار، سمندروں میں یہ سواری کرے، زمین کی پشت پر یہ سواری کرے اور ہواؤں کے دوش پر یہ سواری کرے۔ تو ہر جاندار اپنے پیروں پر چلنے پر مجبور ہے، اِنسان کو اپنا مقرّب اور محبوب بنایا اور ساری کائنات اِس کی سواری بنا دی گی۔

ساری کائنات انسان کا لباس ہے- درختوں کی چھال سے انسان لباس بنائے، روئی سے یہ لباس بنائے، جانوروں کی کھال سے انسان لباس بنائے۔ لوہے اور لکڑی سے یہ لباس بنائے۔ غرض ساری کائنات اِس کا لباس، ساری کائنات اِس کی سواری، اللہ تعالیٰ کا اِتنا چہیتا اور پیارا انسان کہ ساری کائنات اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت میں لگا دی۔ کہ کھانے کو بیٹھے تو جو چیز چاہے کھائے گا، بکرے کا گوشت، مرغی کا گوشت، مچھلی کا گوشت۔ لباس بنائے تو چپ ہو کر بیٹھ جاؤ اس کو لباس بنانے دو، سواری پر سوار ہو تو سواری بھی سر تسلیم خم کر دے کہ اِس کو سوار ہونے دو، تو ساری کائنات انسان کی خدمت پر لگا دی۔ تو انسان کی خدمت ساری کائنات کرتی ہے تو سب سے زیادہ ذاکر بھی انسان کو ہونا چاہیے تھا۔ مگر ہر مخلوق سے زیادہ غافل ہے تو انسان غافل ہے، انعامات کا تقاضہ کیا ہے؟ پتھروں کی شان دیکھیے کہ اللہ کے خوف سے

1۔ اِن میں سے نہریں اور چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔   2۔ پتھر رو پڑتے ہیں، اِن سے پانی بہہ نکلتا ہے۔

3۔ گویا خوفِ الٰہی سے پھوٹ پڑتے ہیں۔ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں 4۔ اوپر سے نیچے گر پڑتے ہیں (خشیت الٰہی سے)   (سورہ البقرہ، آیت نمبر 74)

یہ ان کی تواضع انکساری اور خوفِ خُدا کی بات ہے۔

لیکن اگر مغروری اور کبر انسان میں بھرا ہوا ہے۔ نہ اِس کی آنکھ سے آنسو ٹپکتا ہے نہ یہ تواضع سے نیچے جھکتا ہے نہ یہ گڑگڑاتا اور نہ یہ اللہ کے حضور گرتا ہے تو سب سے زیادہ غافل اِنسان یہی ہے۔ حالانکہ اِس پر جس قدر انعامات کی بارش اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے اس کو سب سے زیادہ ذاکر ہونا چاہیے تھا۔ (اللہ کو یاد رکھنا چاہیے تھا)

حقیقتِ زندگی:- اِس لیے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ذکر اللہ چونکہ حیات ہے۔ تو ذکر کرنے والا غافلوں میں ایسا ہے کہ جیسے مردوں میں زندہ بیٹھا ہو۔ اگر ایک پورا مجمع غافلوں کا ہو وہاں ایک اللہ تعالیٰ کی یاد کرنے والا موجود ہو۔ وہ ایسا ہے کہ مردوں کے مجمع میں ایک زندہ بیٹھا ہو۔ اِس لیے کہا جاتا ہے کہ **بدن کی زندگی، زندگی نہیں ہے بلکہ قلب کی زندگی ذکر ہے۔**

مجھے ڈر ہے کہ دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگی عبارت ہے تیرے جینے سے

زندگی نام ہے دل کی زندگی کا، اور دل کی زندگی اللہ تعالیٰ کی یاد سے ہوتی ہے، ابدی اور لافانی زندگی، بدن کی زندگی روٹی اور ٹکڑے سے ہوتی ہے، عارضی اور فانی زندگی، یہ اتنی عارضی ہے کہ روٹی ملنے میں ذرا دیر ہوئی مرجھا جائے گی۔ تو انسان اگر ذکر کرنے والا ہے تو سارے ذاکروں (یعنی تمام جانداروں) سے بڑھ جائے گا، کیونکہ اِس کا ذکر جامع ہوگا، جو باقی انواع کو میسر نہیں ہے، تسبیح قرآن، نماز، اور دُرود شریف وغیرہ اور اگر غافل بنے گا تو سب سے بدتر ہو جائے گا۔ حق تو یہ تھا کہ سب سے زیادہ ذاکر ہوتا، لیکن یہ دنیا کی ذلت میں لگ گیا اور غافل ہو گیا تو ذکر فی الحقیقت روح کی غذا ہے اور ذکر ہی فی الحقیقت انسان کی زندگی ہے، غذائے روحانی، ذِکر اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔

زندگی کی حقیقی غذا:- یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ انبیا اور اولیاء اللہ کی غذا قلیل ہوتی ہیں اور قوتیں سب سے زیادہ، یہ قوت ان میں یادِ خُداوندی سے پیدا ہوتی ہے۔ حدیثِ پاک میں ہے کہ آپ خاتم النبیین ﷺ نے اُمت کو منع کیا کہ صوم وصام مت رکھو، یعنی سحری کرو اور افطار کرو اور پھر سحری کرو اور روزہ رکھو، یعنی لگاتار بغیر افطار کئے روزہ نہ رکھا کرو لیکن آپ خاتم النبیین ﷺ خود صوم وصام رکھتے تھے بغیر کچھ کھائے، پندرہ پندرہ دن آپ خاتم النبیین ﷺ کا مسلسل روزہ ہوتا۔ صحابہؓ نے عرض کیا "یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ہمیں تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے اور خود آپ خاتم النبیین ﷺ صوم وصام رکھتے ہیں"

،اس پر آپ خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا! "تُم میں میرے جیسا کون ہے؟ مجھے تو میرا پروردگار کھلاتا اور پلاتا ہے"۔(صحیح بخاری)

یہ کھلانا اور پلانا کیسا؟، یہ اُس کے ذکر کی طاقت کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے کہ کلامِ خُداوندی میں اللہ تعالیٰ کے ذکر میں بھرپور انرجی اور طاقت ہے۔تو کھلانا اور پلانا، پلاوَ زردہ کا نہیں تھا بلکہ ذکراللہ کی توانائی تھی۔جو روح میں اُتر جاتی ہے اور بندہ توانا رہتا ہے۔اِس لیے کہ اگر روح زندہ رہے تو بندہ خودبخود زندہ رہتا ہے

تو اللہ کا ذکر جب رگ و پے میں بس جائے تو غذا کی حاجت نہیں رہتی،زندگی کا دارومدار ذکر پر ہو جاتا ہے۔تو ذکرِ حق سے آدمی زندہ رہتا ہے،تو اصل زندگی ،اصل حیات اور بقا یادِحق کا نام ہے۔

ذکراللہ کا عجیب اور عظیم ثمرہ:- پھر ذکر اللہ کا عجیب اور عظیم ثمرہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قانونِ مکافات ہے، یہ قانون دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی "یعنی بدلے کا قانون" یا ردوبدل کا قانون یعنی جیسا کروگے ویسا بھروگے، یعنی جیسا انسان خود کرے گا اللہ کی طرف سے بھی ویسا ہی معاملہ ہوگا۔یہ دنیا کے معاملے میں بھی جیسا دوسروں کے ساتھ کرے گا ویسا اُس کے ساتھ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: ترجمہ:"اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا"-(سورہ محمد،آیت نمبر 7)

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ: ترجمہ:" مجھے یاد کرو، مَیں تمہیں یاد کروں گا"۔(سورہ البقرہ،آیت نمبر 152)

تو جیسا ذکر بندہ کرے گا ویسا ہی ذکر رَب اُس کا کریں گے، تو ذاکر جب ذکر کرتا ہے تو انجام کار مذکور بن جاتا ہے۔اِدھر اِس نے ذکر کیا اُدھر اُس نے ذکر کیا تو مذکور بن گیا۔تو اِس لیے اگر آدمی چاہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کا تذکرہ رہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا تذکرہ شروع کردے،جتنا یہ یاد کرے گا اتنا ہی یاد کیا جائے گا۔دیکھئے اگر کسی بڑے حاکم،وزیراعظم یا پریذیڈنٹ کے یہاں ہمارا ذکر آجائے تو عزت اور افتخار سے ہمارا سر اونچا ہو جاتا ہے۔اخباروں میں چھاپتے ہیں کہ آج ہمارا تذکرہ وزیرِ اعظم یا پریزیڈنٹ کے ہاں ہوا تھا۔تو ایک بڑی ذات جو عزت والی کہلاتی ہے،کسی انسان کو یاد کرے تو یہ فخر کی بات ہوگی،حق تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے اُس کے ہاں کسی کا تذکرہ ہو تو یہ کتنے فخر کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو یاد کرے۔اور حق تعالیٰ کب یاد کریں گے جب بندہ اُس کو یاد کرے گا۔

اس لیے فرمایا گیا "تم مجھے یاد کرو مَیں تجھے یاد کروں گا"۔(سورہ البقرہ،آیت نمبر 152)

جو لوگ قرآن کریم کو یاد کرکے بھُلا دیتے ہیں-ان کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے:(سورہ طہٰ،آیت نمبر 126-125)

ترجمہ:"روزِ محشر وہ بندے قیامت کے دن نابینا اُٹھائے جائیں گے، وہ کہے گا یارب مجھے اندھا کیوں اُٹھایا گیا جبکہ مَیں تو دُنیا میں دیکھنے والا تھا،جواب دیا جائے گا کہ ہم نے اپنی آیات تیرے سینے میں ڈالیں تھیں تو نے اُنہیں بھلا دیا تھا،ہم نے تجھے بھلا دیا"۔

جو یہاں یاد رکھے گا یہ یاد وہاں کام دے گی۔جو یہاں بھول جائے گا وہ وہاں کسمپرسی کی حالت میں ہوگا۔اِس لیے یادِ خُداوندی یا ذکر اللہ نہ صرف کائنات کی روح ہے بلکہ یہ انسان کی بھی روح ہے۔اگر ذکر منقطع ہو جائے تو روح پر مُردنی چھا جاتی ہے، اگر احساس ہو فرق یہ ہے کہ سیاہ کپڑے پر ہزار دھبے پڑ جائیں نظر نہیں آتے کیونکہ کپڑا پہلے ہی سیاہ یا میلا ہے تو نظر کیا آئے گا؟ اور سفید کپڑے پر ذرا بھی داغ دھبہ لگ جائے تو وہ نمایاں ہو جاتا ہے،اور محسوس ہوتا ہے۔تو جن کے قلوب میں غفلتیں رچ بس گئیں ہیں تو اِن میں اگر دس غفلتیں اور آجائیں تو احساس نہیں ہوگا کیونکہ دل پہلے ہی غفلتوں میں رنگا ہوا ہے۔لیکن یاد کرنے والا ایک منٹ کے لیے بھی غافل ہوا تو اُسے احساس ندامت ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز میری چھِن گئی ہے۔**تو ذکراللہ یا یادالٰہی انسان کی روح اور زندگی ہے یہ نہ ہو تو آدمی کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔**

اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے کے ذرائع، یادِ حق کے طریقے بے شمار ہیں:

(1) پیارے نبی کی پیاری دعائیں

(2) صبح وشام کی تسبیحات (تیسرا کلمہ ۔پہلا کلمہ-استغفار-درود شریف-لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ ۔سُبۡحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمۡدِہٖ سُبۡحَانَ اللّٰہِ الۡعَظِیۡمِ-اللّٰہُ الصَّمَد)

(3) سُنتوں پر عمل (4) چلتے پھرتے ذکر (5) ہاتھ میں تسبیح رکھنا (یہ ذکر کرنا یاد دلاتی رہتی ہے)

خلاصہ یہ کہ زندگی صرف اور صرف ذکر اللہ ہے (یادالٰہی ہے) جب کائنات،نباتات،جمادیات،حیوانات کی زندگی اِس سے ہے تو انسان کی زندگی اِس سے کیوں نہ ہو۔تو انسان کو سب سے بڑا ذاکر بن کر زندہ جاوید ہو جانا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے! آمین

دیدار الٰہی

سورہ لانشقاق، آیت نمبر 6 میں فرمان الٰہی ہے: یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ

ترجمہ: ''اے انسان بے شک تجھ میں اپنے رب کو پا لینے کی کوشش کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ پس تو اس (اپنے رب) سے ملاقات کر سکتا ہے۔''

ترجمہ: ''اے انسان تو اپنے رب سے ملنے تک یہ کوشش اور تمام کام اور محنتیں کر کے اس سے ملاقات کرنے والا ہے''۔

(سورہ الفرقان، آیت نمبر 20) اَتَصْبِرُوْنَ وَکَانَ رَبُّکَ بَصِیْرًا

ترجمہ: ''آیا تم صبر کئے بیٹھے ہو؟ (اور اپنے اللہ کو پا لینے کی کوشش نہیں کر رہے ہو؟) حالانکہ تمہارا رب تمہاری طرف دیکھ رہا ہے''۔

(سورۃ الذاریات آیت 50) فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰهِ ترجمہ: ''پس دوڑو اللہ کی طرف''

(سورہ العنکبوت، آیت نمبر 69) وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا

ترجمہ: ''جو لوگ ہمارے قرب اور وصال کے لیے تگ و دو کرتے ہیں ہم انہیں اپنی طرف آنے کے راستے دکھا دیتے ہیں''۔

(سورۃ الانعام، آیت نمبر 31) قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ

''بے شک وہ لوگ خسارے کا شکار ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے لقا (دیدار، ملاقات) کا انکار کیا''۔

سلطان العارفین حضرت سلطان باہو دیدار الٰہی کے بارے میں فرماتے ہیں ''واضح ہو کہ اللہ کا دیدار قرآن اور حدیث کی رو سے تین طریق پر ہے۔

1۔ اللہ کا دیدار خواب میں روا ہے اسے نوری خواب کہتے ہیں۔

2۔ اللہ کا دیدار مراقبے میں جائز ہے۔ وہ مراقبہ جو موت کی طرح حضور مولیٰ میں پہنچا دے۔

3۔ کھلی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنا روا ہے کہ دیکھنے والے کا جسم اس جہان میں ہو اور جان لاہوت ولامکاں میں ہو۔ اللہ تعالیٰ کے دیدار کے یہ تمام مراتب مرشد کامل سے حاصل ہوتے ہیں۔ رسالہ روحی شریف میں درج ہے۔ ترجمہ: ''اور جس ایک تجلی سے موسیٰؑ سراسیمہ ہو گئے اور کوہ طور پھٹ گیا۔ ہر لحہ اور ہر پل میں جذبات انوار ذات کی ویسی ہی تجلیات ستر ہزار باران فقرا پر وارد ہوتی رہتی ہیں مگر وہ نہ دم مارتے ہیں نہ آہ بھرتے ہیں بلکہ مزید تجلیات کا تقاضہ کرتے رہتے ہیں''۔

قرآن مجید میں ایسے کئی مقامات آئے ہیں جہاں مختلف انبیاء کرام کو طالب مولا کے روپ میں پیش کر کے طالبان مولا کو رموز معرفت سکھائے گئے ہیں۔ ایسے واقعات محض طالبان مولا کی تربیت کی خاطر قرآن مجید میں وارد کئے گئے ہیں۔ ورنہ **تمام انبیاء کرام حق الیقین کے مرتبہ پر فائز تھے اور ہیں اور حق الیقین بے حجاب دیدار الٰہی کا مرتبہ ہے۔**

بقول علامہ اقبال کے ''مقام خودی (خود شناسی -- مقام فقر) پر پہنچ کر ذات الہیہ کو بے حجاب دیکھنے کا نام زندگی ہے''۔

یہ وہ کھلے حقائق ہیں جو دیدار الٰہی پر دلالت کرتے ہیں۔ البتہ دیدار الٰہی کی نعمت سے سرفراز ہونے کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کا پورا ہونا بے حد ضروری ہے۔

1۔ طلب الٰہی کے علاوہ ہر قسم کی طلب کو ترک کرنا

2۔ دیدار الٰہی سے مشرف مرشد کامل کی محبت

3۔ شریعت مطہرہ کی مکمل پیروی میں دائم، تصور اسم اللہ ذات کی پابندی اس طرح کہ تصور اسم اللہ ذات میں طالب کا وجود گم ہو کر رہ جائے۔

بقول حضرت سلطان باہوؒ کہ ''اسم اللہ ذات اور طالب کا جسم جب یک جان ہو جائیں تو طالب کے وجود میں جو راز پنہاں (ذات الٰہی کا نور) ہے وہ ظاہر ہو جاتا ہے''۔

حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں کہ انسان کے وجود میں اللہ تعالیٰ اس طرح پوشیدہ ہے کہ جس طرح پستے کے اندر مغز چھپا ہوا ہے۔ اب ہم دیدار الٰہی کو سمجھنے کے لیے سیدنا غوث الاعظم حضرت شیخ سید عبدالقادر جیلانیؓ کا فرمان نقل کرتے ہیں۔ آپؓ فرماتے ہیں ''اللہ تعالیٰ نے جب اپنے ظہور (ظاہر ہونے کا) کا ارادہ فرمایا تو سب سے پہلے سرور دو عالم حضرت محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی روح اقدس کو اپنے نور جمال سے پیدا فرمایا۔ پھر روح محمد خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام ارواح (ارواح انسانی) کو عالم لاہوت (انوار ذات الٰہی کا عالم) میں احسن وحقیقی صورت میں پیدا فرما کر لاہوت کو ارواح کا اصلی وطن بنایا تا کہ مشاہدہ جمال ذات کے ذریعہ ارواح اس کی محبت میں قرار وسکون حاصل کر سکیں۔ اپنے اصل وطن لاہوت میں انسان کا نام روح قدسی ہے۔ یہاں اس کا وجود خالص نور ذات سے ہے۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے اسے''

اپنی روح''، یعنی اپنا جوہر قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے

وَ نَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ (اور اس میں میں نے اپنی روح پھونکی) (سورۃ الحجر، آیت نمبر 29)

انسان کی اسی صورت کو اللہ تعالیٰ نے فی احسن تقویم اور انسان کے اس روپ کے متعلق حضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:

خلق اللہ ادم علی صورتہ (اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا)

اور اس کی صفت یوں بیان کی وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا (اور آدم کو کل اسماء کے نور سے مزین کیا گیا) (سورۃ البقرہ، آیت نمبر 31)

انسان کی ہی وہ صورت ہے جس میں ذات الٰہی کو بے حجاب دیکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ چار ہزار سال تک ارواح قدسی عالم لاہوت میں مشاہدہ جمال ذات سے مشرف ہو کر عشق الٰہی میں محو رہیں۔ چار ہزار سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے امر ''کن'' فرما کر حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کے نور سے اپنی صفاتی پہچان کے لیے کائنات کے مختلف عالم کو پیدا فرمایا چونکہ تخلیق کائنات کا تمام مرحلہ حضرت انسان کی نظر کے سامنے وقوع پذیر ہوا اس لیے سلطان باہوؒ نے اس منظر کو یاد کرتے ہوئے فرمایا:

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے ''امر کن'' فرما کر کائنات تخلیق فرمائی تو ہم بھی اس وقت اللہ تعالیٰ کے قرب (عالم لاہوت) میں موجود تھے۔''

اس کے لیے پیر مہر علی شاہ نے فرمایا ترجمہ: ''کن فیکون'' کا مرحلہ تو کل کی بات ہے، ہم تو اس سے بہت پہلے عشق الٰہی کا شکار ہو چکے تھے''۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات معرفت (پہچان کروانے کے لیے) کے تین جہان پیدا فرمائے۔

1۔ عالم ناسوت: یہ جہان اجسام کا جہان ہے جس میں ہم تم رہتے ہیں۔

2۔ عالم ملکوت: یہ جہان، عالم جبروت سے نیچے ہے جہاں ملائکہ محو کار ہیں۔

3۔ عالم جبروت: جبر و قدر کا جہان، حضرت جبرائیلؑ کا مقام۔ اس کی انتہائی حد سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ اس میں جنت الفردوس ہے۔ لوح محفوظ ہے، یہ جہان انوار ذات الٰہی کے جہاں عالم لاہوت سے نیچے ہے۔ مگر انوار صفات الٰہی کا یہ سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ مقام ہے۔ جب یہ تینوں جہاں اللہ تعالیٰ نے خلق خدا کے لیے پیدا فرما دیئے۔ تو انسان کو انوار صفات الٰہیہ کی معرفت حاصل کرنے کے لیے نیچے اتارا گیا۔

(1) سب سے پہلے انسان (روح قدسی) کو نور جبروت کا لباس (جبروتی) پہنا کر عالم جبروت میں بھیجا گیا۔ اگر اسے نور جبروت کا لباس نہ پہنایا جاتا تو انسان کے انوار سے عالم جبروت جل اٹھتا اور یہ باقی نہ رہ پاتا۔ عالم جبروت میں انسان کا نام "روح سلطانی" مشہور ہوا۔ اس روپ میں اسے جہان بینی و جہاں بانی کی تعلیم سے سنوارا گیا۔ پھر اسے عالم جبروت سے نچلے جہانِ عالم ملکوت میں نور ملکوت کا لباس پہنا کر بھیجا گیا۔ یہاں یہ روح روحانی یا "روح سیرانی" کے نام سے موسوم ہوا اور اسے آداب بندگی کی تعلیم سے سنوارا گیا۔ اس کے بعد اسے کائنات کے سب سے نچلے طبقے عالم ناسوت میں یہ کہہ کر بھیجا گیا۔

ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ (سورہ التین، آیت نمبر 5)

پھر اسے کائنات کے سب سے نچلے طبقے میں بھیج دیا گیا۔ یہاں اسے نور ملک کا لباس (گوشت پوست اور ہڈیوں کا جسم) یہاں اس کا نام "روح جسمانی" رکھا گیا۔ اب چونکہ اپنے اصل وطن عالم لاہوت میں تو انسان خالص نوری حالت میں تھا اس کی خوراک بھی نور تھی۔ یعنی انوار ذات الٰہی ہی اس کی خوراک تھی لیکن جب عالم خلق میں بھیجا گیا تو ہر طبقے میں اس کے جسم کے مطابق اس کی روزی کا حساب رکھا گیا۔

عالم جبروت میں جنت الفردوس کی نعمتیں اس کے جبروتی جسم کا رزق بنیں۔ عالم ملکوت میں جنت النعیم کی نعمتیں اس کے ملکوتی جسم کا رزق بنیں اور عالم مَلک میں جنت الماویٰ کی نعمتیں اس کے مَلکی جسم کا رزق بنیں اور عالم اجسام میں یعنی عالم ناسوت میں دنیا کی نعمتیں اس کے سفلی ناسوتی جسم کا رزق بنیں۔ اب انسان کا اصل ہدف یہ ہے کہ سب سے پہلے علم شریعت اور اعمال شریعت کے ذریعے جنت الماویٰ میں پہنچ کر عالم ملک میں موجود انوار صفات الٰہی کی معرفت حاصل کرے اور جب یہ حاصل ہو جائے تو اسے چھوڑ دے اور آگے بڑھ جائے اور پھر۔

(2)۔ علم طریقت اور اعمال طریقت کے ذریعے عالم ملکوت میں جنت النعیم تک پہنچے اور وہاں انوار صفات الٰہی کے اعلیٰ درجات سے بہرہ ور ہو اور پھر اسے بھی چھوڑ دے اور پھر۔

(3)۔ علم معرفت اور اعمال معرفت اختیار کر کے عالم جبروت میں جنت الفردوس میں پہنچے اور انوار صفات الٰہی کے اعلیٰ ترین درجات کو پالے اور پھر اسے بھی چھوڑ دے۔

(4)۔ اور خلق کے دائرے سے نکل کر علم حقیقت اور اعمال حقیقت کے ذریعے عالم لاہوت میں پہنچ کر اپنے اصلی ٹھکانے پر انوار ذات الٰہی سے بے حجاب مستفیض ہو۔

عالم ناسوت سے لے کر عالم جبروت تک۔ جسم اور بشریت اس کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں لیکن عالم جبروت سے آگے عالم لاہوت میں خلق کی کوئی شے داخل نہیں ہوسکتی کہ انوار ذات الٰہی اسے جلا ڈالتے ہیں۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے بشریت کو فنا کرنا پڑتا ہے۔ بشریت کو فنا کرنے کے عمل کو ''موتو قبل ان تموتوا'' کہا گیا ہے۔ یعنی موت سے پہلے موت۔ جب تک بشریت کو فنا نہیں کریں گے نفس اور شیطان سے چھٹکارا ناممکن ہے لیکن جب انسان عالم جبروت کے سرحدی مقام سدرۃ المنتہیٰ سے آگے بڑھتا ہے تو شیطان و نفس اس کا پیچھا چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ عالم لاہوت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ یہاں انسان مخلص بن جاتا ہے۔ اسی مقام لاہوت کے باسیوں کے متعلق تو شیطان نے کہا تھا کہ ''اے رب مجھے تیری عزت کی قسم میں ان لوگوں کو ضرور اغوا کروں گا مگر تیرے مخلص بندے میری پہنچ سے باہر ہوں گے''

سید غوث الاعظمؒ نے فرمایا ''اللہ کی معرفت دو قسم کی ہے۔

1۔ معرفت صفات الٰہیہ اور 2۔ معرفت ذات الٰہیہ

معرفت صفات الٰہیہ :- معرفت صفات دونوں جہان میں اس جسم کا حصہ ہے اور یہ درجات ہیں۔

پہلا درجہ: جنت الماویٰ ہے جو عالم ملک میں واقع ہے۔ اور اس کا حصول علم شریعت اور اعمال شریعت کے بغیر ناممکن ہے۔

دوسرا درجہ: جنت النعیم ہے اور عالم ملکوت میں ہے اس تک انسانی رسائی علم طریقت اور اعمال طریقت کے بغیر ناممکن ہے۔

تیسرا درجہ: جنت الفردوس ہے جو عالم جبروت میں ہے اور اس تک پہنچنے کے لیے علم معرفت اور اعمال معرفت لازمی ہیں۔

معرفت ذات الٰہیہ :- معرفت الٰہی آخرت میں روح قدسی کا حصہ ہے یعنی اس کے لیے مرنے سے پہلے مرنا ضروری ہے یعنی عالم جبروت سے آگے بڑھ کر عالم لاہوت میں پہنچنا ضروری ہے جہاں جنت قرب ہے۔ جس میں حور قصور اور لذات بدن قطعاً نہیں ہیں۔ وہاں صرف انوار ذات الٰہی کے جلوے ہیں جن میں انسان سکون و قرار پکڑتا ہے اور ہر دو جہاں کی آرزوں سے نجات پا جاتا ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے عمل حقیقت اور اعمال حقیقت اختیار کرنا ضروری ہے۔ عالم لاہوت سے نیچے کسی بھی مقام پر رک جانا انسان کے لیے بہت بڑا خسارہ ہے۔ جنت الماویٰ یا جنت النعیم یا جنت الفردوس کے رزق پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا انسان کی ناکامی ہے۔ جب تک انسان عالم لاہوت میں انوار ذات سے بہرور نہیں ہوتا اس وقت تک وہ ناکام ہے۔

علامہ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

سیدنا غوث حمدانی عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں کہ معرفت الٰہی دل کی آنکھ کھلنے سے حاصل ہوتی ہے۔ دل کی بھی دو آنکھیں ہیں۔

1- عین صغریٰ 2- عین کبریٰ

1- عین صغریٰ:- جب عین صغریٰ کھلتی ہے تو انسان کو معرفت صفات الٰہی نصیب ہوتی ہے-

2- عین کبریٰ:- جب عین کبریٰ کھلتی ہے تو انسان کو معرفت ذات الٰہی نصیب ہوتی ہے۔

اکثر لوگوں کو قرآن مجید کے اس بیان نے الجھا کر رکھ دیا جس میں موسیٰ علیہ السلام طلب مولا میں مشتاقِ دیدار ہو کر دیدار الٰہی کی التجا کرتے ہیں۔ اس واقعے سے یہ قطعی نتیجہ اخذ کر بیٹھتے ہیں کہ جب ایک نبی دیدار الٰہی سے معذور ہے تو ہم تم اس قابل کہاں؟ حالانکہ معاملہ صرف اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کے ذریعے طالب مولا کے ایک مقام کو واضح فرمایا ہے کہ طالب پر ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جہاں وہ اپنی منزل کو بہت قریب محسوس کرتے ہوئے عجلت پسندی پر اتر آتا ہے جس کی وجہ سے اسے ندامت اٹھانی پڑتی ہے۔ موسیٰؑ کو معرفت صفات الٰہی کے انتہائی مقام پر جب آگے بڑھنے کی طلب ستاتی ہے تو وہ فوری طور پر انوار ذات الٰہی سے مستفیض ہونے کی طلب میں بے قرار ہو کر التجائے دیدار کرنے لگتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ ابھی ٹھہرو، عجلت مت کرو۔ یہاں موسیٰؑ کی ذات کو بطور طالب مولا استعمال کیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت حال اس سے مختلف ہے۔

قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کچھ واقعات مدرج ہیں جو انہیں راہ سلوک میں پیش آئے۔ اگر ان کا ظاہری الفاظ والا مطلب لیا جائے تو انسان کفر کی حالت میں چلا جاتا ہے۔ مثلاً باطنی مشاہدہ کی اہمیت اہل ایمان پر واضح کرنے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک واقعہ یوں بیان کیا گیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سوال کرتے ہیں۔ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ط

’’اے میرے رب مجھے دکھا تو سہی کہ تو مردوں کو زندہ کیونکر کرے گا؟(سورۃ البقرہ آیت نمبر 260)

اللہ تعالیٰ نے جواب دیا اَوَلَمْ تُؤمِنْ ’’کیا تیرا اس بات پر ایمان نہیں ہے‘‘حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا "بلیٰ" ’’اے میرے مالک کیوں نہیں‘‘میرا ایمان تو ہے-----وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ’’لیکن میں اپنے دل کو مطمئن کرنا چاہتا ہوں‘‘　(سورہ البقرہ، آیت نمبر 260)

یہاں بھی طالب مولا کو سکھایا جا رہا ہے کہ ایمان کا دارومدار دل کی تصدیق پر ہے اور دل اس وقت تک تصدیق نہیں کرتا جب تک مشاہدہ نہ کرے، مشاہدے کے بغیر دل معترض رہتا ہے اور شیطان مختلف وساوس کے ذریعے ایمان کو ضعف پہنچاتا رہتا ہے لیکن مشاہدہ کر لینے کے بعد شیطان کے بہکاوے کا امکان ختم ہوجاتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا ایک واقعہ اس سے بھی زیادہ چونکا دینے والا ہے۔اول یہ کہ وہ ستارے کو دیکھ کر اپنا رب مان لیتے ہیں پھر اس کے ڈوب جانے پر اپنا نظریہ بدل لیتے ہیں۔پھر چاند اور سورج کو دیکھ کر بھی پکار اٹھتے ہیں کہ یہ میرا رب ہے لیکن ان کے ڈوبنے پر اس اعتقاد سے دست بردار ہوجاتے ہیں۔ظاہر بین حضرات یہاں بھی تذبذب کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں اور مختلف عقلی توجیہات پیش کرتے ہیں۔یہاں بھی طالب مولا کو راہِ سلوک میں جن تجلیات سے واسطہ پڑتا ہے ان کا بیان ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو طالب راہ سلوک کے طالب علم کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مقام ملک یا مقام ناسوت میں طالب پر تجلی نفس اس طرح وارد ہوتی ہے کہ اسے انوار الٰہی نظر آنے لگتے ہیں۔جو روشن چمکدار ستارے کی مانند نظر آتے ہیں اور طالب مولیٰ سمجھتا ہے کہ یہی انوار ذات الٰہی ہیں اور پکار اٹھتا ہے کہ میں نے رب کو پالیا لیکن کچھ عرصے کے بعد طالب جب ترقی کر کے آگے بڑھتا ہے تو تجلی نفس پیچھے رہ جاتا ہے۔اور وہ معدوم ہو کر رہ جاتی ہے۔تو طالب جان لیتا ہے کہ وہ تجلی نور ذات کی تجلی نہ تھی۔جسے وہ خواہ مخواہ تجلی نور ذات سمجھتا رہا۔

اس کے بعد سالک جب عالم ملکوت میں پہنچتا ہے تو اس پر تجلی قلب اس طرح وارد ہوتی ہے کہ اسے انوار اسماء حسنیٰ چاند کی طرح روشن نظر آتے ہیں تو یہ خوش ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ ’’اب میں نے انوار ذات کو پالیا ہے‘‘لیکن جب عالم ملکوت سے آگے بڑھ کر عالم جبروت کی طرف پرواز کرتا ہے تو یہ تجلی قلب بھی غائب ہوجاتی اور طالب پھر اس سے بھی دست بردار ہوجاتا ہے اور جب عالم جبروت میں تجلی روح اس پر وارد ہوتی ہے جس سے انوار صفات الٰہی نظر آتے ہیں جو سورج کی طرح روشن اور واضح ہوتے ہیں تو وہ اس تجلی کو تجلی ذات سمجھ کر اپنے اطمینان کا اظہار کر دیتا ہے کہ یہ میرے رب کے جلوے ہیں لیکن جب طالب اس سے بھی آگے عالم لاہوت میں پہنچتا ہے تو اس پر اصلی انوار ذات کی تجلیات کا نزول ہوتا ہے جو بے کیف و بے جہت و بے چون و بے چگون ہوتی ہیں اور وہ نہ تو معدوم ہوتی ہیں اور نہ زائل ہوتی ہیں تو طالب جان لیتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی حقیقی اور ذاتی تجلیات ہیں اور انہی اصل و حقیقی تجلیات ذات میں وہ اصلی توحید کے مرتبے پر فائز ہو کر خالص موحد بنتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ ’’اب میں اللہ تعالیٰ کے ذاتی نور کی طرف متوجہ ہو گیا ہوں اور باقی تمام انوار کے شرک سے چھٹکارہ پا چکا ہوں‘‘۔

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ　(سورۃ الانعام، آیت نمبر 79)

ترجمہ: ’’میں نے اپنا رخ اپنے رب حقیقی کی طرف پھیر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا یکسو ہو کر اور اب میں غیر معبودوں میں پھنسنے والا نہیں‘‘۔

لہٰذا **اس قسم کے بیانات جو قرآن حکیم میں مدرج ہیں تو ان کا مقصد صرف طالبان مولا کی تربیت اور راہنمائی ہوتا ہے نہ کہ انبیاء کرام کی معذوری و بے خبری سے عوام الناس کو آگاہ کرنا ہوتا ہے**۔(نعوذ باللہ)

اللہ تعالیٰ ہم سب کے حجابات دور فرمائے اور ہم سب کو اپنے انوار ذات سے مستفیض ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔(آمین) وماتوفیقی الا باللہ

****

مظہرِ ذات الٰہی (کائنات)

یہ کائنات جہاں آئینہ جمال ہے وہاں یہی کائنات مظہر ذات الٰہی اور مظہر صفات انسانیہ بھی ہے۔ کائنات میں رونما ہونے والا ہر واقعہ، ہر عمل اور ہر کرشمہ انسان کی داخلی اور ذاتی کائنات میں منعکس ہوتا ہے۔

اس کائنات کے سیاروں اور ستاروں کی چال اور رفتار سے لے کر ایک معمولی سی حقیر چیونٹی تک ہر شے اپنے اندر ایک عجب پیغام رکھتی ہے۔ اللہ نے اپنی ذات کی پہچان کے لئے غور و تدبر کے لیے کہا ہے۔ انسان اپنے اندر اس کائنات پر غور کرے تو بہت کچھ نظر آ جاتا ہے۔ ہاں تدبر والا ذہن اور بینا آنکھوں کی ضرورت ہے۔ یہ کائنات مرقع نور ہے۔ اس پر لکھنے والوں کے قلم ہمیشہ خشک ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کے مشاہدات ختم ہی نہیں ہوتے۔ یہ غیر محدود مشاہدات ہیں، کہکشاؤں کے عظیم اور وسیع سلسلے، شمس و قمر کے جلوے، چمکنے والے ستاروں کی یہ حسین کائنات اتنی منور ہے کہ یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ اس کو تخلیق کرنے والا خود ہی تو اس کائنات کا نور ہے۔ وہ ہی تو زمین اور آسمان کا نور ہے۔ اس کے پرتو (عکس) سے یہ زمین منور ہے اتنی روشن، کائنات ایک روشن دلیل ہے اپنے نورانی خالق کی۔

اگر تمنا حاصل سے زیادہ ہو تو اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ انتشار پیدا ہوتا ہے۔ ہاں اگر حاصل تمنا سے زیادہ ہو تو سکون کا باعث بن جاتا ہے ایسے انسان ہمیشہ ہی مطمئن رہتے ہیں۔ انسان کماتا ہے تاکہ زندہ رہے۔ اور زندہ رہتا ہے کہ کماتا رہے۔ ہم اس جہاں میں کیسے گزارا کر رہے ہیں؟ ہم نے شاید سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ یہ اتنی بڑی کائنات اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے بنائی ہے ضرور بنائی ہے لیکن ذرا سوچ تو سہی کہ اس باری تعالیٰ نے ہمیں اپنے لئے بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غور کرنے کے لئے کہا ہے، سوچنے کے لئے کہا ہے لیکن ہم نے تو شاید سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اچھا کیا ہے بہت اچھا کیا ہے۔ سوچنا بہت بُری بیماری ہے۔ ایسی بیماری جس کا علاج نہیں ہے، سوچنے والے کو کبھی رات کو سورج نظر آتا ہے کبھی دن کو تارے نظر آتے ہیں۔ وہ ہر شے کو ایک زاویے سے دیکھتا ہے۔ سوچنے والا الفاظ کے معنی ہی نہیں معنی کے چہرے بھی دیکھ لیتا ہے۔ اور پھر ان چہروں سے محو کلام ہوتا ہے۔ ''چہرے کے معنی'' اور ''معنی کے چہرے'' عجب بات ہے۔ اس لیے کہ سوچنے والوں کی دنیا، دنیا والوں کی سوچ سے الگ ہوتی ہے۔ ہم نے اچھا کیا کہ ہم سوچتے ہی نہیں ہو۔ ہم سوچ سے نکل گئے۔ اب ہم عمل ہی عمل ہیں۔ بے وجہ اور بے نتیجہ عمل۔ ہم مصروف ہیں اور شاید ہم مصروف ہی رہنے کو کامیابی سمجھتے ہیں۔ مصروف، مشین کی طرح۔ دریا کی طرح، چیونٹی کی طرح گردش املاک اور گردش حالات کی طرح۔ ہم سوچ میں وقت ضائع نہیں کرتے کیونکہ ہمارا وقت بیش قیمت ہے۔ ہمیں حرکت دینے والی طاقت کے لئے کام ضرورت ہے اور ضرورت کا پجاری کثرت پرست ہوتا ہے اور کثرت پرست کو سوچ، تدبر اور تفکر مل ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ ایسا انسان وہی کچھ حاصل کر سکتا ہے جو وہ کر رہا ہے۔ دنیا کی ضرورتیں جس کے لئے وہ محنت کر رہا ہے۔

اگر ذوق نظر میسر ہو تو انسان دیکھے گا کہ یہ کائنات ایک عجب تماشا ہے۔ کرنوں میں آفتاب ہیں، قطروں میں بحر ہیں، دریا شباب میں ہیں، ذروں میں دشت ہیں، ہاں کائنات کی وسعتوں کے بارے میں جو کچھ کہہ دیا جائے بلا مبالغہ ہوگا۔ ہم ایک سورج سے وابستہ ہیں۔ اور اس کائنات میں ایسے کروڑوں سورج موجود ہیں۔ ایسے سیارے اور ستارے دریافت ہو چکے ہیں جن کا زمین سے فاصلہ ہزاروں لاکھوں ''نوری سال'' ہے۔ یعنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلنے والی روشنی ایک ستارے سے زمین پر آنے میں لاکھوں سال لیتی ہے۔ اللہ اللہ یہ وسعت۔ انسان سوچ کر ہی سہم جاتا ہے۔ اس وسیع کائنات میں زمین کی کیا حیثیت، اور زمین میں ایک ملک کی کیا اہمیت؟ اور ملک میں ایک شہر اور شہر میں ایک مکان۔ اور اس مکان میں ایک انسان۔ پھر اس انسان میں ایک چھوٹا سا دماغ۔ کیا جسارت کرے گا اس وسیع کائنات کے عظیم خالق کے بارے میں لب کشائی کرنے کی۔ مقام تحیر اور مقام سکوت ہے۔ کہاں ہم اور کہاں ہمارا تدبر اور تفکر؟ کہاں میں اور کہاں دیر و حرم کا کشمکش نقشہ؟

اسی کائنات میں ایسے علاقے ہیں جہاں اتنی سردی ہے کہ بس انسان ذکر کرے تو خیال منجمد ہو جائے، اور کہیں اتنی حدت ہے کہ سورج بھی پناہ مانگے۔ یہ کائنات عجیب ہے۔ تخلیق اپنے خالق کی مظہر ہے۔ **جس خالق نے اس کائنات کو تخلیق کیا اس کو حیران کن مظہر بنایا۔ اسی خالق نے انسان کو بڑے دعوے اور وثوق سے اشرف المخلوقات پیدا فرمایا، یہ ایک عظیم احسان ہے۔ عظیم محسن کا۔ انسان کو بینائی عطا فرمانے والا، اپنے بے مثال حسن کے پرتو میں اس کائنات کی ہمہ رنگ نیرنگیوں اور رنگینیوں میں جلوہ گر ہے۔** انسان کی پہچان کے لئے اللہ تعالیٰ نے کائنات کو آسمان اور زمین کے حوالے سے ظاہر فرمایا۔ انسان اپنی ہستی کا سفر زمین پر ہی شروع کرتا ہے اور یہ سفر زمین پر ہی ختم بھی ہوتا ہے۔ انسان کے گرد پھیلی ہوئی زندگی اس کے علم کے وسیع ابواب میں اسے علم الاسماء عطا فرمایا گیا۔ وہ اسما سے اشیا کو پہچانتا ہے۔ پھر اشیاء سے مفاہم تلاش کرتا ہے اور پھر اسے ہر طرف پھیلے ہوئے سلسلے، اپنی صلاحیتوں اور صفات کے استعارے نظر آتے ہیں۔ انسان کی کائنات حسین و جمیل علامتوں کی کائنات ہے یہ

وہ راز ہے جو انسان کو جاننے والا بناتا ہے۔انسان ظاہر سے باطن اور باطن سے ظاہر کا سفر طے کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔وہ وجوہ سے نتائج اور نتائج سے وجوہ تلاش کرتا ہے۔وہ ہر شے کے اندر پنہاں اس جوہر کو ڈھونڈتا ہے جو اس شے کی پہچان ہے۔اس شے کا راز ہے، اور یہ راز اور یہ جوہر اور یہ صفت انسان کی اپنی کسی صفت کا مظہر ہوتی ہے۔

پہاڑوں کو انسانوں نے اپنے عزم کا مظہر کہا۔نہ بدلنے والا اٹل ارادہ۔پہاڑ کی طرح اپنی جگہ سے نہ ہلنے والا۔اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے:

ترجمہ ''پھر تمہارے دل سخت ہو گئے جیسے وہ پتھر ہوں، حالانکہ میں نے پتھروں سے بھی نہریں جاری کی ہیں''۔(سورہ البقرہ، آیت نمبر 74)

گویا پتھر سے دریا کا نکلنا ایسے ہے جیسے سخت دل انسان کا دل بھر آنا۔ یا کسی سخت دل کی آنکھ سے آنسو کا بہنا۔دریا کو زندگی کا دریا کہا گیا ہے۔جو موت کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ہر دریا آخر کار تاریک سمندر میں گر جاتا ہے۔اور لوگ تنکوں کی طرح اس دریا میں بہتے ہی چلے جاتے ہیں۔

''سمندر'' کو ہستی کا آغاز و انجام کہا گیا ہے۔انسان بادلوں کی طرح سمندر سے آتا ہے اور واپس سمندر میں چلا جاتا ہے۔یہی اس کا گھر ہے۔سمندر یا قلزم سے بڑے معنی وابستہ ہیں۔سمندر روح ہے۔یہ نصف شب کو جاگتا ہے۔طوفان میں ہو تو کناروں کو اُڑا دے، پُرسکون ہو تب بھی گہرائی کے خوف سے پُرخوف ہو۔سمندر مُردار کو باہر نکال پھینکتا ہے۔اِس کے باطن میں خزانے ہیں۔موتیوں کے، زندگی کے اور اس کے اندر انسان کے لئے بڑے علوم ہیں۔جب تک سمندر زندہ ہے، زندگی ختم نہیں ہو سکتی، سمندر گہرا ہے، کڑوا ہے۔**نا قابلِ تسخیر وسعت کو سمندر کہا گیا ہے۔فیاض اور علم کے پیکر کو بھی سمندر کہتے ہیں۔**

دیکھتے ہیں کہ انسان نے اپنے گرد رہنے والے جانداروں سے کیا حاصل کیا؟۔انہیں کیسے کیسے معنی دیے؟ ان سے کیا کیا سبق، کیا کیا عبرت اور کیا کیا نتائج نکالے؟، پرندوں کی دنیا میں شاہین کو لیجیے۔مردِ مومن ہی شاہین ہے پرندوں کی دنیا کا درویش ہے آشیانہ نہیں بناتا ہے۔بلند پرواز ہے، بلند نگاہ ہے۔پہاڑوں کی چٹانوں پر رہتا ہے، قصرِ سلطانی سے گریز کرتا ہے۔اس میں ایک مردِ حُر کی صفات عالیہ ہیں۔ایک آزاد قوم کے لئے شاہین ایک بہت بڑا استعارہ ہے۔سورج کو نگاہ میں نہیں لاتا۔مر جائے تب بھی زمین پر نہیں گرتا۔اس کی نگاہ آسمانوں پر رہتی ہے۔اس کا رزق صالح اور پاکیزہ ہے۔یعنی یہ زندہ کبوتر شکار کرتا ہے۔شاہین مانگ کر نہیں کھاتا کسی کا نہیں کھاتا۔کسی کا بچا ہوا نہیں کھاتا۔مردار نہیں کھاتا غیرت والا ہے، متوکل ہے، قوی ہے، جھپٹتا ہے، پلٹتا ہے، خون گرم رکھتا ہے، نگاہ تیز رکھتا ہے، درویشی میں بادشاہی کرتا ہے۔اور بادشاہی میں درویشی کرتا ہے۔اقبال کا شاہین ہی اقبال کا مردِ مومن ہے۔اقبال نے جوانوں میں عقابی روح کے بیدار ہونے کی دعا کی ہے۔عقابی روح کا کام ہے آسمانوں کی طرف پرواز کرنا اور پھر شہبازِ لامکاں، شہبازِ طریقت، شہبازِ خطابت اور پھر ہمارے شاہین، یعنی ہماری ائیر فورس۔ایک پرندے نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا۔یہی خودی ہے۔

خودی کیا ہے؟ بقول اقبال ''خودی ایک پراسرار طاقت ہے جو پہلے ضمیر وجود میں جنم لیتی ہے اور پھر ساون کی گھٹا کی طرح حیات پر چھا جاتی ہے۔اس سے دیدہ دل میں نور آتا ہے اور محویت اور مستی کی دولت ملتی ہے۔صاحبِ خودی کی توجہ من کی طرف ہو جاتی ہے۔ گویا خودی خود شناسی ہے۔وہ خلوت پسند بن جاتا ہے اور رفتہ رفتہ ایسی فضاؤں میں پہنچ جاتا ہے جہاں دوش و فردا کی پابندی نہ ہو۔خودی کی ناؤ امواجِ حوادث کے تھپیڑے سہتے اور تلاشِ مطلب کی راہیں بدلتے ہوئے مسلسل سر گرمِ سفر رہتی ہے اور ہر منزل کو ٹھکرا کر آگے بڑھ جاتی ہے۔خودی دل کی گہرائیوں سے وہ قوت حاصل کرتی ہے کہ سمندروں کو ایک ڈانٹ سے خشک اور پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

خودی ہر مقام پر اپنا رنگ بدلتی ہے۔یہ ازل سے ظہورِ کامل کے لئے بے تاب تھی اس نے ہزار مناظر تلاش کئے، کوہساروں میں عظمت، سمندروں میں جلال، مہ و انجم میں نور اور رگِ تاک میں سرور بن کر سمائی لیکن مطمئن نہ ہوئی۔بالآخر جب پیکرِ آدم میں جلوہ گر ہوئی تو کائنات میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔عرش کے باسیوں نے پردگیانِ لامکاں کو آواز دی۔''ہوشیار ہو جاؤ کائنات میں ایک صاحبِ نظر پیدا ہو گیا ہے، جس کی نگاہ تماشا بین سے اب تم نہاں نہیں رہ سکتے اور خودی (زندگی) نے اللہ کا شکر ادا کیا ہے کہ اسے عیاں ہونے کا ایک راستہ مل گیا۔**خودی ایک سنگم ہے جہاں سے کئی راہیں نکلتی ہیں، ایک راہ سیاست کی ہے، ایک دنیا کی، ایک علم و حکمت کی، ایک دنیائے دل کی۔ہر جاندار اور بے جان چیز کی خودی مختلف مراحل سے گزر کر کامل بنتی ہے۔**

ہلال کا کمال یہ ہے کہ وہ بدر منیر بن جائے۔کلی کا کمال یہ ہے کہ وہ پھول بن کر فضائے چمن میں لہلہائے۔ذرے کا کمال یہ ہے کہ وہ طواف کرتے کرتے خورشید تک پہنچ جائے اور قطرے کا کمال یہ ہے کہ وہ گوہر بن جائے۔یعنی جب تک کوئی شئے تکمیل کے تمام مراحل،تمام منازل طے نہ کرلے اس کی خودی نہاں (چھپی) رہتی ہے۔انسان رب کائنات کی بہترین تخلیق ہے۔اس لیے کہ انسان کی مختصر سی ہستی میں لامحدود امکانات مضمر ہیں۔یہ علم کی کمند پھینک کر تماشائے صفات باری تعالیٰ کے ساتھ ساتھ مشاہدہ ذات بھی کرسکتا ہے۔طُور پر برق تجلی کا رقص دیکھنے والا ایک انسان ہی تھا۔حضور خداوندی میں :

مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَاطَغٰی (سورۃ النجم، آیت نمبر 17)

ترجمہ:"اس (خاتم النبیین ﷺ) کی آنکھ نے نہ غلطی کی اور نہ بھٹکی۔"

مَاکَذَبَ الْفُؤَادُمَارَاٰیٓ (سورۃ النجم، آیت نمبر 11)

ترجمہ:''اس (خاتم النبیین ﷺ) کے دل نے اُس کے مشاہدے کی تصدیق کی''۔

یہ سند ایک بشر کو ہی ملی تھی۔

"مشاہدہ صفات" اس آنکھ کا کام ہے جس میں علم سے نور پیدا ہوتا ہے اور "مشاہدہ ذات"، اس آنکھ کا جو صرف عشق سے کھلتی ہے۔

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایک ایسی ذات سے عشق ہوسکتا ہے؟ جو نہ صرف آنکھوں سے پنہاں ہے بلکہ قوت متخیلہ بھی اس کی کوئی تصویر نہیں کھینچ سکتی؟ ہاں ممکن ہے۔کیا ہم تاج محل کو دیکھ کر معمار کی تعریف نہیں کرتے؟ کیا ہم ایک عمدہ غزل پڑھ کر شاعر کو داد نہیں دیتے؟ کیا ہم ایک دل کش ریکارڈ سن کر واہ واہ نہیں کرتے۔کیا ہم غالب، رومی، حافظ، سینا، اور رازی جیسے باکمال افراد سے بن دیکھے محبت نہیں کرتے؟ کیا ہم شام صحرا کے سکوت میں غروب آفتاب کا مست ساز منظر اور ریت کے ٹیلے پر آہو کا بے پرواخرام دیکھ کر وجد میں نہیں آجاتے؟ جب بہار کی رنگینیوں سے دامن کوہسار، ارم بن جائے، جب نیلی نیلی فضاؤں میں اودی، اودی گھٹائیں لہرانے لگتی ہیں تو ہم بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں، واہ، واہ، سبحانہ اللہ اِسی کا نام تسبیح ہے۔**اس تسبیح میں گہرائی آجائے تو عبادت بن جاتی ہے اور جب عبادت میں گہرائی آجائے یہی عبادت بالآخر عشق میں تبدیل ہوجاتی ہے۔**

خودی کو دو ہی چیزیں محکم بناتی ہیں علم اور عشق۔خودی نہ جسم کا نام ہے نہ روح کا بلکہ یہ ایک قوت ہے۔جو ضمیر ہستی میں نہاں ہے۔جو غور وفکر، آہ سحر گاہی اور گریہ نیم شبی سے عیاں ہوتی ہے۔تو یہی شاہین بھوک سے مرجاتا ہے لیکن مردار نہیں کھاتا۔یہ شاہین صفات مومن کا مظہر ہے اور خودی کا نگہبان ہے۔تو انسان کی خودشناسی نے پرندوں کو بڑی آسانیاں عطا فرمائی ہیں۔اب شاہین کے بعد ہم گدھ یا کرگس کو دیکھتے ہیں۔آج کے ادب میں گدھ ایک عظیم استعارہ اور علامت بن کے ظاہر ہوا ہے۔

ایک ڈرامہ میں ایک منظر دکھایا گیا ایک امیر آدمی مر رہا ہے اور اس کے رشتہ دار اس کے پاس خاموش بیٹھے ہیں۔کٹ کر کے دوسرا منظر پیش کیا گیا۔ایک ویرانے میں ایک گھوڑا مر رہا ہے۔اس پر گدھ منڈلا رہے ہیں۔اب گدھ کے بارے میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔گدھ کی بلند پروازی مردار کی تلاش میں ہے۔جن درختوں پر دن کے وقت چمگاڈر الٹے لٹکتے ہیں انہی درختوں پر رات کو گدھوں کا بسیرا ہوتا ہے۔یہ تعلق اور یہ تقرب بھی بڑا بامعنی ہے۔گدھ کی مردار خوری فضا کو آلودگی اور تعفن سے بھی بچاتی ہے۔بہرحال انسانوں کی دنیا میں کرگس (گدھ) صفت لوگ موجود رہتے ہیں اور ایسے لوگوں کا کرگسی عمل بھی جاری رہتا ہے۔

کبوتر اور فاختہ امن کے نشانات ہیں یہ صلح اور امن کے استعارے ہیں۔طوطا ایک ایسا پرندہ ہے جس پر بڑے بڑے ادیبوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔مولانا روم نے طوطے کی ایک کہانی لکھی ہے کہ'' ایک سوداگر کے پاس ایک بولنے والا طوطا تھا جو اس نے پنجرے میں بند کر کے رکھا ہوا تھا۔سوداگر ایک مرتبہ سفر پر جانے لگا تو اس نے طوطے سے کہا "اے طوطے تیری کوئی خواہش ہے تو بتا میں سفر پر جا رہا ہوں"۔طوطے نے کہا "ہاں جنگل میں رہنے والے میرے بھائیوں تک یہ پیغام پہنچانا کہ'' آزاد فضاؤں میں رہنے والو اپنے غریب قیدی کا سلام قبول کرو'' سوداگر نے یہ پیغام ایک گروطوطے کو دیا۔گروطوطا یہ سن کر مرگیا اور اس کے ساتھ ہی تمام طوطے گر کر مرگئے۔سوداگر بہت اداس ہوا اور واپس آکر یہ واقعہ اپنے طوطے کو سنایا۔یہ سننا تھا کہ طوطا بھی فوراً پنجرے میں گرا اور مرگیا۔سوداگر نے اسے پنجرے سے نکال کر پھینک دیا۔وہ طوطا اڑا اور دیوار پر بیٹھ کر بولا۔**اے سوداگر میرے گرو نے میری فریاد پر مجھے رہائی کا یہی طریقہ بتایا ہے کہ مرنے سے پہلے مرجاؤ۔آزاد ہوجاؤ گے۔'' پس یہ وہ راز ہے جو مرشد اپنے مرید کو دیتا ہے۔** بہرحال طوطا علم کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔

ایک معمولی سا'' کوا'' بھی لٹریچر کا حصہ بن گیا ہے'' کاں'' بنیرے پر بولتا ہے تو پھر پردیسی گھر آجاتے ہیں۔قمری، تیتر اور چکور آوازِ حق کے استعارے ہیں۔

اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے۔لوگ ان آوازوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔مورنفس کا وہ مقام ہے جہاں انسان اپنے رنگ پر ہی مست ہوجاتا ہے۔ظاہر پرست انسان مور ہے۔انا کا مارا ہوا اسی طرح جانوروں کو لیں۔''شیر'' اللہ کا شیر یعنی اسد اللہ۔ایک مقام ہے، ایک صفت ہے، ایک انداز ہے، شیر ربّانی ایک لقب ہے، ایک روحانی مقام ہے، ایک صفت ہے، ایک انداز ہے، شیر خواب میں نظر آئے تو روحانی فیض کی دلیل ہے۔(جبکہ نفس میں وہ صفات بھی ہوں) شیر بے باکی اور جرات کا مظہر ہے۔جہاں شیر دلیر ہے۔وہاں گیدڑ بزدل، لومڑی مکار، سانپ چھپا دشمن ہے۔وفا کے باب میں کتے اور گھوڑے کا ذکر آتا ہے۔ایک کتا اگر دوسرے کتے کا بیری نہ ہوتا تو کبھی نجس نہ ہوتا۔گھوڑے کو لٹریچر میں بڑا حصہ ملا ہے۔**مولانا غالب نے اپنے دو اشعار میں گھوڑے کو زندگی اور موت سے تعبیر کیا ہے۔زندگی کا سرکش گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا ہے۔انسان سوار تو ہے لیکن بے بسی کا یہ عالم ہے کہ نہ ہاتھ باگ پر ہے اور نہ پاؤں رکاب میں۔**

غرض یہ ہے کہ ہر جانور، ہر پرندہ، ہر شے انسان کے لیے معنی رکھتی ہے۔انسان غور کرے تو یہ کائنات علم کے وسیع خزانوں سے مالا مال ہے۔اس کو اپنا پرتو اور اپنے خالق کا جلوہ اسی کائنات میں نظر آئے گا۔یوسفؑ کے خواب میں آنے والے گیارہ ستارے، چانداور سورج ان کے اپنے بھائی اور ماں باپ تھے۔سبحان اللہ۔ یہ علم اس نے خود عطا کیا ہے۔جس نے انسان کو شاہکار تخلیق بنایا۔انسان کو شرف بخشنے والے نے انسان کو علم عطا کیا۔کائنات کا علم، کائنات کی اشیاء کا علم، کائنات کی زندگی اور کائنات کے حسن کا علم۔یہ کائنات ایک آئینہ ہے۔اس میں ہر طرف انسان کی اپنی صفات پھیلی ہوئی ہیں۔انسان غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ یہی کائنات انسان کا باطن ہے۔یہ کائنات ایک کھلی کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔سب حقیقت ہی حقیقت ہے۔معنی در معنی، استعارہ در استعارہ، علامت در علامت۔

انسان کی کائنات حسن، حسن کائنات کا خوبصورت عکس ہے۔''چاند'' محبوب ہے اور چاندنی محبوب کی یاد۔چاند دور ہو تو چاندنی پاس ہوتی ہے۔چاند پاس ہو تو چاندنی ختم ہوجاتی ہے۔پھول دل میں بسنے والا دوست ہے اور کانٹا آنکھوں میں کھٹکنے والا رقیب۔غرض یہ کہ لامحدود جلوہ۔کائنات میں موجود ہے۔انسان کی تلاش کے لیے اور "تلاش ذات" کے لیے اسی کائنات میں ایک مخفی اور حسین کائنات موجود ہے۔معنی کی کائنات---جلوؤں کی کائنات---انسان غور تو کرے۔

عیاں تھا جس کی نگاہوں پہ عالم اسرار
اسے خبر نہ ہوئی کیا ہوا پس دیوار؟

ہم نے تفکر و تدبر چھوڑ دیا ہے۔ہم اپنے علم پر نازاں ہیں۔ہم اپنی آواز پر مسحور ہیں۔اپنے افکار پر مست ہیں، اپنے لیے جو پسند کرتے ہیں دوسروں کے لیے وہ پسند نہیں کرتے۔**خوش نصیب ہیں کائنات پر تفکر کرنے والے۔خوش نصیبی کسی شے کا نام نہیں ہے۔خوش نصیبی ایک متوازن زندگی کا نام ہے۔نہ زندگی سے فرار نہ بندگی سے فرار۔خوش نصیب انسان حق کے قریب رہتا ہے۔**

مالک کا حکم نہ مانیں تو بڑے حکم ماننے پڑتے ہیں۔اس کی اطاعت نہ کرنے سے بڑی بڑی اطاعتیں کرنی پڑتی ہیں۔اس کو سجدہ نہ کرکے ہم اپنی آرزوؤں کے آگے سجدہ ریز ہوجاتے ہیں ایک ذات کی غلامی سے ہزار غلاموں سے نجات مل جاتی ہے۔انسان اگر غور کرے تو فنا کے دیس میں بقا کا مسافر ہے۔اس کا دل جلوۂ پرنور سے معمور ہے۔وہ اپنے آپ پر راضی، اپنی زندگی پر راضی، اپنے حال پر راضی، اپنے حالات پر راضی، اپنے خیالات پر راضی، اپنے اللہ سے راضی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راضی۔**سلام ہو غور فکر کرنے والوں کو، سلام ہو کائنات پر نظر کرنے والوں کو، سلام ہو خوش نصیبوں کی خدمت میں۔**

انسان سوچے تو سہی، غور تو کرے، یہ دریا رواں کیسے ہیں؟ چشمے کیسے ابل پڑتے ہیں؟ سمندر ساکن کیوں ہیں؟ آنکھ بنانے والا خود کتنا بصیر ہوگا؟ کان بنانے والا خود کیسی سماعت رکھتا ہوگا؟۔میں حیران ہوں کہ کسی درخت کا کوئی پتہ کسی پتے سے نہیں ملتا۔ہاتھی کو پیدا فرمانے والا، چیونٹی کو کیسے تخلیق کرتا ہے؟ دماغ بنانے والا کیا عقل رکھتا ہوگا؟ ایک لامحدود عقل جس کا تصور بھی محال ہے؟

گلشن دہر میں اگر جوئے مے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

****

فضلِ الٰہی

اللہ تعالی جب کسی پر فضل فرماتا ہے تو اس کا شرح صدر فرما دیتا ہے۔شرح صدر کی پہچان اس بندے کی آخرت کی طرف رغبت اور اس دنیا سے بے رغبتی ہوتی ہے پھر اسے آخرت کے علم کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

علم کا مطلب جاننا۔ ہم معلوم کو علم کہتے ہیں۔ جتنا معلوم زیادہ ہوتا جائے گا اتنا ہی احساس لاعلمی زیادہ ہوگا۔ اس لئے جاننے والے اکثر یہی کہتے ہیں کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔

علم کو نور بھی کہا گیا ہے اور علم کو حجاب اکبر بھی کہا گیا ہے۔ علم نور اس لیے ہے کہ علم پہچان کا ذریعہ ہے، آگہی اور ادراک کا باعث ہے۔ اسما و اشیا کا شعور ہے۔ ہمیں علم کی پہچان نہیں، مالک کی پہچان درکار ہے، خالق کو جاننا ہے۔ اپنے رزاق سے باخبر ہونا ہے۔ کائنات کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہونا ہے۔ حیات و مرگ کے رموز دریافت کرنے ہیں، وہ علم جو ہمیں چیزوں سے آگاہ کرے نورانی ہے۔ نورانی علم صرف یہ نہیں بتاتا کہ سبزہ کہاں سے آتا ہے؟ بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون پالتا ہے؟ نورانی علم نشان منزل کا علم ہے۔ تزکیہ وحکمت کا علم ہے، الجھنوں سے نجات کا علم ہے۔ کیف وجدان کا علم ہے سراسر رحمان کا علم ہے۔ جس علم سے غرور پیدا ہوا سے حجاب کہا گیا ہے۔ جو علم نگاہ سے محروم ہو وہ حجاب ہے، جو تعلق سے گریزاں ہو وہ علم حجاب ہے، جو اپنی انا کے خول سے باہر نہ نکلے وہ علم حجاب ہے۔ ابوجہل کے پاس علم تھا لیکن انا کا خول بے نگاہی کا سبب تھا۔ علم ہو اور نگاہ نہ ہو تو علم حجاب ہے، اگر نظر نہ ہو تو علم جہالت سے بدتر ہے۔

کائنات میں اتنے علوم ہیں کہ ان کی اقسام گنوانا دشوار اور ناممکن ہے۔ کچھ چیزوں کے بارے میں کچھ جاننا ممکن ہے بہت سی چیزوں کے بارے میں کچھ کچھ جاننا ممکن ہے، سب چیزوں کے بارے میں سب کچھ جاننا ناممکن ہے۔ علم لائبریریوں سے دست بردار ہونے کا نام ہے۔ لائبریریاں بلاشبہ معلومات کا خزانہ ہیں، کتابوں کا مطالعہ ایک اعلیٰ مصروفیت ہے لیکن کتاب زندگی نہیں ہے۔ زندگی تو آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی ہے۔ زندگی سانس کی نازک ڈور ہے۔ پل پل کٹتی جا رہی ہے۔ علم کتاب کا نام نہیں ہے۔ کتاب حقیقت کا عکس تو ہے، حقیقت کا مشاہدہ کتاب سے باہر ہے---- نظارہ اور مشاہدہ علم کا نہیں نظر کا محتاج ہوتا ہے۔ بلکہ انداز نظر کا محتاج ہے۔ زاویہ نظر بدل جائے تو منظر اور پس منظر سب بدل جاتے ہیں۔ لیکن کتاب نہیں بدلتی۔ کتاب کا نہ بدلنا اس کا حسن ہے اور زندگی کا بدلتے رہنا اس کا جمال ہے۔ کتاب زندگی کے خدوخال واضح کرتی ہے۔ مقدس کتابیں نازل فرمانے والے نے یہ زندگی نازل فرمائی ہے۔ حسن بھی نازل فرمایا، بینائی بھی عطا فرمائی، نظاروں کی رعنائی بھی عطا فرمائی۔ **کتاب قانون ہے پہچان کا، لیکن پہچان کتاب کی نہیں کتاب بھیجنے والے کی درکار ہے۔**

علم نصیب سے ملتا ہے، یہ فضل الٰہی ہے۔ یہ غور وفکر سے ملتا ہے۔ ہمیں بچپن سے تعلیم دی جاتی ہے کہ محنت کرو، بڑے آدمی بنو گے اس تعلیم کی وجہ سے انسان کوشش کرتا ہے، اپنے قد سے بڑا ہونے کی، اور اس آرزو میں لوگ ہلاک ہوتے ہیں، کوشش اور مجاہدہ بہت کچھ دے سکتا ہے لیکن ایک گدھے کو کوئی مجاہدہ بھی گھوڑا نہیں بنا سکتا۔

یہ زندگی اپنی حدود میں مقید ہے، ہر انسان اپنے دائرہ عمل میں رہن رکھ دیا گیا ہے، انسان پابند ہے، آرزو پابند ہے، اس لئے محدود انسان کا لامحدود خواہشات کے لئے عمل کہیں نہ کہیں راستے میں دم توڑ دیتا ہے اور انسان عمل کے باوجود خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ جہاں اللہ کریم کا حکم ہے کہ انسان اپنی سعی سے ہی کچھ حاصل کرتا ہے، وہاں اس کے احکام کے اور رخ بھی ہیں، عمل کا جذبہ بھی اس کی عطا ہے، یہ **فضل ہے**۔ ایک نوجوان نے ایک بزرگ سے سوال کیا "حضرت مجھے کیسے پتہ چلے کہ اللہ تعالی کا فضل مجھ پر متوجہ ہے؟" بزرگ نے جواب دیا "برخوردار اپنا عمل دیکھو۔ اگر عمل جاری ہے تو فضل متوجہ ہے"۔ عمل کے راہ میں کتنے حادثات آتے ہیں، کتنے ہی واقعات ہیں، ہمارا عمل درست بھی ہو تو ممکن ہے کہ کسی اور کج رو کا عمل ہمارے عمل کے نتیجے کو ختم کر دے، ہم تنہا زندگی بسر نہیں کر رہے، ہمارے ساتھ ایک زمانہ چل رہا ہے، ہر آدمی عمل کر رہا ہے، ہمارے عمل کی راہ میں دوسروں کے اعمال حائل ہوتے ہیں، اور پھر نتیجہ وہی رہتا ہے کہ ہم نتیجے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ **فطرت کو منظور نہیں کہ سب لوگ سقراط ہی بنتے جائیں اس لیے عمل کے ساتھ ایک اور چیز بھی ہے۔ جسے نصیب یا تقدیر کہتے ہیں**، ایک جیسا عمل کرنے والے الگ الگ نصیب لے کر آتے ہیں، یہاں بے عملی مقصود نہیں۔ صرف یہ وضاحت مراد ہے کہ اپنی حدود کو پہچانے بغیر عمل میں داخل ہونا ہلاکت کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔

انسان ہزار محنت کرے وجدان (تیسری آنکھ) کے بغیر شاعر نہیں ہو سکتا اور جس کو وجدان عطا ہوا وہ محنت کے بغیر ہی شاعر ہے۔ یہ **فضل ہے**۔ سورج کے پاس علم نہیں روشنی ہے، علم تو غور وفکر سے ملتا ہے، تعلق سے ملتا ہے، **فضل سے ملتا ہے**۔ اور تقرب سے ملتا ہے، ہر کتاب کا علم فیض نظر تک نہیں پہنچا سکتا۔ **یہ کمال صرف اور صرف کتاب الٰہی کو حاصل ہے کہ اس میں ایک معمولی سا کھلنے والا پھول بھی علم دے سکتا ہے۔** شب تاریک کی گہرائیوں میں آنکھ سے ٹپکنے والا آنسو علم کے خزانے عطا کرتا

ہے،**اللہ تعالیٰ کا فضل ہی شرح صدر عطا فرماتا ہے۔** ہر عارف عالم ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ ہر عالم عارف بھی ہو۔ بغیر تزکیہ نفس کے کتاب کا علم خطرے سے خالی نہیں ،علم صرف کوشش سے نہیں مقدر سے ملتا ہے۔علم اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کوئی عطا کرنے والا نہ ہو۔علم نگاہ سے ملتا ہے،علم عطا سے ملتا ہے،علم فضل سے ملتا ہے۔ اس کا مدفن کتاب ہے۔تعلیم بھی علم نہیں۔تعلیم کا تعلق ڈگریوں سے ہے۔علم ڈگریوں اور یونیورسٹیوں سے بے نیاز ہے۔تعلیم ضروری ہے نوکری کے لئے۔نوکری ضروری ہے معاش کے لئے ،رزق کے لئے،اور سماجی مرتبے حاصل کرنے کے لئے۔لیکن علم نوکری نہیں ،علم حکومت نہیں،علم روٹی نہیں علم **پہچان ہے،علم عرفان ہے،ضرورت کا علم اور چیز ہے،اورعلم کی ضرورت اور چیز۔**

آج کی تعلیم ،آج ہی نتیجہ دے رہی ہے، طالب علموں کے حالات تعلیم کے ناقص ہونے کا ثبوت ہیں۔آج کا طالب علم ،علم سے بیزار ہے۔کہاں گئے وہ استاد جو طالب علموں کو فیضِ نگاہ سے آداب فرزندی سکھایا کرتے تھے۔آج کے طالب علم سے آج کی تعلیم نے علم کی محبت چھین لی ہے۔ابھی وقت ہے بدعلمی سے بےعلمی ہی بہتر ہے۔ **پیغمبروں کے پاس تعلیم نہیں ہوتی،علم ہوتا ہے بلکہ مکمل علم ہوتا ہے۔زمانے کے معلم کتب سے نہیں رحمان سے علم حاصل کرتے ہیں۔** آج ہمیں اُسی علم کی ضرورت ہے۔وہی ہماری اساس ہے اور وہی ہماری عاقبت۔ہمیں زندگی کا علم چاہیے اور مابعد کا علم بھی چاہیے کہ **چند روزہ زندگی میں بہت کچھ حاصل کرنا ہے اور پھر اسے چھوڑنا بھی ہے،سمیٹنا بھی ہے، جانا بھی ہے۔**

آج کے تعلیمی ادارے محمد بن قاسم جیسے لوگ پیدا نہیں کر رہے۔یہی تعلیم کا المیہ ہے کہ آج کی تعلیم صرف اور صرف ، تلاش روزگار کے لئے ہے۔تقرب پروردگار کے لیے نہیں۔ ہمارا عمل گناہ اور ثواب مرتب کرتا ہے، ہمارا عمل ہمیں آسانیاں بھی عطا کرتا ہے اور دشواریاں بھی ،گلاب ،گلاب ہے،عمل کرے یا نہ کرے، کانٹا کانٹا رہے گا چاہے جتنی محنت کرے۔عظیم انسان فطرت کا عمل ہیں ان کا اپنا عمل انہیں عظیم نہیں بناتا۔پیغمبر بننے کا کوئی عمل نہیں ، یہ منصب عطا ہے،امام عمل سے نہیں نصیب سے ہے،ارشادِ ربانی ہے''ہم جسے چاہتے ہیں مملکت دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں معزول ومحروم کردیتے ہیں''اس کا مطلب یہ ہوا کہ عمل بہانہ ہے،فضل اٹل ہے۔

ریت میں ہل چلایا جائے ، بیج بویا جائے اور اسے پانی کے بجائے چاہے خون دل سے کیوں نہ سینچا جائے وہاں کچھ نہ اُگے گا۔عمل ہے لیکن نتیجہ نہیں ہے۔اس لئے کہ ہر عمل زندگی نہیں دیتا۔ہم نبی خاتم النبیین ﷺ امیّ کی امت میں سے ہیں،ہمیں بے جہت اور بے سمت تعلیم کہاں لے جائے گی؟ اسلام عمل ہے۔اسلام بتانے والی بات نہیں،کرنے والا کام ہے۔ **بہرحال علم اس کی عطا ہے،جس نے زندگی عطا فرمائی۔عطا کو حاصل کرنے کے لئے یعنی فضل کے لئے دعا کے علاوہ کوئی عمل نہیں۔** معلومات اور انفارمیشن کا علم آزمائش میں پورا نہیں اترے گا۔کشتی کے مسافروں کو''صرف ونحو'' کی ضرورت نہیں انہیں تیرنا بھی آنا چاہیے۔ہماری ہر کامیابی اللہ تعالیٰ کے فضل کی مرہون منت ہے۔

ہر کامیاب انسان اپنی کامیابی کو ذاتی اچیومنٹ سمجھتا ہے اور پھر آخر میں تنہا رہ جاتا ہے کیوں؟"اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی کامیابی اس کے اندر غرور اور تکبر پیدا کردیتی ہے اور پھر یہاں سے خرابی شروع ہوجاتی ہے"۔دنیا میں تکبر کی سب سے بڑی شکل''سلف میڈ''ہے۔جب کوئی انسان اپنی کامیابی کو سیلف میڈ کا نام دیتا ہے تو وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت اور فضل کی نفی کرتا ہے۔ بلکہ وہ ان تمام انسانوں کے احسانات اور مہربانیوں کو بھی روندڈالتا ہے جنھوں نے اس کی کامیابی میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔اور یہ دنیا کا بدترین تکبر ہوتا ہے۔

فرعون اور نمرود کی مثال ہمارے سامنے ہے۔یہ دونوں انتہا درجے کے ذہین،فطین اور باصلاحیت حکمران تھے۔فرعون نے لاشوں کو محفوظ کرنے کا طریقہ ایجاد کیا تھا۔اس نے ایک ایسی سیاہی بنوائی تھی جو قیامت تک مدھم نہ ہوتی۔اس نے ایسے احرام بھی تیار کیے تھے جن کی ہیت آج تک کی جدید سائنس نہ سمجھ سکی۔اس نے دنیا میں آبپاشی کا پہلا نظام بنایا تھا۔اور فرعون کے دور میں مصر کے صحراؤں میں کھیتی باڑی ہوتی تھی۔لیکن وہی فرعون بعدازاں عبرت کا نشان بن گیا کیوں؟؟ اپنے تکبر اور اپنے غرور کی وجہ سے۔لیکن فرعون کا یہ تکبر''سیلف میڈ''لوگوں کے غرور سے چھوٹا تھا۔

اس نے اللہ کی نفی کی تھی۔وہ اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے تمام بزرگوں،اپنے تمام دوستوں اور اپنے تمام مہربانوں کا احسان تسلیم کرتا تھا۔وہ اپنے استادوں کو دربار میں خصوصی جگہ دیتا تھا۔وہ اپنی بیویوں کا اتنا احترام کرتا تھا کہ اس نے اپنی اہلیہ محترمہ کے کہنے پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گود لے لیا تھا۔

اب نمرود کو دیکھتے ہیں۔نمرود نے کھیتی باڑی کے جدید طریقے ایجاد کروائے۔اس نے دنیا میں پہلی بار زمین کو یونٹوں میں تقسیم کیا۔اس نے اونچی اونچی عمارتیں بنوائیں۔اس نے شہروں میں فوارے لگوائے۔اس نے دنیا میں پہلی بار درخت کاٹنے کی سزا تجویز کی۔وہ دنیا کا پہلا بادشاہ تھا جس کے ملک سے غربت اور بے روزگاری

دور ہوگئی تھی۔اور جس کی رعایا کا ہر فرد خوشحال اور مطمئن تھا۔لیکن پھر بھی یہ بادشاہ اللہ کے عذاب کا شکار ہوا؟ کیوں؟ غرور کی وجہ سے وہ اللہ کے وجود کی نفی کا مرتکب ہوا۔ اور یہ اس کا جرم تھا۔جبکہ عام زندگی میں وہ ایک اچھا انسان اور شاندار بادشاہ تھا۔مہمان نواز تھا۔وہ کبھی بھی شائستگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔اس نے اپنے دربار میں دنیا جہان کے عالم اور ماہرین جمع کر رکھے تھے۔وہ بہادری اور شجاعت میں یکتا تھا۔وہ اپنے دوست،احباب،ماں باپ اور عزیز رشتہ داروں کا احترام کرتا تھا۔وہ لوگوں کے احسانات اور مہربانیوں کو یاد رکھتا تھا۔لیکن اس نے اللہ کی ذات کی نفی کی خود کو خدا کہہ بیٹھا اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آ گیا۔

فرعون اور نمرود نے اللہ کی ذات میں برابری کی تھی---جبکہ خود کو''سیلف میڈ'' کہنے والا شخص نعوذ باللہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل کی نفی نہیں کرتا بلکہ وہ دنیا بھر کے لوگوں کے احسانات کو بھی فراموش کر دیتا ہے جنھوں نے اس کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔چنانچہ ایسا شخص فرعون اور نمرود کے مقابلے میں کئی گنا بڑے غرور و تکبر کا مرتکب ہے۔پھر یہ آخیر میں اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آ جاتا ہے-انسان معلوم پر نازاں ہوتا ہے اور اسے معلوم ہی نہیں کہ وہ ہمہ وقت نامعلوم کی زد میں ہے،وہ خوش ہوتا ہے کہ اس کی دولت بڑھ رہی ہے اور بھول جاتا ہے کہ اس کی عمر گھٹتی جا رہی ہے،ایسے علم سے تو یہ بہتر جو صاحب علم کو نفع نہ دے۔سال ہا سال کی عبادت ابلیس کو کیا دے سکی؟ **ظلمات سے نور میں داخل ہونے کا عمل خالق کے پاس ہے،ہمارا اپنا عمل ہمیں معزز نہیں کرتا** اس کا فضل ہمیں عزت بخشتا ہے۔نیکی کا غرور محرومیوں کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔زندگی کی اساس عمل نہیں فضل ہے۔**اصل عمل اس کے فضل کے حصول کا نام ہے** اور اس کا فضل کسی فارمولے سے حاصل نہیں ہوتا۔نیت کی اصلاح ہو تو عمل میں خلوص پیدا ہو جاتا ہے،اور عمل کا خلوص ہی اصل مطلوب ہے،ہمارا نظام حیات،نظام تعلیم،اور نظام فکر،ہمیں صرف عمل میں مصروف رکھتا ہے،عاقبت کی کوئی گارنٹی نہیں۔ نتیجے عارضی ہیں،مرتبے آسائشیں،شہرتیں اور اختیارات گمراہی کے مقامات بھی ہو سکتے ہیں۔

اُس عمل کو تلاش کیا جائے جو ہمیں بھی پسند ہو اور ہمارے مالک کو بھی،ورنہ نتیجہ ہلاکت اور گمراہی ہے۔**حسن عمل اصلاح باطن کے ساتھ حُسن حیات کا حصول ہے**۔زندگی میں راہیں بدلنے کا وقت نہیں۔پہلے ہی سے صحیح راستے کا انتخاب کیا جائے اور اس پر صحت عمل سے گامزن ہو کر اُس کے فضل کا آسرا تلاش کیا جائے۔یہی منشا ہے اس حکم کا کہ''اے انسان تو محنت کے لیے پیدا کیا گیا ہے،اپنے رب کے راستوں کی طرف محنت کر'' کہیں ایسا نہ ہو کہ ناعاقبت اندیشی میں ہم غلط راستے (ظلمت کے راستے) کی طرف نکل جائیں۔

تو نتیجہ یہ نکلا کہ علم اگر خود آ گہی کے قریب کرے تو نور ہے ورنہ حجاب ہے،زیادہ جاننے کا غرور اگر نہ جاننے کی عاجزی میں بدل جائے تو حجاب اٹھ جاتا ہے۔فنا کا علم حجاب ہے،بقا کا علم نور ہے،اگر علم کا مدعا صرف خوشنودی اہل خانہ اور خوشنودی خلق ہے تو حجاب ہے **اور اگر علم کا منشا رضائے حق ہے تو نور ہے۔بلکہ نور''علیٰ نور'' ہے۔نور علم ہی یہ سیکھاتا ہے کہ نجات عمل پر نہیں فضل سے منسلک ہے**۔کامیاب اور کامران لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل ہوتا ہے۔وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کروڑوں،اربوں لوگوں میں سے کامیابی کے لئے خصوصی طور پر چنتا ہے۔انہیں ویژن اور آئیڈیاز دیتا ہے۔ ان کو محنت کی طاقت دیتا ہے وہ انہیں دوسرے انسانوں کے مقابلے میں زیادہ توانائی بخشتا ہے۔ان کو آگے بڑھنے کے خصوصی مواقع فراہم کرتا ہے۔ان کے لئے کامیابی کے راستے کھولتا ہے۔معاشرے کے بااثر اور اہم لوگوں کے دلوں میں ان کے لئے محبت اور ہمدردی پیدا کرتا ہے۔اور آخر میں تمام لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ ان لوگوں کو کامیاب تسلیم کر لیں۔وہ اپنی نشستوں سے اٹھ کر ان کے لیے تالیاں بجائیں۔اس طرح یہ تمام تر کامیابیاں اللہ کی کامیابی نہ ہوئی؟؟۔ہم لوگ ہماری ساری کامیابیاں اس کا فضل نہ ہوئیں؟؟

جب کوئی کامیاب شخص اپنی کامیابی کو اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی قرار دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں اس کے گرد رونق لگا دیتا ہے۔اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں اس شخص کے لئے محبت ڈال دیتا ہے۔اس طرح یہ شخص زندگی کے آخری سانس تک لوگوں کی محبت اور رونق سے لطف اٹھاتا رہتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس کی زندگی پر تنہائی کا سایہ بھی پڑنے نہیں دیتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں اس کی کوشش اور جدوجہد کا کیا مقام ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری کیا مجال کے ہم اس کی اجازت کے بغیر محنت کر سکیں۔یہ ہم اس کی مہربانی کے بغیر جدوجہد کر سکیں۔ ہم میں تو اتنی مجال بھی نہیں کہ ہم اس کی مہربانی کے بغیر اس کا نام تک لے سکیں۔پھر ہماری محنت اور ہماری جدوجہد کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے؟ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل کا کھیل ہے ہم اور ہم سب کی کامیابیاں اللہ کی طرف سے ہیں۔ہمیں اللہ تعالیٰ کے اس کریڈٹ کو تسلیم کرنا چاہیے تا کہ ہماری زندگیاں تنہائیوں سے بچ جائیں اور ہم پر غم کا سایہ نہ پڑ سکے۔ہمیشہ یہ بات یاد رکھیں کہ اگر زندگی کی ہر کامیابی میں ہم اللہ کے فضل اور مہربانی کو تسلیم کرتے چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنی رحمت کے سائے ہمیشہ ہمارے سروں پر سایہ فگن رکھے گا۔

جب تک انسان کو اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کا کرم، اس کا فضل اور اس کا رحم نظر نہیں آئے گا اس وقت تک انسان کو سکون، آرام، چین، خوشی پر مسرت حاصل نہیں ہوسکتی۔ خوشی، خوشحالی اور سکون اللہ کی رضامندی سے منسلک ہے۔ جو فرد، جو طبقہ اور جو قوم اللہ تعالیٰ کی رضامندی سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس کا سکون، خوشی اور خوشحالی چھن جاتی ہے۔ اس لئے ہر کام اور ہر کامیابی کو اللہ تعالیٰ سے منسوب کر کے عبدیت کا حق ادا کرنے میں ہی انسان کی کامیابی ہے۔

تمثیل: دو تہائی شب گزر چکی ہے، ایک شخص تہجد کی نماز پڑھ رہا ہے، نماز کے بیچ میں اسے خیال آتا ہے کہ ماں کو دیکھوں ٹھنڈ بڑھ رہی ہے، ماں کی چادر اٹھاتے ہوئے ماں کی آنکھ کھل جاتی ہیں۔ ''ماں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے'' ہاں بیٹے رات دوائی نہیں کھائی تھی۔ اس لیے پیروں میں درد ہو رہا ہے۔ بیٹا بڑے ہی شفقت سے ماں کو دوائی کھلاتا ہے اور ماں کے پاؤں دبانے بیٹھ جاتا ہے۔ ماں کی آنکھ لگ جاتی ہے تو بیٹا اٹھتا ہے۔ احتیاط سے اٹھنے میں اپنا ہی نیا چشمہ اپنے پیر کے نیچے آکر ٹوٹ جاتا ہے۔ دل نے کہا یہ تو بہت برا ہوا، تو تو اعلیٰ ترین عبادت تہجد میں مشغول تھا، پھر ماں کی خدمت وہ بھی ان کے تکلیف کے لحات میں، لیکن آپ کو اس کا کچھ اچھا بدلہ نہیں ملا، لمحہ بھر یہ خیال آیا، لیکن پھر دل ہی دل میں یہ احساس آیا کہ چشمے'' کا ٹوٹ جانا نقصان نہیں بلکہ یہ تو انعام ہے، نقد انعام۔ بظاہر تیرا چشمہ ٹوٹا ہے لیکن اس کے بدلے میں تجھے وہ نظر عطا کر دی گئی ہے جو شب کی سیاہی میں تجھے جنت کا نظارا کرائے گی''۔

صرف یہی نہیں ہر حادثہ ایک نیا پیغام لے کر آتا ہے- اگر سوچ مثبت ہو تو---لیکن اس وقت اگر انسان منفی اندازفکر کا شکار ہو جائے اور اللہ تعالیٰ سے بدظن ہو جائے تو اپنی ساری محنت ضائع کر بیٹھتا ہے اور دنیا اور آخرت کی نہ جانے کتنی بھلائیوں سے محروم ہو جاتا ہے، **اس لیے دنیا میں جتنا اہم علم اور عمل ہے اس سے کہیں زیادہ ہمارے سوچنے کا انداز ہے۔ زندگی کا ہر اطمینان اور ہر خوشی مثبت اندازفکر میں پوشیدہ ہے۔** جس شخص کے پاس مثبت سوچ کا سرمایا نہیں اس کا کوئی عمل اسے خوشی اور کامیابی نہیں دے سکتا۔ ہر انسان مصروف عمل ہے۔ عمل ہی شاید زندگی ہے- دنیا میں مختلف قسم کے عمل ہیں اس لئے مختلف قسم کی کامیابیاں ہیں- **برے مقاصد کے لیے عمل اگر کامیاب بھی ہو جائے تو بھی ناکام ہے اس کے برعکس اچھے مقاصد کے لئے عمل اگر ناکام بھی ہو جائے تو بھی کامیاب ہے،** اس لئے کامیابی کا حصول اتنا اہم نہیں جتنا عمل کا انتخاب ہے۔ بہترین عمل رضائے الٰہی کا حصول ہے اور یہ فضل الٰہی سے حاصل ہوتا ہے۔

تمثیل: بچے کے ہاتھ نے اپنی ماں کے پلو کو تھام رکھا تھا۔ چھوٹا سا ہاتھ، کمزور سا ہاتھ، معصوم سا ہاتھ، یہ بچہ سال بھر کا بھی نہیں ہوگا، باپ آگے بیٹھا موٹر بائیک چلا رہا تھا اور اس کے پیچھے ماں اپنے بچے کو گود میں لئے بیٹھی تھی، اس نے ایک ہاتھ سے موٹر بائیک کی سیٹ کو اور دوسرے سے بچے کو پکڑ رکھا تھا، اس پورے منظر میں جو بات قابل غور ہے وہ ہے وہ چھوٹا سا ہاتھ جس نے ماں کے پلو کو پکڑ رکھا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر اس بچے کی ماں اپنے ہاتھ کی گرفت برقرار نہ رکھ سکے تو کیا یہ چھوٹا سا ہاتھ، یہ معصوم سی مٹھی، اتنی طاقتور ہے کہ خود کو گرنے سے روک سکے؟ ایسا ناممکن تھا۔ ہم گرمی کے روزوں کی مشقت اور اس کی سختی کے بارے میں پریشان ہوتے رہتے ہیں، مگر اس منظر کو دیکھ کر یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ **جہنم کے گڑھے میں گرنے سے اگر کوئی ہمیں بچا سکتا ہے تو وہ ہمارے نماز، روزے کا عمل نہیں وہ ہماری کمزور عبادت کا ہاتھ نہیں بلکہ پروردگار کے فضل کا ہاتھ ہوگا۔** جنت کی منزل تک ہماری رسائی ہو ہی نہیں سکتی، اگر مالک دو جہاں کا شفقت بھرا ہاتھ ہمیں سنبھالے ہوئے نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ساری محنت، علم، ہمارا سارا عمل، ہماری ساری مذہبیت اور ہماری ساری عبادت بھی دراصل خدا کی دی ہوئی توفیق کی مرہون منت ہیں۔ مالک نے ہماری ساری دین داری کا بھرم رکھا ہوا ہے۔

سورۃ محمد، آیت نمبر 37 ترجمہ: ''اگر وہ تم سے تمہارا مال مانگے اور زور دے کر مانگے تو تم اس سے بخیلی کرنے لگو گے اور وہ تمہارے کینے ظاہر کر دے گا''۔

باری تعالیٰ ہم دنیاداروں نے اپنی تئیں جو عبادات کیں ہیں اور جو مشقتیں اٹھائیں ہیں اس سے تیرا قرب مطلوب تھا، تیرا فضل مطلوب تھا- مالک لیکن یہ مشقت اس بچے کے کمزور ہاتھ سے زیادہ نہیں، جس نے اپنی ماں کا دامن پکڑ رکھا تھا۔ ماں کے ہاتھ کو بچے کا سہارا بنانے والے اپنے طاقت ور ہاتھ کو آگے بڑھا دے، وگرنہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جہنم سے نجات اور جنت کی کامیابی کا حقدار نہیں بنا سکتی------پس ہماری نجات فضل الٰہی پر موقوف ہے-

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خشیت الٰہی

خشیت الٰہی جز ایمان ہے اور ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہی تقویٰ کی بنیاد ہے۔ خوف الٰہی کا ثمرہ دوسری نیکیوں سے زیادہ ہے۔ خوف ایک تازیانہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو علم وعمل کی طرف ہانکتا ہے تا کہ ان دونوں سے وہ مرتبہ قرب الٰہی کو پا سکے۔

خشیت الٰہی کے بارے میں قرآنی آیات:-

1- سورہ رحمن، آیت نمبر 46 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو جنتیں ہیں''۔

2- سورہ بقرہ، آیت نمبر 40 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور صرف مجھ ہی سے ڈرو''۔

3- سورہ الحج، آیت نمبر 4 میں فرمان الٰہی ہے: ''اے لوگو ڈرو اپنے رب کی ناراضگی سے۔ بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی سخت چیز ہے۔ جس روز تم اس (کی ہولناکیوں کو) دیکھو گے تو غافل ہو جائے گی اس روز ہر دودھ پلانے والی ماں اپنے لخت جگر سے اور گرا دے گی ہر حاملہ اپنے حمل کو اور تجھے نظر آئیں گے لوگ جیسے نشے میں مست ہیں۔ حالانکہ وہ نشہ میں مست نہیں ہوں گے بلکہ عذاب الٰہی بڑا سخت ہوگا"- (یہ اس کی ہیبت سے حواس باختہ ہوں گے)

4- سورہ الطور، آیت نمبر 28-25 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: "(وہ لوگ) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر پوچھیں گے ہم بھی اس سے پہلے اپنے اہل خانہ میں (اپنے انجام کے بارے میں ڈرتے رہتے تھے)۔ سہمے رہتے تھے۔ سو بڑا احسان فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے ہم پر کہ بچا لیا ہمیں گرم لُو کے عذاب سے۔ بے شک ہم پہلے بھی (دنیا میں) اس سے (اللہ سے) دعا کیا کرتے تھے یقیناً وہ بہت احسان کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔

ایک حدیث قدسی میں وارد ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''قسم ہے اپنی عزت اور اپنے جلال کی میں کبھی اپنے بندوں پر دو خوف جمع نہیں کروں گا۔ نہ دو امن جمع کروں گا۔ پس اگر دنیا میں مجھ سے کوئی خوف کرے گا تو قیامت میں اسے بے خوفی دوں گا''۔ (ابن حبان، ترغیب)

خشیت الٰہی کے بارے میں احادیث مبارکہ:- خوف اور خشیت کا مدار ڈرنے والے کے علم اور اس کی معرفت پر ہے اور چونکہ مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں علم حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کو ہے اس لئے آپ ہی مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔

1- حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا ''اللہ کی قسم! میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ جاننے والا ہوں اور سب سے زیادہ اس کا خوف رکھنے والا ہوں۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

2- حضرت انسؓ سے مروی ہے حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اور میں نے ایسا خطبہ کبھی نہیں سنا تھا۔ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''اگر تمہیں وہ معلوم ہو جائے جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنسو اور زیادہ روؤ صحابہ کرامؓ نے اپنے چہروں کو ڈھانپ لیا اور سسکیاں بھر بھر کر رونے لگے"- (بخاری ومسلم)

3- حضرت مقدادؓ سے مروی ہے کہ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''قیامت کے دن سورج مخلوقات کے اتنے قریب آ جائے گا۔ حتیٰ کہ ان سے صرف میل کی مسافت پر رہ جائے گا''۔ (صحیح مسلم)

4- نیلم بن عامرؒ حضرت مقدادؓ سے روایت کرنے والے راوی کہتے ہیں کہ ''خدا کی قسم مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ میل سے کیا مراد ہے۔ زمین کی ایک میل کی مسافت مراد ہے یا میل سے مراد وہ سلائی ہے جس سے آنکھوں میں سرمہ لگایا جاتا ہے۔ اس دن لوگ اپنے اعمال کے مطابق پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ بعض ایسے ہوں گے جو ٹخنوں تک پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ بعض ایسے ہوں گے جو گھٹنوں تک پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ بعض ایسے ہوں گے جو کمر تک پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے اور بعض ایسے ہوں گے جن کو پسینے کی لگام دے دی جائے گی۔ جن کا پسینہ کان کی لو تک جائے گا۔ وہ اس خیال سے کہ یہ پسینہ منہ میں نہ چلا جائے بار بار اپنا منہ اوپر کو اٹھائیں گے۔ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ بعض کے منہ میں پسینے کی لگام ہوگی۔ یہ بات حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے اپنے ہاتھ کو منہ مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمائی"- (صحیح مسلم)

5- ایک حدیث میں ہے کہ ''جب ایمان دار کے دل پر اللہ تعالیٰ کے خوف سے لرزہ پڑ جاتا ہے تو اس کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے درخت سے پتے جھڑتے ہیں''۔ (الترغیب والترھیب، بیہقی)

6- ایک حدیث میں ہے کہ ''خدائے تعالیٰ کے نزدیک دو قطروں سے اچھا کوئی قطرہ نہیں ایک آنسو کا قطرہ جو خدائے تعالیٰ کے خوف سے نکلے، دوسرا وہ قطرہ خون جو اللہ کی راہ میں بدن سے گرے''۔(جامع ترمذی)

7- نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''سات اشخاص ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سائے میں رکھے گا جب اس کے سائے کے علاوہ کہیں سایہ نہ ہوگا۔ان میں سے ایک وہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کو تنہائی میں یاد کرے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں۔''(بخاری شریف)

8- حضرت حنظلہؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز ہم نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے ہم کو ایسی نصیحت کی کہ اس سے ہم سب کے دل نرم ہو گئے اور ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اپنے نفسوں کو ہم نے جان لیا۔ پھر جب میں گھر آیا تو گھر والے میرے پاس آئے اور اس دنیا کی باتیں ہم لوگوں میں جاری ہو گئیں۔ یہاں تک کہ وہ حال جو ہمارا نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے سامنے تھا اب بالکل نہ رہا۔اور بالکل ہی دنیا کا معاملہ ہو گیا۔ پھر مجھ کو یاد آیا تو میں نے کہا "میں تو منافق ہوں، اس وجہ سے کہ جو رقعت اور خوف الٰہی مجھ پر طاری تھا اب نہیں رہا تھا"۔خوف کے مارے میں گھر سے نکلا اور پکارا حنظلہ منافق ہو گیا ہے۔حنظلہ منافق ہو گیا ہے۔ اتنے میں حضرت ابو بکر صدیقؓ مجھ کو سامنے سے ملے۔ انہوں نے کہا" نہیں حنظلہ ہرگز منافق نہیں ہوا ہے۔" میں نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس حالت میں کہ میں زبان سے اب بھی یہی کہتا جا رہا تھا کہ حنظلہ منافق ہو گیا ہے۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے مجھے دیکھا اور فرمایا" بالکل منافق نہیں ہوا ہے"۔ میں نے عرض کیا" یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ہم آپ خاتم النبیین ﷺ کے پاس تھے۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے ایسا وعظ کیا کہ دل خوف الٰہی سے بھر گئے۔دلوں پر رحم چھا گیا۔ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اپنے نفسوں کو ہم نے جان لیا۔مگر جب میں گھر گیا اور دنیاوی باتیں شروع کیں تو وہ سب کیفیت ختم ہو گئی جو آپ خاتم النبیین ﷺ کے سامنے تھی"۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''اے حنظلہؓ اگر تم ہمیشہ اُسی کیفیت پر رہو تو تم سے فرشتے راستوں میں اور تمہارے بستروں پر مصافحہ کرنے لگیں مگر ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے''۔(صحیح مسلم، جامع ترمذی)

9- سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ایک نوجوان کے پاس گئے اور وہ موت وحیات کی کشمکش میں تھا۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے اس سے پوچھا:"اپنے (اخروی اجر وثواب اور عذاب وعقاب کے) بارے میں کیا خیال کرتے ہو؟" اس نے کہا" اے اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ! میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں پر امید ہوں، لیکن اپنے گناہوں سے ڈر بھی رہا ہوں"۔ رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:"جس آدمی کے دل میں اس قسم کے (جان کنی کے) وقت میں یہ دو چیزیں (یعنی خوف وامید) جمع ہو جاتی ہیں، تو جس چیز کی اسے امید ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ وہ عطا کر دیتا ہے اور جس چیز کا ڈر ہوتا ہے، وہ اس سے امن دلا دیتا ہے۔"(السلسلۃ الصحیحۃ)

10- حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''جو شخص اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئے اس کا آگ میں جانا ایسا ہی مشکل ہے جیسے دودھ کا تھنوں میں واپس جانا''۔(جامع ترمذی)

انبیاء کرام علیہ السلام اور فرشتوں پر خوف خداوندی کے حالات:- حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں ''جب ہوا چلتی اور آندھی چلتی تو آنحضرت خاتم النبیین ﷺ کے چہرہ مبارک کا رنگ بدل جاتا تھا اور باہر اندر جاتے تھے اور یہ سب باتیں خدا کے خوف کی وجہ سے ہوتیں تھیں کہ شاید، قیامت آنے والی ہے''۔آپ خاتم النبیین ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ''میرے پاس جبرائیل علیہ السلام کبھی نہیں آئے مگر اس صورت سے کہ خوف خدا میں کانپتے ہیں''۔(سنن ابی داؤد)

جب شیطان مردود ہوا تو حضرت جبرائیلؑ اور حضرت میکائیلؑ نے رونا شروع کر دیا ان سے پوچھا گیا" کیوں روتے ہو"؟ انہوں نے عرض کیا" الٰہی ہم تیرے داؤ سے بے خوف نہیں ہیں"۔حکم ہوا" تمہیں میرے مکر سے بے خوف ہونا بھی نہیں چاہیے تمہیں ایسے ہی رہنا چاہیے۔''

محمد بن مکدرؒ روایت کرتے ہیں "جب دوزخ پیدا ہوئی تو فرشتوں کے دل اپنی جگہ سے اڑ گئے مگر جب بنی آدم پیدا ہوئے تو دل پھر اپنی جگہ پر واپس آ گئے"۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں "حضرت داؤد علیہ السلام اپنے گناہ کے بعد چالیس روز تک سجدے میں روئے اور سر نہیں اٹھایا۔ یہاں تک کہ ان کے آنسوؤں سے سبزہ جم گیا اور ان کا سر چھپ گیا"۔آواز آئی ''اے داؤد اگر تو بھوکا ہے تو کھانا ملے اگر تو پیاسا ہے تو پانی ملے اگر تو ننگا ہے تو کپڑا ملے''۔آپ علیہ السلام نے ایسی دھاڑ ماری کہ آپ علیہ السلام کے خوف کی وجہ سے سامنے کی لکڑی جل گئی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپؑ کی توبہ قبول کی اور مغفرت اتار دی- آپ علیہ السلام دعا میں یوں عرض کیا کرتے تھے ''الٰہی جب میں اپنی خطا یاد کرتا ہوں تو زمین باوجود اپنی وسعت کے مجھ پر تنگ ہو جاتی ہے اور جب تیری رحمت کو یاد کرتا ہوں تو جان میں جان آتی ہے تو پاک ہے۔باری تعالیٰ

میں تیرے بندوں میں سے جو طبیب ہیں ان کے پاس گیا سب کے سب تیرے پاس ہی علاج بتاتے ہیں تو خرابی ہے اس کے لیے جو تیری رحمت سے آس توڑ دے"۔ آواز آئی "اے داؤد علیہ السلام آدم میری ایک مخلوق ہے جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا۔ پھر اپنی روح اس میں پھونکی اپنے فرشتوں سے اسے سجدہ کرایا۔ اپنے اکرام کی خلعت اس کو پہنائی۔ اپنے وقار کا تاج اس کے سر پر رکھا اور جب تنہائی کی شکایت کی تو حوا کو بنایا۔ پھر جنت میں رہنے کو جگہ دی اور جب اس نے نافرمانی کی تو ہم نے اسے اپنے پاس سے نکال دیا"۔

یحیٰی بن ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ مجھ کو یہ روایت پہنچتی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام جب نوحہ کرنا چاہتے تھے تو سات روز پیشتر ہی کھانا پینا بند کر دیتے تھے۔ جب ایک روز رہ جاتا تو جنگل کا رخ کرتے اور حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے بیٹے کو فرماتے "شہروں، پہاڑوں، ٹیلوں، جنگلوں اور بت خانوں میں کہلا دو کہ لوگو اگر تمہیں حضرت داؤد علیہ السلام کا اپنے نفس پر نوحہ سننا منظور ہو تو آ جاؤ"۔ جنگلوں اور ٹیلوں سے وحشی درندے، پہاڑوں سے جانور، گھونسلوں سے پرندے، اور شہروں سے مرد اور عورتیں (پردوں میں) آ جاتیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام آ کر منبر پر چڑھتے۔ آپ علیہ السلام کے ارد گرد بنی اسرائیل ہوتے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام آپ علیہ السلام کے سر کے پاس کھڑے ہوتے۔ اول آپؑ اللہ تعالیٰ کی ثنا بیان کرتے اور لوگ رونا شروع کر دیتے آہستہ آہستہ لوگ دھاڑیں مارنے لگتے۔ پھر آپ علیہ السلام جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے تو زمین کے اندر رہنے والے جانور اور وحشی جانور مارے خوف کے مر جاتے پھر قیامت کی دہشت کا ذکر کرتے اور اپنے اوپر نوحہ کرتے تو ہر قسم کے جان داروں میں سے پرے کے پرے الٹ جاتے (مر جاتے) حضرت سلیمان علیہ السلام جب مردوں کی کثرت دیکھتے تو آپ علیہ السلام سے کہتے " آپ علیہ السلام نے سننے والوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں اور بنی اسرائیل کے بہت سے گروہ مر گئے ہیں اور زمین کے بہت سے حشرات فنا ہو گئے ہیں"۔ یہ سن کر آپ دعا مانگنا شروع کر دیتے۔ وہ دعا ہی میں ہوتے تو بنی اسرائیل کا کوئی عابد ان کو پکارتا اور کہتا "اے داؤد جزاء کے مانگنے میں آپ علیہ السلام نے جلدی فرمائی ہے"۔

یہ سن کر آپ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑتے۔ جب سلیمان علیہ السلام آپ علیہ السلام کا یہ حال دیکھتے تو ایک چار پائی لاتے اور اس پر آپ علیہ السلام کو ڈالتے پھر پکارتے اور کہتے اگر کسی کا کوئی ساتھی، دوست، آشنا داؤدؑ کے ساتھ تھا تو وہ چار پائی لے کر اسے اٹھا لائے کیونکہ جو لوگ ان کے ساتھ تھے ان کو جنت اور دوزخ کے بیان نے مار ڈالا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو خوف خدا نے فنا کیا ہے"۔ پھر جب حضرت داؤدؑ کو آرام ہوتا تو کھڑے ہوتے اور اپنا ہاتھ سر پر رکھتے اور اپنے عبادت خانے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیتے۔ پھر کہتے "اے داؤدؑ کے مالک کیا تو داؤد سے ناراض ہے"؟ اور اس مناجات میں رہتے پھر حضرت سلیمان علیہ السلام اندر آنے کی اجازت طلب کرتے اور ایک ٹکیہ جو کی لے کر اندر آتے اور عرض کرتے "بابا اس کو کھا کر جو بات کہنا چاہتے ہیں اس کو کہنے کی قوت پیدا کر لیں"۔ تو آپؑ اس میں سے کسی قدر کھا لیتے۔ پھر بنی اسرائیل نکل کر رہتے۔ (یعنی جب حضرت داؤد علیہ السلام آہ وزاری کے لئے جاتے تو بنی اسرائیل کے عابد بھی ضرور جاتے)

صحابہؓ اور تابعینؒ پر خوف خدا کا غلبہ:- روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک مرتبہ پرندے کو دیکھا اور فرمایا "کاش میں ایک پرندہ ہوتا"۔

حضرت عمرؓ جب کوئی قرآنی آیت خوف کی سنتے تو ڈر کے مارے بے ہوش ہو جاتے تھے۔

عمران بن حسینؓ فرماتے ہیں کہ "میں اچھا سمجھتا ہوں کہ راکھ ہو جاؤں اور میرے اجزاء ہوا یا آندھی کے دن میں اڑا دیئے جائیں"

حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ کا قول ہے کہ "مجھ کو اچھا معلوم ہوتا کہ میں ایک مینڈھا ہوتا لوگ مجھے ذبح کرتے۔ میرا گوشت کھاتے اور شوربہ پی جاتے"۔

حضرت امام زین العابدینؒ وضو فرماتے تو آپؒ کا چہرہ زرد ہو جاتا تھا۔ گھر والوں نے پوچھا "وضو کے وقت ایسا کیوں ہوتا ہے"؟ آپؒ نے جواب دیا "تمہیں معلوم بھی ہے کہ کس کے سامنے کھڑا ہوا چاہتا ہوں؟"۔

حضرت حاتم اصمؒ فرماتے ہیں "کسی خوبصورت مکان پر فریفتہ نہ ہو۔ جنت سے زیادہ خوبصورت کوئی جگہ نہیں مگر آدمؑ کا حال اس میں جو ہوا سو ہوا۔ اور نہ کثرت عبادت پر فریفتہ ہو۔ ابلیس کا حال بعد کثرت عبادت کے خود ظاہر ہے۔ اور نہ کثرت علم سے مغرور ہو کہ "بلعام" اسم اعظم جانتا تھا اس کا کیا انجام ہوا؟ اور نہ صلحا کی زیارت پر فریفتہ ہو کہ آپ خاتم النبیین ﷺ سے بڑھ کر کسی کا رتبہ نہیں مگر بعض اقارب کو آپ خاتم النبیین ﷺ کی زیارت بھی کام نہ آئی"۔

ایک دن حضرت حسن بصریؒ ایک جوان کے پاس سے گزرے کہ اپنی ہنسی میں ڈوبا ہوا تھا اور ایک مجلس میں لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ آپؒ نے اس کو دیکھا اور اس سے پوچھا "اے نوجوان کیا تو پل صراط سے گزر چکا ہے"؟ اس نے کہا "نہیں" آپؒ نے اس سے سوال کیا "کیا تجھے معلوم ہے کہ تو دوزخ میں جائے گا یا جنت میں؟" اس نے کہا "نہیں"۔ آپؒ نے فرمایا کہ "پھر یہ ہنسی کیسی ہے"؟ راوی کہتے ہیں "پھر اس شخص کو کسی نے کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا"۔

حضرت عطائے سلیمیؒ بھی خائفین میں سے تھے (ڈرنے والے) اللہ تعالیٰ سے کبھی جنت کا سوال نہ کرتے۔صرف معاف کرنے کی درخواست کرتے۔مرض میں آپ سے لوگوں نے پوچھا" کس چیز کے لیے دل چاہتا ہے"۔انہوں نے فرمایا"دوزخ کے خوف نے میرے دل میں کسی چیز کی خواہش کے لیے جگہ نہیں چھوڑی ہے"۔

ایک مرتبہ حجاج نے حضرت سعید بن جبیرؒ سے پوچھا کہ ''میں نے سنا ہے کہ آپ کبھی نہیں ہنستے؟ آپ نے فرمایا کہ ''ہنسنے کی کیا صورت رہ گئی ہے؟ دوزخ گھات میں ہے،طوق تیار کردیئے گئے ہیں اور فرشتے دوزخ میں ڈالنے کے لیے مستعد اور آمادہ کھڑے ہیں۔''

ایک شخص نے حضرت حسن بصریؒ سے پوچھا''اے ابوسعیدؒ کیا حال ہے؟ آپؒ نے مسکرا کر فرمایا" میرا حال پوچھتا ہے؟۔یہ بتا کہ اگر کچھ لوگ کشتی میں سوار ہو کر بیچ سمندر میں پہنچ جائیں اور وہاں پہنچ کر کشتی ٹوٹ جائے اور ایک ایک آدمی ایک ایک تختے سے لگ کر رہ جائے تو ان کا حال تمہارے ذہن کے مطابق کیا ہوگا"؟ اس نے کہا "بہت سخت مصیبت ہوگی"۔آپؒ نے فرمایا کہ''اب تو جان لے کہ میرا حال اس سے بھی زیادہ سخت ہے''۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ایک لونڈی ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا"امیر المومنینؒ میں نے اس وقت (تہجد کی نماز کے بعد) ایک عجیب معاملہ دیکھا ہے"۔آپؒ نے پوچھا" کیا معاملہ ہے"؟ اس نے کہا" میں نے دیکھا کہ دوزخ دوزخیوں کے واسطے دھڑا دھڑ جل رہی ہے۔پل صراط کو لاکر دوزخ کی پشت پر رکھ دیا گیا ہے"۔آپؒ نے فرمایا" پھر کیا ہوا"؟ اس نے کہا" پھر عبدالملک بن مروان کو لائے اور اس پل پر اس کو چڑھا دیا اور وہ ابھی تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ پل الٹ گیا اور وہ دوزخ میں گر گیا"۔آپؒ نے فرمایا" پھر"؟ اس نے کہا" پھر میں نے دیکھا کہ عبدالملک کے بیٹے کو لائے اور اس کو پل پر سوار کیا وہ بھی ابھی تھوڑی دور چلا تھا کہ پل نے کروٹ لی اور دوزخ میں جا پڑا"۔آپؒ نے گھبرا کر کہا" پھر"؟ اس نے کہا" پھر سلمان بن عبدالملک کو لائے اور پل پر چڑھایا وہ بھی تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ پل ترچھا ہو گیا اور وہ دوزخ میں گر گیا"۔آپؒ نے فرمایا" پھر"؟ اس نے کہا" پھر میں نے آپؒ کو دیکھا کہ آپؒ کو لائے ہیں" اس کا یہ کہنا تھا کہ آپؒ نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئے۔وہ لونڈی اٹھی اور آپؒ کے کان میں پکار پکار کر کہنے لگی"امیر المومنینؒ میں نے دیکھا کہ آپؒ پل صراط سے صحیح وسالم گزر گئے ہیں۔آپؒ نے نجات پالی ہے" ہر چند کہ وہ کان میں چیختی رہی لیکن آپؒ برابر آہ و بکا کے نعرے لگاتے رہے اور پاؤں زور زور سے زمین پر مارتے رہے۔

حضرت عمرؓ بسا اوقات ایک تنکا ہاتھ میں لیتے اور فرماتے کاش میں ایک تنکا ہوتا۔ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے،ایک شخص آیا اور کہنے لگا''فلاں شخص نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔آپؓ چل کر مجھے بدلہ دلوا دیجئے''۔آپؓ نے اس کو ایک درہ مارا کہ جب میں اپنا کام کرنے بیٹھتا ہوں تو اس وقت آجاتے ہیں اور جب لوگوں کے کام کا وقت ہوتا ہے تو اس وقت نہیں آتے۔وہ شخص چلا گیا۔آپؓ نے آدمی بھیج کر اس کو بلوایا اور درہ اس کو دے کر فرمایا''اپنا بدلہ لے لو''۔اس نے عرض کیا''میں نے اللہ کے واسطے معاف کیا''۔آپؓ گھر تشریف لائے دو رکعت نماز پڑھی۔اس کے بعد اپنے آپ کو خطاب کر کے فرمایا''اے عمر تو کمینہ تھا اللہ نے تجھے اونچا کیا،تو گمراہ تھا اللہ نے تجھے ہدایت دی،تو ذلیل تھا اللہ نے تجھے عزت دی،پھر لوگوں کا بادشاہ بنا دیا۔اب ایک شخص آکر کہتا ہے کہ مجھے ظلم کا بدلہ دلواؤ تو تو اس کو مارتا ہے۔کل قیامت کے دن اپنے رب کو کیا جواب دے گا''۔بہت دیر تک اپنے آپ کو ملامت کرتے رہے۔(اسد الغابتہ)

حضرت عمرؓ کے غلام حضرت اسلمؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم حضرت عمرؓ کے ہمراہ حرہ (مدینے کے قریب ایک جگہ کا نام ہے) کی طرف جا رہے تھے ایک گھر میں بچے رو رہے تھے۔ہم نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اجازت لے کر اندر آئے اور پوچھا" بچے کیوں رو رہے ہیں"؟ اس عورت نے بتایا" گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے"۔حضرت عمرؓ نے پوچھا" دیگچی میں کیا ہے"؟ عورت نے کہا" پانی بھر کر بہلانے کے واسطے آگ پر رکھ دی ہے"۔پھر اس عورت نے کہا کہ''عمر کا اور میرا اللہ کے پاس ہی فیصلہ ہوگا کہ میری تنگی کی اس کو فکر ہی نہیں ہے''۔حضرت عمرؓ رونے لگے اور فرمایا" اللہ تجھ پر رحم کرے بھلا عمر کو تیرے حال کی کیا خبر"؟۔اس نے کہا''وہ ہمارے امیر ہیں۔ان کو ہمارے حال کی خبر رکھنی چاہیے"۔حضرت اسلمؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر مجھے ساتھ لے کر واپس آئے اور بیت المال سے آٹا،کھجوریں،پنیر،چربی،کچھ کپڑے اور کچھ درہم لیے۔یہ تمام چیزیں ایک بوری میں اکٹھی کیں اور بوری کو خوب بھر لیا اور کہا کہ''اس بوری کو میری کمر پر رکھ دے''،میں نے عرض کیا کہ''میں لے چلوں'' آپؓ نے پھر فرمایا ''میری کمر پر رکھ دے''۔دو تین مرتبہ جب میں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ''کیا قیامت میں بھی میرے بوجھ کو تو اٹھائے گا''۔اس کو میں ہی اٹھاؤں گا''اس لیے کہ قیامت میں مجھ ہی سے اس کا سوال ہوگا؟''۔عورت نے سامان دیکھا تو خوش ہوئی اور کہا" اللہ تمہیں جزا دے تم اس کے مستحق تھے کہ عمر کے بجائے تم خلیفہ بنتے"۔حضرت عمرؓ نے جواب دیا''جب تم خلیفہ کے پاس جاؤ گی تو مجھے بھی وہاں ہی پاؤ گی''۔ (اشہر مشاہیر منتخب کنز العمال)۔

حضرت عمرؓ صبح کی نماز میں سورہ کہف اور سورہ طٰہٰ بڑی سورتیں پڑھتے اور اتنا روتے کہ کئی صفوں تک آواز جاتی۔نماز میں بعض مرتبہ گر جاتے اور بیمار ہو جاتے۔

حضرت ابن عباسؓ اللہ تعالیٰ کے خوف سے اس قدر روتے تھے کہ چہرے پر آنسوؤں کے ہر وقت بہنے سے دو نالیاں سی بن گئی تھیں۔

عیسیٰ بن مالک خولانی رحمتہ اللہ علیہ جو بڑے عابد تھے ایک راہب کا حال کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کو بیت المقدس کے دروازے پر بڑے ہی غمگین حالت میں دیکھا کہ کثرت گریہ سے اس کے آنسو نہیں رکتے تھے۔ میں نے اس کو دیکھا تو میں ڈر گیا۔ پھر میں نے ہمت کی اور کہا ''اے راہب مجھے کچھ نصیحت کر کہ تجھے یاد رکھوں ''اس نے جواب دیا۔''اے عزیز میں تجھ کو کیا نصیحت کروں اگر ہو سکے تو دنیا میں اس طرح رہنا، گو یا درندوں اور زہریلے جانوروں نے گھیر لیا ہے اور تو ہراساں اور خائف ہے کہ ذرا سی غفلت پر درندے چیر پھاڑ ڈالیں گے۔ یا چوک جائے گا تو زہریلے جانور کاٹ لیں گے۔ غرض رات دن تیرا دل خوف و ہراس میں رہے'' پھر راہب جانے لگا تو میں نے کہا کہ اور کہتے تو شاید اور زیادہ نفع دیتا۔ اس نے کہا'' پیاسے کو جتنا پانی مل جاتا ہے کافی ہوتا ہے''۔ اور یہ اس نے درست کہا اس لیے کہ صاف دل کو ادنیٰ سا خوف ہلا دیتا ہے اور کٹھن دل سخت دل واعظ اور نصیحت سے بھی نرم نہیں ہوتا۔ اگر آدمی نور عقل سے اپنے باطن کو دیکھے تو معلوم ہوگا کہ بہت قسم کے درندے اور زہریلے جانور سے پُر ہے۔ مثلاً غضب اور شہوت، کینہ اور حسد، کبر اور عجب، ریا اور منافقت جو ہمیشہ اس کو چیرتے اور ڈنگ مارتے رہتے ہیں لیکن آدمی کو ان کا گزند اور تکلیف دینا دیکھائی نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ پردہ اٹھا لیا جائے اور آدمی قبر میں رکھ دیا جائے۔ اس وقت نظر آئے گا کہ سانپ اور بچھو قبر میں آکر بدن کو گھیر لیں گے پس اگر ان کو مار ڈالنا منظور ہے تو مرنے سے پہلے یہ بات آدمی کے اختیار میں ہے تو اس سے ہر گز نہیں چوکنا چاہیے۔ اور ان کا کاٹنا اور نوچنا خوب اچھی طرح دل و جان سے جان لینا چاہیے اور ہر وقت خوف خدا سے لرزتے رہنا چاہیے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا خوف خداوندی:- حضرت حذیفہؓ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے ایک صحابی تھے۔ ان کے والد ایک ایسے جنگی معرکے میں شریک ہوئے جس میں حضرت حذیفہؓ بھی شامل تھے۔ دشمنوں سے مقابلہ کرتے ہوئے حضرت حذیفہؓ کے والد کچھ ایسے دشمنوں کے درمیان آ گئے۔ جن کو باقی صحابہؓ نے گھیر رکھا تھا۔ اب مسلمانوں کی تلواریں چل تو کفار پر رہیں تھیں لیکن اس کی زد میں حضرت حذیفہؓ کے والد بھی آ جاتے تھے۔ اگر حضرت حذیفہؓ کے والد کو اس نرغے سے نکالتے تو دشمن کو فرار ہونے کا پورا موقع مل جاتا۔ مسلمان حضرت حذیفہؓ کے والد کو بچانے کی پوری کوشش کرتے رہے۔ لیکن جب دشمن ختم ہو گئے۔ تو حضرت حذیفہؓ کے والد بھی سخت زخمی ہو چکے تھے۔ پھر بعد میں وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے شہید ہو گئے۔ حضرت حذیفہؓ یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ یہ تمام نقشہ حضرت حذیفہؓ نے آپ خاتم النبیین ﷺ کو بھی بتایا۔ پھر اکثر حضرت حذیفہؓ اپنے والد کی اس تکلیف کو یاد کرتے اور بہت روتے۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت حذیفہؓ سے فرمایا "حذیفہؓ اگر میں تجھے کار نبوت میں شامل کر لوں تو کیا تو اپنے والد کے شہید ہونے والے واقعہ کو بھول جائے گا"؟ حضرت حذیفہؓ نے کہا'' یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ میرے ماں باپ آپ خاتم النبیین ﷺ پر قربان میں کیوں ایسا نہیں کروں گا"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے حضرت حذیفہؓ کو منافقین کے نام بتائے منافقین تمام لوگوں کی نگاہوں سے چھپے ہوئے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ خاتم النبیین ﷺ کو ان کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اور یہ اس وجہ سے تھا کہ منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے منع کر دیا تھا۔ باقی تمام لوگوں کو ان چھپے ہوئے دشمنوں کا پتہ نہ تھا۔ جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے۔ اور اندر سے مشرک یا کافر تھے"۔(منافقین)

حضرت عمرؓ نے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے پردہ فرما جانے اور خلیفہ اوّل حضرت ابو بکر صدیقؓ کے زمانے کے بعد جب اپنا زمانہ آیا تو حضرت حذیفہؓ کو بلایا اور کہا'' حذیفہ اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ نے تمہیں کار نبوت میں سے منافقین کے نام بتائے تھے تو کیا تم مجھے وہ بتا سکتے ہو"؟ حضرت حذیفہؓ نے جواب دیا" امیر المومنین جب آپ خاتم النبیین ﷺ نے یہ نام میرے علاوہ کسی اور کو نہیں بتائے تو میں آپؓ کو یہ نام کیسے بتا سکتا ہوں"؟ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا" یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو" اور خاموش ہو گئے۔ لیکن پھر دوسرے دن حضرت حذیفہؓ سے کہا" حذیفہ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے آپ کو منافقین کے نام نہ بتانے کو کہا تھا ان کی تعداد بتانے کو تو منع نہیں فرمایا تھا۔ مجھے ان کی تعداد بتا دیں"۔ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا" امیر المومنین ان کی تعداد آج کے دن 28 ہے" حضرت عمرؓ نے کہا" اچھا 28 ہیں" اور خاموشی اختیار کر لی۔

اس کے بعد جب کسی مسلمان کا انتقال ہوتا۔ حضرت عمرؓ حضرت حذیفہؓ کو اطلاع کرواتے اور جنازے میں شرکت کے لئے بلواتے۔ حضرت حذیفہؓ آ جاتے اور اگر کسی منافق کا انتقال ہوتا تو حضرت حذیفہؓ شامل نہ ہوتے کوئی بہانہ کر دیتے۔ حضرت عمرؓ یہ نوٹ کرتے رہے کہ حضرت حذیفہؓ کن کن لوگوں کی نماز جنازہ میں نہیں آئے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی تعداد گنتے رہے۔ حضرت عمرؓ کی شہادت سے دو سال قبل تک ان لوگوں میں سے 27 لوگ فوت ہو چکے تھے۔ اب صرف ایک منافق باقی رہ گیا تھا۔

آپؓ کی شہادت سے پونے دو سال پہلے ایک شخص کا انتقال ہوا۔ حضرت عمرؓ نے پھر حضرت حذیفہؓ کو اطلاع دی۔ لیکن دیکھا اور معلوم کیا تو پتہ چلا کہ حذیفہؓ

نہیں آئے۔حضرت عمرؓ بھی واپس آ گئے۔اور سجدے میں گر کر روتے رہے اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہے کہ "شکر ہے باری تعالیٰ میں منافقین میں شامل نہیں تھا"۔

یہ ہے خدا خوفی کہ آپؐ کے زمانے سے لے کر آخری منافقین کے مرنے تک حضرت عمرؓ اس بات سے ڈرتے رہے کہ کہیں میں تو منافق نہیں ہوں؟

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا معمول تھا کہ روزانہ رات کو علما کے مجمع کو بلاتے جو موت کا، قیامت کا، اور آخرت کا ذکر کرتے اور ایسا روتے جیسا کہ جنازہ سامنے رکھا ہو۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ'' آدمی مسکین پر اگر کوئی آفت، کوئی مصیبت، کوئی حادثہ کوئی رنج کوئی تکلیف، کوئی مشقت کوئی خوف کبھی بھی نہ آئے۔تب بھی موت کی سختی نزاع کے وقت کی سختی، قبر کی حالت، روزمحشر کی حاضری کا خوف ہی اس کی دنیا کی تمام لذتوں کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔بالخصوص ایسی حالت میں کہ اس کا وقت معلوم نہیں کہ کب آ جائے؟۔رسی کسی اور کے ہاتھ میں ہے معلوم نہیں کب کھینچ لی جائے''؟۔

حضرت سلمانؓ کا جب انتقال کا وقت قریب ہوا تو وہ رونے لگے۔کسی نے کہا'' رونے کی کیا بات ہے تم جا کر حضور پاک خاتم النبیین ﷺ سے ملو گے۔حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کا وصال اس حالت میں ہوا کہ وہ تم سے راضی تھے'' فرمانے لگے میں "موت کے ڈر سے نہیں، نزاع کے وقت کے خوف سے نہیں رو رہا ہوں۔نہ مجھے دنیا کے چھوٹنے کا غم ہے، لیکن ایک بات کا خوف میرے دل میں ہر وقت رہا اور اب بھی یہی خوف کھا رہا ہوں کہ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے ہم سے ایک عہد لیا تھا کہ دنیا میں اس طرح رہنا جیسے ایک مسافر میں اس عہد کو پورا نہ کر سکا''۔لیکن وصال کے بعد جب ان کے گھر کا سامان دیکھا تو کل سامان کی قیمت 10 درہم سے کچھ زائد تھی۔ یہ تھی وہ متاع جس کی زیادتی پر ساری عمر خوف کھاتے رہے اور موت کے وقت بھی خوف کھا رہے تھے۔

حضرت موسیٰؑ کی حدیث میں ہے "اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ارشاد فرمائیں گے'' کوئی شخص ایسا نہیں رہے گا جس کا حساب میں نہ کروں گا اور اس کے عمل کی تفتیش میں نہ بجا لاؤں گا بجز اہل ورع (پرہیزگار، خوف خدا رکھنے والے) کہ ان سے مجھ کو شرم آتی ہے اور ان کی قدر اس بات سے زیادہ ہے کہ ان کو میں حساب لینے کے لیے کھڑا کردوں''

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس کا دل نرم ہو جاتا ہے اور خدائے تعالیٰ سے اس کی محبت پختہ ہو جاتی ہے اور عقل درست ہو جاتی ہے۔اور یہ بھی ان ہی کا قول ہے کہ'' خوف الٰہی امید کی نسبت زیادہ ہونا چاہیے''۔

ابوالحسنؒ نابینا کہا کرتے تھے'' سعادت کی پہچان یہ ہے کہ بدبختی کا خوف آدمی کو ہر وقت رہے۔اس لیے کہ خوف بندے اور خدائے تعالیٰ کے درمیان ایک باگ ہے۔جب یہ جاتی رہتی ہے تو بندہ تباہ ہو جاتا ہے''۔

کسی نے حضرت یحییٰ بن معاذؒ سے پوچھا "سب سے زیادہ قیامت میں بے خوف کون ہوگا"؟ فرمایا "جو دنیا میں سب سے زیادہ خوف کرنے والا ہوگا''۔

حضرت حسنؒ سے بعض لوگوں نے کہا کہ'' ہم کیا علاج کریں کہ ہم ایسے لوگوں میں بیٹھتے ہیں جو ہم کو اتنا ڈراتے ہیں گویا کہ ہمارے دل اڑنے لگتے ہیں''۔آپؒ نے فرمایا "اس بات کو خوب جان لو کہ ایسے لوگوں میں بیٹھنا جو تم کو ڈرائیں۔یہاں تک کہ تم کو امن میں پہنچا دیں اس سے بہتر ہے کہ تم ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھو کہ وہ تم کو بے خوف کر دیں اور پھر تم کو ایک دفعہ ہی خوف آن گھیرے''۔------حضرت ابوسلمانؒ فرماتے ہیں "جس دل سے خوف الگ ہو جاتا ہے وہ خراب ہو جاتا ہے''۔

حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں "جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو یہ خوف اس کو ہر طرح کی بہتری سوجھا دیتا ہے"۔

حضرت شبلیؒ کا قول ہے "جب میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں تو میرے سامنے ایک دروازہ علم و حکمت کا ایسا کھل جاتا ہے جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوتا"۔

حضرت ابوسلمانؒ درانی فرماتے ہیں "جس کی آنکھ آنسوؤں سے ڈبڈبا جائے گی قیامت کے دن اس کے چہرے پر غبار اور ذلت نہیں آئے گی اور اگر اس کے آنسو بہہ نکلیں گے تو اول ہی قطرے سے بہت سے آگ کے سمندر سرد ہو جائیں گے اور اگر کوئی شخص کسی جماعت میں روئے تو اس پوری جماعت کو عذاب نہ ہوگا"۔

حضرت کعب الاحبارؓ فرماتے ہیں'' بخدا اللہ تعالیٰ کے خوف سے اس طرح رونا کہ آنسو میرے رخسار پر بہہ نکلیں مجھے اس بات سے اچھا معلوم ہوتا ہے کہ میں ہزار دینار خیرات کروں۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے فرمایا'' اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ دوزخ میں صرف ایک شخص جائے گا تو مجھے خوف ہے کہ وہ شخص میں ہی ہوں گا اور اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ جنت میں صرف ایک شخص جائے گا تو میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ وہ میں ہونگا''۔

تو مومن ایسا ہے گویا اس کے دو دل ہیں۔اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ بندہ خوف زیادہ رکھے یا امید؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال ہی فاسد ہے اور ایسا ہے کہ کوئی پوچھے کہ روٹی بہتر ہے یا پانی؟۔اب اس کا جواب یہی دیا جا سکتا ہے کہ بھوکے کو روٹی بہتر ہے اور پیاسے کو پانی۔اور اگر کسی کو بھوک اور پیاس دونوں ہیں تو

دونوں میں سے جو چیز غالب ہوگی اس کا اعتبار ہوگا۔ اگر پیاس غالب ہے تو پانی افضل ہوگا اور اگر بھوک غالب ہے تو روٹی افضل ہوگی۔ اس لیے کہ جو چیز کسی مقصود کے لیے مطلوب ہوتی ہے تو اس کی خوبی اس مقصود کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ نہ کہ خود اپنی ذات کے لحاظ سے امید اور خوف دو دوائیاں ہیں جن سے دلوں کا علاج ہوتا ہے تو ان کی خوبی اس قدر ہوگی جس قدر روگ موجود ہوگا۔ پس اگر دل پر مرض خدا سے بے خوف ہونے کا ہے (عذاب سے بے خوف ہونے کا) اور مغرور ہونے کا اندیشہ ہے تو اس صورت میں خوف بہتر ہے اور افضل یہی ہوگا کہ اسے خوف خدا سے ڈرایا جائے''۔ اور اگر دل پر یاس اور قنوط (نا امیدی اور بے چینی) غالب آ گیا ہو تو اس کے لیے امید دلانا افضل ہوگا۔ اس لیے کہ امید کا منبع بحر رحمت ہے۔ **مگر ایک ایسا متقی شخص جس نے ظاہری اور باطنی گناہ چھوڑ دیئے ہیں۔ اس کے حق میں بہتر یہ ہے کہ خوف اور امید دونوں اعتدال کے ساتھ ہم پلور ہیں۔ اس لیے کہ ایک مشہور قول ہے کہ مومن وہ ہے کہ جس کے دل کا خوف اور امید اگر تولی جائے تو دونوں برابر ہوں۔**

عام آدمی کو اگر یہ گمان ہو جائے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو دوزخ میں نہیں جائیں گے تو یہ صورت اس کے لیے مغالطہ کھانے کی ہو جائے گی''۔ اس لیے حضرت یحییٰ بن معاذؒ کا قول ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت صرف خوف سے کرے گا وہ فکر کے سمندر میں ڈوب جائے گا اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت صرف امید سے کرے گا تو وہ وادی مغالطہ میں سرگشتہ رہے گا اور جو شخص خوف، امید اور محبت سے عبادت کرے گا تو طریق ذکر میں مستقیم رہے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان تینوں چیزوں کا جمع رہنا ضروری ہے لیکن مناسب خوف کا غلبہ ہے، جب تک موت سامنے نہ آئے اور مرنے کے وقت غلبہ امید کا مناسب تر ہے، کیونکہ نزاع کی صورت میں عمل کا وقت تو گزر گیا ہے نہ اب خوف برداشت ہو سکتا ہے۔ اس سے توکل کا مرنے والا آج مر جائے گا۔ ہاں اس وقت امید کی صورت میں دل کو تقویت ہوتی ہے اور جس ذات پاک سے امید ہوتی ہے اس کی محبت دل میں سما جاتی ہے اور آدمی کو یہ ہی مناسب بھی ہے کہ جب دنیا سے کوچ کرے تو محبت الٰہی ہی میں کرے تا کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنا اچھا معلوم ہو۔ کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنے کو پسند کرتا ہے اللہ بھی اس سے ملاقات کو پسند فرماتا ہے اور یہ صورت امید میں بن جاتی ہے اس لیے کہ محبت امید سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ موت سے پہلے غلبہ خوف کا بہتر ہے اور موت کے وقت امید کا غلبہ بہتر ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے بیٹے سے فرمایا کرتے تھے "موت کے وقت امید کی باتیں اللہ تعالیٰ سے حسن ظن پیدا کرتی ہیں"۔

حضرت سفیان ثوریؒ کو نزاع کا علم ہوا تو انہیں خوف بہت زیادہ معلوم ہوا۔ انہوں نے اپنے اردگرد بیٹھے ہوئے علما کرام کو کہا "مجھے امید دلائیں اور توقع دلائیں''۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے اپنے بیٹے کو نزاع کے وقت ارشاد فرمایا ''مجھے وہ احادیث سناؤ جس میں امید اور حسن ظن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس سے ان کا مقصد اس وقت اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب حقیقی کی صورت میں پا لینا تھا۔ اسی بنا پر حضرت داؤدؑ پر وحی آئی تھی کہ اے داؤدؑ مجھ کو میرے بندوں کے درمیان محبوب کر دے۔ انہوں نے عرض کیا اے باری تعالیٰ میں تجھے تیرے بندوں کے درمیان کیسے محبوب بناؤں؟ ارشاد ہوا کہ میرے انعامات اور احسانات ان کو کھول کھول کر دکھا دے (سنا دے)''۔

حضرت سہیل تستریؒ فرماتے ہیں کہ ''میں نے خواب میں دیکھا کہ میں جنت میں گیا ہوں اور میں نے تین سو پیغمبروں سے ملاقات کی ہے۔ ان سب سے میں نے پوچھا کہ دنیا میں آپ سب سے زیادہ کس چیز کا خوف کیا کرتے تھے۔ ان سب ہی نے یہ جواب دیا کہ ''سوء خاتمہ سے'' (برے خاتمے سے)

حضرت فضیلؒ مشہور بزرگ ہیں ان کا کہنا ہے کہ ''اللہ کا خوف ہر خیر کی رہبری کرتا ہے"۔

حضرت سلیمان درانیؒ فرماتے ہیں "جس دل سے اللہ کا خوف جاتا رہتا ہے وہ برباد ہو جاتا ہے"۔

حضور پاک خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خوف الٰہی کا یہ عالم تھا کہ ابر اور آندھی کو دیکھ کر پہلی قوموں کے عذاب یاد آ جاتے ہیں اور آپ خوف زدہ ہو جاتے۔

اس لیے دین کے ہر کمال کا زینہ اور حکمت کی جڑ یہ ہے کہ اللہ کے خوف کو دل میں بسا لیا جائے۔ توبہ استغفار کا راستہ پکڑا جائے جو ہمارے اسلاف کا طریقہ تھا انشاء اللہ بیڑا پار ہونے کی امید ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو معاف فرمائے اور ان تمام باتوں سے سبق سیکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

****

محبت اور مذہب

مذہب کیا ہے؟　　اللہ تعالیٰ کی محبت کے سانچے میں ڈھل جانا۔ اوراس کی پہچان مذہب ہے۔

محبت کیا ہے؟　　کسی کو چاہنا اس سے پیار کرنا محبت ہے۔ محبت دل یزداں کی نوری تجلی ہے۔ حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ میں وہ تجلی راست ہے (Direct) صحابہ کرامؓ میں وہ تجلی بلواسطہ ہے۔ اولیاء کرامؒ میں وہ تجلی تواتر سے ہے۔ یہ نور سینہ بہ سینہ آیا ہے۔ ایک سینہ دوسرے کے لیئے شجر ہوتا ہے۔ یہ تجلی ایسی ذات سے آتی ہے جس کے لیئے سب ممکن ہے۔ ناممکن کچھ نہیں ہے۔ اسی لیئے اولیاء اللہ برسوں کے مردے زندہ کر دیتے ہیں۔ اور وہ کچھ وجود میں لے آتے ہیں۔ جہاں انسانی خیالوں کی رسائی تک نہیں جاسکتی۔ یہ اِس لیئے کہ محبت دل یزداں سے آتی ہے۔ یہ اُن کے اختیارات لے کر آتی ہے۔ پھر جس پر تجلی وارد ہوتی ہے اُس کے اختیارات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس مقام سے آئی ہے۔ جتنی ذات بلند ہوتی ہے۔ اتنی ہی اُس کی عظمت اختیارات کے بانٹنے میں ہوتی ہے۔

ایمان کی اساس محبت پر رکھی گئی ہے۔ اِس لیئے اللہ تعالیٰ کو جو توحید سے یاد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے تائید سے یادفرماتا ہے۔ جو خدمت سے یاد کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں نعمت سے یادفرماتا ہے۔ جو خوف سے یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں امان سے یادفرماتا ہے۔ اور جو اُس کو محبت سے یاد کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں قرب سے یادفرماتا ہے۔ اور جس نے مقام محبت میں قدم رکھا اُسے بھٹی میں تپنا پڑے گا۔ پھر کھرا اور کھوٹا الگ الگ ہوں گے۔ پھر دام لگیں گے اِس لیئے محبت کا دعوٰی نہ کریں۔ مدعی پر رحم نہیں کیا جاتا اُس کا امتحان ہوتا ہے۔ جو اللہ سے اُس کا فضل وکرم چاہتے ہیں وہ کبھی بھی دعوٰی نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ اپنے سے محبت کرنے والوں کو اُن کی صلاحیت کے مطابق خدمتیں سپرد کرتے ہیں۔ اِس لیئے تمام چاہنے والوں کو اللہ کا دوست (اولیاء اللہ) ہی کہا جاتا ہے۔ تعلق کا مقام دوست کے دل میں ہوتا ہے۔ اس لیئے اولیاء اللہ کا تقابل نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے نسبت (محبت) کی بنا پر سب قابل احترام ہیں۔

رب سے محبت کرنے والے جب رب کو پکارتے ہیں تو اُن کے قلوب پر انوارات کا نزول ہوتا ہے۔ جب تک یہ اولیاء اللہ دعا مانگتے رہتے ہیں عرش سے لے کر اُن کے ہاتھ تک نور کی بارش ہوتی رہتی ہے اور اس دعا کے رد ہونے کا امکان نہیں ہوتا۔

محبت فطری و بنیادی چیز ہے اور نفرت انقطاع محبت کا نام ہے۔ جو کسی حادثہ یا تصادم کا نتیجہ ہوتی ہے۔ محبت تمام نیکیوں کا سرچشمہ اور تمام جذبات عالیہ کی خالق ہے اس محبت سے آواز میں لوچ، بات میں شرینی، چہرے پہ حسن، رفتار میں انکساری اور کردار میں وسعت آتی ہے۔

دوسری طرف غصہ نفرت انتقام اور حسد دنیائے دل کو ویران اور چہرے کو بے نور اور خوفناک بنا دیتے ہیں- حاسد اور سازشی کی رفتار تک ناہموار ہو جاتی ہے اور وہ ہر طرف نفرت پھیلاتا ہے۔ اہل محبت نفرت کا جواب محبت سے دیتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ اگر ہم اہل دنیا سے محبت کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہم سے محبت کرے گا۔ اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ''دنیا سے بہترین سلوک کرو جواباً تم سے بہترین سلوک کیا جائے گا'' جن لوگوں کے دل میں اللہ بس جاتا ہے۔ ان کی پہچان ہی یہی ہے کہ وہ ہر شخص سے محبت کرتے ہیں خطا کاروں کی خطائیں بخشتے ہیں اور گالیوں کے جواب میں دعائیں دیتے ہیں۔ تمام انبیاء اولیاء کا وطیرہ یہی تھا۔

قرآن پاک کی تعلیم بھی یہی ہے کہ دشمن سے اتنا عمدہ سلوک کرو کہ وہ تمھارا مخلص دوست بن جائے۔ لیکن یہ مقام بلند انہی لوگوں کو مل سکتا ہے۔ جو زمانے کی تلخیاں برداشت کر سکتے ہوں (صبر) اور کردار عظیم کے مالک ہوتے ہیں۔

گویا محبت اور نفرت قلب انسانی کے دو مکین ہیں۔ جیسے اندھیرا اور اجالا یکجا نہیں ہو سکتے۔ ویسے ہی محبت اور نفرت بھی یکجا نہیں ہوتی۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے انسان کے اختیار میں رکھی ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنے قلب میں بسالے۔ محبت کے روپ میں اللہ تعالیٰ اور نفرت کے روپ میں شیطان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت ظاہر کی تو ذات مصطفی خاتم النبیین ﷺ بنائی۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے اپنی محبت کا اظہار فرمایا تو آفتاب ولایت قائم فرمایا۔ جو حضرت علیؓ شیر خدا کی ذات اقدس ہے اَب انسان تو پستی میں ہے۔ اِس کی منزل بلندیوں پر ہے۔ اُن بلندیوں تک پہنچنے کے لیئے دامان مصطفی خاتم النبیین ﷺ کی وابستگی ضروری ہے۔

ایک مغربی مفکر کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''نفرت نفرت سے ختم نہیں ہوسکتی۔ اس پر محبت سے غلبہ حاصل کرو۔ دنیا کو محبت کرنا سکھاؤ تو جنت اپنی تمام تر رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ یہیں نمودار ہو جائے گی۔''

ہر دل شکار ہے کوئی محبت دنیا کا شکار ہے اور کوئی محبت آخرت کا۔ جو جس کا شکار ہے اُسے شکاری کے مزاج کے مطابق ڈھلنا ہوتا ہے۔ جو محبت دنیا کا شکار ہے۔ وہ ویسا ہی بن جاتا ہے جیسا یہ دنیا چاہتی ہے اور جو محبت آخرت کا شکار ہے۔ وہ ویسا ہی بن جاتا ہے۔ جیسا اللہ اور اُس کے محبوب حضرت محمد خاتم النبیین ﷺ چاہتے ہیں۔ صرف وہی کامیاب ہے جو محبت آخرت کا طلب گار ہو۔

آب محیط عشق کا بحر عجیب بحر ہے
تیرے تو غرق ہو گئے ڈوبے تو پار کر گئے

ترک محبت موت ہے۔ جو شخص سب سے محبت کرتا ہے۔ اس کی زندگی بھرپور اور کامل ہوتی ہے۔ اور اس کی زیبائی اور توانائی میں سدا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ محبت کا سب سے بڑا وصف انکساری ہے۔ دوسروں سے نفرت کرنے والے کرخت مغرور تند مزاج اور بدمزاج ہوتے ہیں۔ اہل محبت بول میں میٹھے، چال میں دھیمے اور مزاج کے نرم ہوتے ہیں قرآن اور توراۃ دونوں میں ان اوصاف کو آسمانی دانش کہا گیا ہے۔ اور اس بات میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ غرور حماقت ہے اور تواضع بہت بڑی دانش مندی ہے۔

کسی دانا نے کیا خوب کہا ہے:

ترجمہ: ''اگر دانش (عقل) حاصل کرنا چاہتے ہو تو انکساری پیدا کرو اور اگر انکسار حاصل کر چکے ہو تو زیادہ خاکسار بنو۔''

محبت رحم، مروت، خوش خلقی۔ گداز اور نیاز سے جسم میں وہ طاقت پیدا ہوتی ہے۔ جو بیماری کے اثر کو زائل کر دیتی ہے۔ جو ذات شکم مادر میں بچے کی صورت گری کرتی ہے۔ وہی خیال اور احساس کی صورت گری بھی ہے۔ پیدا فرمانے والے نے چہروں کو تاثیر دینے والا بنایا اور قلوب کو تاثیر قبول کرنے والا، آنکھوں کو بینائی دینے والا، نظاروں کو رعنائی عطا فرماتا ہے وہ خود ہی دل پیدا کرتا ہے۔ اور خود ہی دلبر پیدا فرماتا ہے۔ اور خود ہی دلبری کا خالق ہے۔

زمین کے سفر میں اگر کوئی چیز آسمانی ہے تو وہ محبت ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ کی محبت ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ کوئی ہستی آپ خاتم النبیین ﷺ کے اخلاق کا نمونہ پیش نہ کر سکی۔ اگر سکھانے والے سے محبت نہ ہو تو سیکھنے والا کبھی کچھ نہ سیکھ پائے گا۔ اگر پیغمبر سے محبت نہ ہو تو پھر اللہ یا اسلام سے محبت نہیں ہو سکتی۔ عشق نور حقیقت ہے یہ نور جہاں سے بھی عیاں ہو گا عاشق کے لئے محبوب ہو گا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ **مجاز کیا ہے؟ اور حقیقت کیا ہے؟ دراصل مجاز بذات خود ایک حقیقت ہے۔ اور یہ حقیقت اُس وقت تک مجاز کہلاتی ہے جب تک رقیب ناگوار ہو۔ جس محبت میں رقیب قریب اور ہم سفر ہو وہ عشق حقیقی ہے۔ اپنا عشق اپنا محبوب اپنے تک ہی محدود رکھا جائے تو مجاز اور اگر اپنی محبت میں کائنات کو شریک کر لینے کی خواہش ہو تو حقیقت، رانجھے کا عشق مجاز ہو سکتا ہے لیکن وارث شاہ کا عشق حقیقی ہے۔ عشق نبی خاتم النبیین ﷺ عشق حقیقی ہے عشق آل نبی خاتم النبیین ﷺ حقیقی۔ عشق اصحابہ نبی خاتم النبیین ﷺ عشق حقیقی۔ اقبالؒ کا عشق بھی عشق حقیقی ہی کہلائے گا۔ پیر کامل کا عشق عشق نبی خاتم النبیین ﷺ ہی کہلائے گا۔**

حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کو نور خدا کہا جاتا ہے اور ولی چونکہ مظہر عشق نبی ہوتا ہے تو اسے بھی مظہر عشق نبی یا مظہر نور خدا کہا جا سکتا ہے۔ دراصل محبت ہی وہ آئینہ ہے جس میں انسان اپنی اصل شکل، باطنی شکل، حقیقی شکل دیکھتا ہے۔ محبت ہی قدرت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ لیکن ''جس تن لاگے سو تن جانے''۔

محبت ہی کے ذریعے انسان پر زندگی کے معنی منکشف ہوتے ہیں۔ کائنات کا حسن اس آئینے میں نظر آتا ہے۔ محبت تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں اس لئے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے محبت کے جو نمونے چھوڑے وہ رہتی دنیا تک نمونہ ہیں۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے ہمیں بتایا کہ نیکی یہ ہے کہ برائی کا جواب نیکی سے دیا جائے۔ اچھائی کا جواب اچھائی سے دیا جائے تو یہ تو بدلہ ہوا نیکی کیا ہوئی؟

دین اسلام کا سب سے بڑا رکن کلمہ پڑھنے کے بعد نماز ہے۔ نماز اسلام کا سب سے زیادہ مطلوب اور بنیادی فریضہ ہے۔ اسی لئے اس کی طرف بہت توجہ دلائی جاتی ہے۔ چنانچہ ہر وہ شخص جو دین کی طرف راغب ہوتا ہے وہ نماز کی پابندی سے اپنی دین داری کا آغاز کرتا ہے۔ اس طرح معاشرے میں نمازیوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے۔

مسجدیں آباد ہو رہی ہیں۔ اذان و اقامت کی آوازوں سے فضا معمور ہے لیکن آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ جو جذبات اور جو محبت نبی کریم خاتم النبیین ﷺ

کے ساتھیوں میں دین سے محبت کے بارے میں تھی وہ اب نظر نہیں آتی اس کی وجہ یہ ہے کہ اب ہم نماز کی روح کو نہیں سمجھ رہے۔ ہمارے ہاں آج کے دور میں نماز کی جتنی اہمیت اور پابندی ہے وہ اس کے ظاہر کے لحاظ سے ہے۔ ہمارے ہاں نمازی وہ ہے جس کے روزمرہ کے معمولات میں نماز ادا کرنے اور مسجد جانے کی مصروفیت بھی شامل ہے۔ بلاشبہ یہ عین مطلوب ہے۔لیکن دراصل یہ نماز کا نقطۂ آغاز ہے اس فریضے کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے۔ جب نماز قرآن پاک کے الفاظ میں ''ذکر'' (خدا کی یاد) کا ذریعہ بن جائے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں نماز قائم کرو کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔قرآن پاک ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کا ایک بیش قیمت عطیہ ایسی علمی صورت میں موجود ہے کہ جس کا علم تا قیامت ظاہر ہوتا رہے گا۔جبکہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کا وہ قیمتی اثاثہ ہیں جن کے عمل کے فوارے روزِ محشر تک ہر کسی کو محبت اور عمل کا پیغام دیتے رہیں گے ان دونوں قیمتی اثاثوں کے بعد مسلمانوں کو کسی اور کی رہبری اور رہنمائی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

نماز ادا کرنے کا عمل بہت ہی خاموشی سے بندے کی محبت اللہ تعالیٰ سے ظاہر کر دیتا ہے اصل میں نماز ادا کرنے کا عمل انسان پر اس طرح اثر انداز ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اس کے خیالات پر چھا جائے اور انسان اللہ تعالیٰ سے رابطے میں آ جائے۔ اگر ہماری نماز مطلوبہ اثرات مرتب نہیں کر رہی تو کہیں نہ کہیں ہم سے غلطی ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نماز پڑھتے ہیں۔ پھر بھی جھوٹ بولتے ہیں انسانوں کو حقیر سمجھتے ہیں سود کا کاروبار کرتے ہیں۔غرض وہ سب کچھ جو ایک بے نمازی کر سکتا ہے۔ وہ ہمارے ہاں نمازی حضرات بھی کرتے ہیں ایسے میں ضرورت ہے کہ نماز کی ''مدح'' یا نماز کے داخلی پہلو کے یعنی ''ذکر'' خدا کی یاد کو پوری طرح سے اجاگر کر کے نماز میں جو محبت کا پیغام اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اس کی وضاحت کی جائے یا لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی اہمیت کا احساس اور اس ذات باری تعالیٰ کے حصول کی خواہش پیدا ہو۔

اللہ تعالیٰ کی یاد کے حوالے سے نماز میں دو چیزیں نظر آتی ہیں:-

۱۔ اوّل اللہ تعالیٰ کی بڑائی　　　　۲۔اللہ تعالیٰ کی پاکی کا بیان

نماز میں اللہ اکبر اور سبحان اللہ سب سے زیادہ دہرائے جانے والے الفاظ ہیں۔ بلکہ یہ دو ایسی حقیقتیں ہیں جو انتہائی محبت سے انسانی نفسیات اور نتیجہ میں انسان کے عمل کو یکسر بدل دیتیں ہیں۔سب سے پہلے ''اللہ اکبر'' کو لیتے ہیں۔

یہ کلمہ انسان کو بار بار یاد دلاتا ہے۔ کہ اس کا معبود ایک بہت بڑی ہستی ہے وہ سب سے بڑی ہستی ہے۔انسان جو فطری طور پر کسی بڑے کی پکڑ سے ڈرتا ہے جب اللہ تعالیٰ کا یہ تعارف بار بار حاصل کرتا ہے۔تو پہلے دوران نماز ذہن کی دنیا میں اللہ کے سامنے چھوٹا ہو جاتا ہے۔اور پھر نماز سے باہر عمل کی دنیا میں بھی اس کے سامنے انتہائی محبت سے اپنا سر جھکائے رکھتا ہے۔اور جب کوئی ایسا لمحہ اس کے سامنے آتا ہے جب وہ طاقتور ہوتا ہے۔ کہ ظلم کرے یا آزاد ہوتا ہے۔ کہ زیادتی کرے یا بااختیار ہوتا ہے۔ کہ کسی کا حق مارے تو وہی نماز والا بڑا اللہ اسے یاد آ جاتا ہے۔اور پھر وہ طاقتور آزاد اور بااختیار انسان چھوٹا ہو جاتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے۔ کہ وہ اس بڑے اللہ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ جو اگر رحمان ہے رحیم ہے اور کریم ہے تو وہ جبار اور قہار بھی ہے پھر مجمع تو در کنار وہ تنہائی میں بھی گناہ کا تصور نہیں کرتا وہ دین اور فطرت کی حدود کو نہیں توڑتا۔نماز کے ہر حکم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا محبت سے دیا ہوا یہ پیغام ''اللہ اکبر'' کی یاد دہانی انسان کو پابند کر دیتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی بڑائی کو مانے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرے۔

تکبیر کے ساتھ نماز کی دوسری یاد دہانی تسبیح سے ہے۔ **تسبیح کیا ہے؟**

تسبیح اس بات کا اعتراف ہے کہ اللہ بے عیب ہے، ہر کمی اور ہر غلطی سے پاک ہے وہ ایسا ہے جیسا کہ اس کی اعلیٰ اور عظیم ہستی کو ہونا چاہیے۔انسان نماز کا آغاز اس حقیقت کے اقرار سے کرتا ہے۔ رکوع میں اس بات کو مان کر جھک جاتا ہے۔اور سجدے میں اس حقیقت کے اعتراف میں اپنا ماتھا زمین پر رکھ دیتا ہے۔قربان اس ذات پر جس نے نہایت محبت کے ساتھ ایک ایسا لفظ ہماری زبانوں سے جاری کروا دیا جس کی گہرائی تک ہم پہنچ ہی نہیں سکتے۔

اللہ تعالیٰ کے ''سبحان'' ہونے کو جاننا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔اس حقیقت کو جانے بغیر ایک طرف انسان اللہ سے وہ کچھ منسوب کرتا ہے۔ جو اسے شرک تک پہنچا دیتا ہے تو دوسری طرف بندے اور رب کے درمیان جو اعتماد اور محبت کا تعلق ہونا چاہیے اور جو حقیقت روح کی غذا ہے۔ وہ کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ تسبیح کا عمل ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ نہ بے بس ہے نہ بے حس ہے نہ وہ رعایا سے بے پروہ ہے۔ نہ ثبوت و گواہی کے لئے محتاجِ قانون-وہ تو پاک ہے عظیم ہے وہ اعلیٰ ہے اس دن کا مالک جو بہت جلد آنے والا ہے۔جس دن ہر سرکش اور ظالم کا ٹھکانہ جہنم اور ہر نیکوکار کا مقام جنت کی ابدی نعمتیں ہوں گی چنانچہ تسبیح انسان کو نہایت ہی محبت کے ساتھ بے عملی سے بچا کر مشکل ترین حالات میں بھی انسان کو اللہ تعالیٰ کے آگے جھکائے رکھتی ہے۔

اس طرح نماز کے یہ داخلی پہلو یعنی تکبیر و تسبیح بہت ہی پیار سے اور آسانی سے انسان کو متقی با عمل حوصلہ منداور صاحب ایمان انسان بنا دیتی ہے۔ایسا انسان جس کی آج کے دور میں بے حد ضرورت ہے۔

ایسے ہی ہمارے ہاں زکوٰۃ ایک بہت ہی اہم ترین عبادت ہے بہت سے لوگ جو نماز بھی نہیں پڑھتے ۔ وہ زکوۃ بڑی پابندی سے دیتے ہیں ۔ تاہم ہمارے ہاں زکوٰۃ کو غریبوں کی مدد کاایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ایک حد تک یہ بھی ہے۔اب ہم بتائیں گے کہ زکوٰۃ اصل میں کیا ہے؟ اور کیوں ادا کی جاتی ہے؟

زکوٰۃ اپنی حقیقت کے اعتبار سے نذر ہے، نذر کا مطلب ہے کہ انسان اپنے مال کا ایک حصہ بہت ہی محبت سے اپنے معبود کو راضی کرنے کے لئے بطور نذرانہ اس کے حضور پیش کر دے۔

قدیم زمانے میں جب شرک کا غلبہ تھا تو لوگ مندروں اور مقبروں میں جا کر اپنا مال مختلف شکلوں میں بتوں کی بھینٹ چڑھاتے تھے اور پھر یہ مال مقبروں کے خدام اور وہاں آنے والے زائرین کی ضروریات پر خرچ کرتے۔

اسلام نے اس صورتحال کو تبدیل کیا اس محبت کرنے والی ہستی نے اپنے حضور نذر کو زکوٰۃ کی مستقل عبادت کی شکل دے کر اس نظام اجتماعی کو غریبوں کی مدد اور ضرورت مندوں کے لئے خاص کر دیا تاہم اس کے پیچھے جو روح اور جذبہ ہے۔ وہ اسی طرح باقی ہے۔**ہمیں اس زکوٰۃ کا حکم دینے والے محبوب کی محبت کو پیش نظر رکھ کر اپنی زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ وہ یہ زکوٰۃ کسی انسان کو نہیں دے رہا ہے۔ بلکہ اپنا سر اور دل جھکا کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر عاجزی اور پستی کے ساتھ اپنا یہ نذرانہ اپنے معبود کو پیش کر رہا ہوں۔** اگر کوئی شخص سر اٹھا کر، احسان جتلا کر، دبنگ لہجے کے ساتھ انسانوں کو زکوٰۃ دیتا ہے۔اس کا مال تو خرچ ہو جاتا ہے۔مگر پروردگار عالم کی بارگاہ سے ایسے شخص کو سند قبولیت نہیں ملتی۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی گردن اس قابل نہیں کہ بلند ہو کر شرف قبولیت حاصل کر سکے اس کے نزدیک تو صرف اور صرف محبت، عاجزی اور پستی قبول ہوتی ہے۔**زکوٰۃ دینے والے لوگوں کی مدد کرنے والے اور انفاق کرنے والوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اگر وہ انسانوں کو دے رہے ہیں تو بلا شبہ سر اٹھا کر دیں لیکن اگر اپنے رب کو نذر کر رہے ہیں تو ہمیشہ سر جھکا ہوا رکھیں۔ یہی وہ محبت ہے جو اس نے ہمیں زکوٰۃ کے سلسلے میں سکھائی اور در قبولیت کا راستہ ہے۔** اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اپنی اور دوسروں کی جائز ضروریات کے لئے پیسے خرچ نہ کرنا۔ مال جمع کرتے اور گن گن کر رکھتے رہنا ''بخل'' اور ایک بدترین انسانی رویہ ہے یہ رویہ دنیا کی محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا پیغام یاد نہیں ہوتا۔اسلام میں تصحیح ہے تضحیک نہیں اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ تنقید ہمیشہ وہ موثر ہوتی ہے۔ جو اصلاحی اور تعمیری ذہن کے ساتھ کی جائے۔ایسی تنقید کرنے والے لوگوں کی زندگی کا اصل مقصد اپنی اصلاح کرنا ہوتا ہے۔وہ دوسروں کو تنقید کرنے سے پہلے اپنے ہر رویئے کو بے رحمانہ احتساب سے گزارتے ہیں وہ دوسروں کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے سے قبل اپنے اور ان کے لئے دعا کرتے ہیں۔قرآن پاک میں باری تعالیٰ نے سورۃ الفرقان، آیت نمبر 63 میں رحمٰن کے بندوں کے بارے میں بتایا ہے:

ترجمہ: ''رحمٰن کے بندے وہ ہوتے ہیں جو زمین پر دھیمی چال چلتے ہیں اور جب جاہل ان کے منہ آتے ہیں تو وہ ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔''

حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف ایک جلیل القدر صحابہ کرامؓ میں سے تھے۔اسلام کے لئے ان کی خدمت اور نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے ان کو ملنے والی بشارتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔حضرت طلحہؓ جو خود ایک جلیل القدر صحابی تھے ان میں اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف میں کسی وجہ سے کوئی رنجش ہو گئی۔اس دوران میں حضرت طلحہؓ بیمار پڑے تو حضرت عبدالرحمنؓ ساری رنجش اور شکایت بھلا کر ان کی عیادت کرنے پہنچ گئے۔حضرت طلحہؓ نے جب ان کو دیکھا تو کہا" آپؓ مجھ سے بہتر ہیں آپؓ بیمار ہوتے تو میں عیادت کے لئے نہ آتا"۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ صحابہ کرامؓ میں وہ دو بنیادی اوصاف موجود تھے جو انسانوں کو عظیم بناتے ہیں۔

پہلا وصف اللہ تعالیٰ کا خوف اس کے لئے محبت اور اخلاق اور دوسرا وصف اللہ تعالیٰ کا خوف اس کے لئے محبت اور اعتراف۔

پہلی صفت کا مظاہرہ یعنی اللہ تعالیٰ کا خوف اس کے لئے محبت اور اخلاق حضرت عبدالرحمنؓ نے شکایت رنجش کے باوجود حضرت طلحہؓ کی عیادت کے لئے جا کر کیا۔اس جواب میں حضرت طلحہؓ نے جو کچھ کیا وہ اعتراف تھا یعنی انہوں نے اپنی ''انا'' اور اپنی عزت کو ایک طرف رکھ کر یہ مان لیا کہ حضرت عبدالرحمنؓ نے ان سے بہتر ہونے کا ثبوت دیا ہے یہ اعتراف کر کے وہ بھی عبدالرحمنؓ کی سطح پر آ گئے۔ کیونکہ **اعلیٰ اخلاق جتنی بڑی نیکی ہے اعتراف گناہ بھی اتنی بڑی نیکی ہے۔اور ان دونوں نیکیوں کے پیچھے جو احساس ہے وہ ہے اللہ تعالیٰ سے خوف اور اس کی محبت۔**

تو دین اسلام ہمیں لوگوں سے محبت اپنے معبود سے محبت کرنے کے بے شمار طریقے بتا تا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اور صرف وہی محبوب ہوتا ہے جو اس کی مخلوق سے محبت کرے۔ دین اسلام ہی ہمیں یہ بتا تا ہے کہ بہترین انسان وہ ہے جو لوگوں کے مسائل حل کرے اور بدترین انسان وہ ہے جو لوگوں کے لئے مسائل پیدا کرے۔

نظر نظر میں اترنا کمال ہوتا ہے
نفس نفس میں بکھرنا کمال ہوتا ہے
بلندیوں پر پہنچنا کوئی کمال نہیں
بلندیوں پر ٹھہرنا کمال ہوتا ہے

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ ہمارے لئے ایک بہترین محبت اور اخلاق کا عملی نمونہ چھوڑ کر گئے ہیں ہم سب کو ان کا عملی نمونہ اپنانا چاہیے۔

آج کا انسان دین سے دوری کے باعث محبت سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ آج کا انسان ہر قدم پر ایک دوراہے سے دوچار ہوتا ہے۔ آج کے انسان کے پاس وقت نہیں ہے کہ وہ نکلنے اور ڈوبنے پر سورج کے منظر پر تفکر یا تدبر کر سکے۔ وہ چاندنی راتوں کے حسن سے ناآشنا ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ دین کو سمجھنا نہیں چاہتا وہ تو بس محبت کی سائنس سمجھنا چاہتا ہے اور یہ ممکن نہیں۔ دلوں میں اترنے کے لئے سیڑھیوں کی نہیں اچھے الفاظ اور اچھے اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے- دل ایک باغ کی طرح ہے اس میں محبت بھی اگتی ہے، نفرت بھی، ڈر بھی اور ناراضگی بھی- اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم کیسا بیج بوتے ہیں؟

زندگی صرف حاصل ہی نہیں ایثار بھی ہے۔ زندگی صرف ''میں'' ہی نہیں زندگی ''وہ'' بھی ہے زندگی ''تو'' بھی ہے۔ زندگی میں صرف مشینیں ہی نہیں چہرے بھی ہیں۔ جیسا کہ ہمارے دین نے ہمیں بتایا کہ یہ زندگی صرف مادہ ہی نہیں روح بھی ہے اور اصل زندگی تو روح ہی ہے۔ اور سب سے بڑی بات کہ یہ زندگی خود ہی معراج محبت بھی ہے۔ مقصد یہ کہ یہ زندگی ہر دور سے گزرتی ہوئی ہمیں بہت کچھ سکھاتی ہوئی بڑھاپے تک آتی ہے۔ قابل قدر ہے وہ بڑھاپا جو دوسروں کے لئے نافع ہو جو آگاہ راز ہو اور دوسروں کو آگاہ کرنے کی کوشش کرے۔

سب سے بڑا پیغام دوسروں کو دیا جاتا ہے وہ یہ کہ مال جمع کرنے میں انسان زندگی خرچ کر دیتا ہے اور آخر کار وہ دیکھتا ہے کہ اس کا دامن مال سے تو بھر گیا ہے لیکن اس کی زندگی کی متاع بھی تو ختم ہوگئی اور یہ کہ لالچ انسان کو کمزور کر دیتی اور خود غرضی انسان کو تنہا کر دیتی ہے۔ زندگی کی اساس عمل نہیں فضل ہے۔

نیت کی اساس اصلاح عمل میں ہو تو خلوص پیدا ہو سکتا ہے۔ اور عمل کا خلوص نیتوں سے بے نیاز ہے نیکی کے سفر میں جہاں بھی آخیری سانس آئے وہی منزل ہے ہمارا نظام حیات، نظام تعلیم، اور نظام فکر ہمیں صرف عمل میں مصروف رکھتا ہے۔ عاقبت کی کوئی گارنٹی نہیں۔ عاقبت کی گارنٹی تو ہمیں ہمارا مذہب دیتا ہے۔ کہ اس عمل کو تلاش کیا جائے جو ہمیں بھی پسند ہو اور ہمارے مالک کو بھی ورنہ نتیجہ ہلاکت اور گمراہی ہوگا۔ یہی منشا ہے اس کے اس حکم کا ''اے انسان تو محنت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اب اپنے رب کے راستے کی طرف محنت کر''۔

اے اللہ مجھے تیری رحمت پر یقین ہے میرے عمل کی کوتاہی مجھے تیرے فضل سے محروم نہیں کر سکتی تیری عطا میری خطا سے بہت وسیع ہے۔ مجھے اپنے دربار میں قبول و منظور کر لے۔ آمین!

****

اللہ ہمیں دیکھ رہا ہے

اللہ تعالی کی عظمت و بڑائی کا وجود پر طاری ہوجانا ہی ایک مؤمن کی پکی نشانی ہے۔حدیث کی کتابوں میں ایک بہت ہی اہم روایت بیان کی گئی ہے جسے عام زبان میں **حدیث جبرائیل علیہ السلام** کہا جاتا ہے-----اس حدیث میں حضرت جبرائیل علیہ السلام ایک اجنبی کے روپ میں نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب صحابہ کرام رضی اللہ بھی موجود تھے۔اس اجنبی نے آپ خاتم النبیین ﷺ کو سلام کیا اور آپ خاتم النبیین ﷺ کے قریب ہی بیٹھ گیا اور پوچھا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ اسلام کیا ہے"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا"اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کے اللہ ایک ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے، محمد خاتم النبیین ﷺ اس کے رسول برحق ہیں، اسکے ساتھ نماز پڑھنا، زکوۃ دینا، رمضان المبارک کے روزے رکھنا اور اگر استطاعت ہوتی ہے تو حج کرنا یہ اسلام ہے''۔اس شخص نے کہا" آپ خاتم النبیین ﷺ نے سچ کہا"**.** صحابہ کرام رضی اللہ کا بیان ہے کہ ہم حیران ہوئے کہ یہ شخص سوال بھی کرتا ہو اور پھر جواب کی تصدیق بھی کرتا ہے۔پھر اس نے دریافت کیا" مجھے یہ بتائیے کہ ایمان کیا ہے"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''ایمان یہ ہے کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، قیامت کے دن پر اور یہ کہ اچھائی اور برائی کو مقرر کر دیا گیا ہے''**.** اس شخص نے کہا" آپ خاتم النبیین ﷺ نے ٹھیک فرمایا ہے"۔اس کے بعد اس شخص نے سوال کیا''احسان کیا ہے''؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالی کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اللہ تعالی کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ کیفیت نہیں بن پاتی تو یہ بن جائے کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے''۔اس شخص نے کہا" آپ خاتم النبیین ﷺ ٹھیک کہتے ہیں"۔اس کے بعد اس شخص نے سوال کیا''یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ قیامت کب آئے گی؟'' آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''اس بارے میں مجھے تم سے زیادہ علم نہیں ہے''۔پھر اس شخص نے کہا''قیامت کے کچھ علامات بیان فرما دیجئے''۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''لوگ زیادہ سے زیادہ لونڈیاں رکھیں گے۔(کثرت عیش کی طرف اشارہ ہے)، مفلس، نادار اور بھوکے ننگے لوگ اتنے مالدار ہوجائیں گے کہ اونچی اونچی عمارتیں بنائیں گے''۔اتنا سننے کے بعد اجنبی اٹھا اور واپس چلا گیا۔تھوڑی دیر کے بعد آپ خاتم النبیین ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ سے پوچھا''تم جانتے ہو وہ کون تھا''۔حضرت عمر رضی اللہ نے جواب دیا''اللہ اور اس کا رسول خاتم النبیین ﷺ جانتے ہیں''۔آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''یہ جبرائیل علیہ السلام تھے تمہیں دین سکھانے کے لیے آئے تھے''۔(صحیح مسلم)

اس حدیث میں دین کے بنیادی حقائق کا ایک نہایت جامع بیان ہے وہ یہ کہ ایمان عقیدے کا نام ہے، اسلام عمل کا اور احسان اخلاص کا--شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ اس مقام احسان یا مقام اخلاص کو تصوف یا روحانیت اور طریقت کا نام دیتے ہیں۔اس مکالمے میں جب حضرت جبرائیل علیہ سلام سوال کرتے ہیں کہ ''احسان کیا ہے؟'' تو جواب میں رسول پاک خاتم النبیین ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ''اللہ تعالی کی عبادت ایسے کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو کم سے کم ایسے عبادت کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے''۔احسان کی یہ تعریف حقیقی معنوں میں اس بات کا ایک مکمل اور جامع بیان ہے کہ بندہ مومن کے حسن عمل کی اساس کیا ہے؟ (بنیاد کیا ہے؟)۔یہ اساس اس احساس کے ساتھ جینا ہوتا ہے کہ بندہ رب کے اور رب بندے کے ساتھ ہے۔رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے اپنے قرب الہی کے اس تجربے کو بلاغت کی انتہا پر پہنچاتے ہوئے اس طرح بیان کر دیا ہے کہ بندہ مومن تو اس طرح بندگی کی زندگی جیتا ہے۔گویا کہ رب کریم ہر وقت اسکی نگاہوں میں ہوتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ رب تعالیٰ وہ ہستی ہے کہ اس کو ہماری یہ آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔اب ایسی صورت میں جبکہ نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں تو قربت الہی کو تازہ رکھنے کا دوسرا راستہ اس بات کا یقین ہے کہ بندہ خالق کو نہیں دیکھ سکتا تو کیا ہوا؟ خالق تو اپنے بندے کو دیکھ رہا ہے۔دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی نکلے گا۔

اس بات کی وضاحت موجودہ صدی میں ان کیمروں سے کی جاسکتی ہے جو آج کل بڑی بڑی دکانوں، بڑے بڑے شاپنگ سنٹرز، اہم عمارات اور بنکوں وغیرہ میں لگائے جاتے ہیں۔ان تمام جگہوں پر خریداری کے لیے آنے والے کسی بھی شخص کے لیے یہ بڑا ہی آسان کام ہے کہ کسی بھی قیمتی مگر چھوٹی چیز کو اپنے کپڑوں میں چھپالے گا اپنے پرس وغیرہ میں ڈال لے۔اس مسئلہ سے نمٹنے کے لئے دوکاندار یہ نگرانی والے کیمرے استعمال کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی ساتھ ان دوکانوں پر جگہ جگہ ایک جملہ لکھا ہوا ہوتا ہے''خبردار کیمرے کی آنکھ دیکھ رہی ہے''۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بری نیت سے آنے والے حضرات کو یہ احساس کہ کیمرے کی آنکھ دیکھ رہی ہے اسے چوری کرنے سے روک دیتا ہے---اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کسی کو دیکھے یا اسے احساس ہوجائے کہ کوئی اس کو دیکھ رہا ہے دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔ بالکل یہی بات حدیث جبرائیل علیہ السلام میں''احسان'' کے حوالے سے سمجھائی گئی ہے۔کہ اللہ تعالی کا بندے کو دیکھتے رہنا حسن عمل کے پہلو سے بندے کا اللہ تعالی کو

دیکھتے رہنے کے برابر ہے۔ یہ چیز نہ صرف انسان کو برے عمل سے روک دیتی ہے بلکہ اس کی عبادت اور عمل صالح میں خوبصورتی، کمال اور اخلاص پیدا کرتی ہے۔

بندہ جس کے لیے کام کرتا ہے ہمہ وقت خود کو اس کے سامنے سمجھتا ہے۔ اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مالک کو نہیں دیکھ پا رہا تو کیا ہوا اس کا مالک تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ جس شخص میں ایمان کی زندگی موجود ہے، جس کے وجود پر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بڑائی کا غلبہ ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر اللہ تعالیٰ کی معیت (ساتھ) کا زندہ تجربہ کر سکتا ہے۔ مگر افسوس کے خالق کائنات کی عظمت کا ادراک اور اپنی عاجزی کی ہر شکل کا احساس رکھنے والا یہ انسان اپنے مالک و خالق و رب سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ یہ کیمرے کی آنکھ سے تو ڈرتا ہے اور رب تعالیٰ کے سمیع اور بصیر ہونے کو بھی خوب جانتا ہے۔ **لیکن عجیب بات یہ ہے کہ احساس اپنے اوپر طاری نہیں کرتا کہ میرا رب مجھے دیکھ رہا ہے۔** اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مقصد حیات کو جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ وہ زندگی کی کہانی کے صرف اس حصے سے واقف ہے جو آج اس کے سامنے ہے۔ یعنی اس کے سامنے صرف اور صرف یہ دنیا ہے۔ اس دنیا کی خوشیاں، اس دنیا کے غم، اس کی لذتیں، اس کی تلخیاں، اس کی آسائشیں، اس کے مسائل، اس کی نصیحتیں، اس کی محرومیاں، اس کو پانا اور اس کا کھونا --- **فراخی دنیا کی اطلاع آپ خاتم النبیین ﷺ نے پہلے ہی دے دی تھی۔**

1) امام احمد اور حاکم نے صحیح بتا کر اور بیہقی نے طلحہ نصری ؓ سے روایت کی ہے کہ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "تم بہت جلد ایسے زمانے کو پاؤ گے کہ تم میں سے ہر ایک کے پاس صبح کو ایک کھانا اور شام کو دوسرا کھانا آئے گا۔ اور تم ایسا لباس پہنو گے جیسے خانہ کعبہ کا غلاف" (مخمل۔ مخملی لباس یعنی قیمتی لباس) صحابہ کرام ؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ! ہم آج خیر پر ہیں یا اس وقت خیر پر ہوں گے"؟ فرمایا "نہیں بلکہ تم آج خیر پر ہو۔ آج تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور اس وقت تم ایک دوسرے سے بغض رکھو گے اور ایک دوسرے کی گردن مارو گے"۔

2) شیخین نے حضرت جابر ؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''کیا تمہارے پاس نقشین فرش نہیں"؟ میں نے عرض کیا "یا رسول خاتم النبیین ﷺ ہمارے پاس نقشین فرش کہاں سے آئے"؟ حضور کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "عنقریب تمہارے پاس نقشین فرش ہوں گے"۔ حضرت جابر ؓ نے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے پردہ فرما جانے کے بعد فرمایا" آج میں اپنی بیوی سے کہتا ہوں کہ ان نقشین فرش کو مجھ سے دور رکھو"۔ تو وہ یہ کہتی ہے" کیا رسول خاتم النبیین ﷺ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ میرے بعد تمہارے پاس نقشین فرش ہوں گے"۔

3) ابونعیم نے عبداللہ بن یزید سے روایت کیا ہے "انہیں کسی دعوت پر مدعو کیا گیا جب وہ اس گھر میں آئے تو انہوں نے دیواروں پر پردے لٹکے ہوئے دیکھے تو وہ باہر بیٹھ کر رونے لگے۔ کسی کے پوچھنے پر بتایا کہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا تھا " یہ دنیا تمہاری طرف اڈ کر آئے گی"۔ اور یہ بات تین مرتبہ فرمائی تھی۔ پھر فرمایا" تم آج اچھے ہو اس وقت سے جب تمہارے پاس صبح کو ایک کھانا آئے گا اور شام کو دوسرا۔ تم صبح کو ایک لباس پہنو گے اور شام کو دوسرا۔ اور تمہارے گھروں کی دیواروں پر ایسے پردے پڑے ہوں گے جیسے کعبہ پر پردہ پڑا ہوتا ہے"۔

4) بیہقی اور ابونعیم نے عبداللہ بن بسر ؓ سے روایت کیا کہ رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں محمد خاتم النبیین ﷺ کی جان ہے اللہ تعالیٰ فارس اور روم کو (تم سے) ضرور فتح کروائے گا۔ پھر غلہ کی اتنی کثرت ہو جائے گی کہ لوگ کھانے پر بسم اللہ پڑھنا بھول جائیں گے"

5) ابونعیم نے عوف بن مالک ؓ سے روایت کیا ہے ''رسول پاک خاتم النبیین ﷺ نے اپنے صحابہ ؓ کے درمیان کھڑے ہو کر فرمایا" تم لوگ مفلسی کا خوف رکھتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے روم اور فارس کو فتح کرائے گا اور تم پر دنیا اس طرح اڈ آئے گی کہ میرے بعد تم حق سے پھر جاؤ گے اور دنیا ہی کی وجہ سے پھرو گے'' (یعنی دنیا میں مگن ہو جاؤ گے اور شکر گزاری کو بھول جاؤ گے)

6) ایک اور حدیث میں حضور کریم خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے " مجھے تم لوگوں پر زیادہ خوف اس بات کا ہے کہ حق تعالیٰ تم پر زمین کی برکات نکال دے"۔ صحابہ کرام ؓ نے عرض کیا" یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ زمین کی برکات سے مراد کیا ہے؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''دنیا کی رونق بڑھا دے''۔

7) حضرت ابوامامہ ؓ فرماتے ہیں کہ جب حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی بعثت ہوئی تو ابلیس نے تحقیق کی" کیا ہوا ہے"؟ اور اپنے لشکر کو تحقیق کے لئے بھیجا۔ انہوں نے آکر بتایا کہ ایک نبی مبعوث ہوئے ہیں۔ وہ بت پرستی سے منع کریں گے۔" کیا ان لوگوں میں (امت محمدی میں) دنیا کی محبت ہوگی"؟ انہوں نے کہا (ابلیس کے چیلوں نے) "ہاں دنیا کی محبت ہے"۔ ابلیس نے کہا'' پھر مجھے اس کا رنج نہیں کہ وہ بت پرستی نہیں کریں گے۔ میں تین چیزیں ان پر مسلط کر دوں گا (الف) ناجائز طریقے سے کمانا (ب) ناجائز طریقے پر خرچ کرنا (ج) جہاں خرچ کرنا ضروری ہو وہاں پر خرچ نہ کرنا''۔

حضرت حسن فرماتے ہیں "بنی اسرائیل کو حق تعالیٰ کی بندگی کرنے کے باوجود (مال کی کثرت) دنیا کی محبت نے بت پرستی تک پہنچا دیا تھا"۔ان کا یہ بھی ارشاد ہے " آدمی اپنے مال کم سمجھتا رہتا ہے لیکن اپنے عمل کو کبھی کم نہیں سمجھتا"-------حضرت علیؓ کا فرمان ہے ’’دنیا کی حلال مال کا حساب اور اس کے حرام مال کا عذاب ہے"۔

آج دنیا پرستی کے فتنہ نے ہمیشہ سے بڑھ کر انسان کو اپنی منزل مقصود اور اس تک پہنچنے والے صراط مستقیم سے غافل کر دیا ہے۔اس کی توجہ صرف اور صرف دنیا ہے۔ مجھے پیسہ کمانا ہے تا کہ اچھا سا گھر بنا سکوں، مجھے پیسے کمانے ہیں تا کہ میری شادی اچھی جگہ ہو سکے، میں نے پیسہ کمانا ہے تا کہ میرے بچے اچھی تعلیم حاصل کر سکیں۔ تا کہ معاشرے میں مجھے باوقار مقام مل جائے۔ یہ باتیں آج ہمارے معاشرے کے ہر فرد کا نصب العین ہیں۔ان تمام چیزوں کے حصول کے لیے آج کا انسان ہر حد کو توڑ دیتا اور ہر اصول کو نظر انداز کر دیتا ہے، اور قدر کو پامال کر دیتا ہے۔اسے یاد ہی نہیں ہوتا کہ ایک وقت اسے مرنا ہے۔اسے یاد ہی نہیں ہوتا تو اس کی قبر اس کی منتظر ہے اور یہ کہ حشر کے روز اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے۔اسے اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے۔اور پھر زندگی میں کئے گئے ہر نیک و بد کا حساب دینا ہے۔جس کی جگہ ابدی جنت یا خدانخواستہ جہنم ہو گی۔

اس دنیا میں ہم ڈاکٹر ہیں، انجینئر ہیں یا سائنسدان ہیں لیکن کل کی دنیا میں یا تو ہم جیتنے والے ہیں یا پھر ہارنے والے ہیں۔ دنیا میں اپنی ضروریات، سہولتیں اور آسائشوں کے لیے جدوجہد کرنا جرم نہیں ہے۔ جرم یہ ہے کہ انسان دنیا کیلئے کوشش کرتے وقت اپنی آخرت کو بھول جائے۔ وہ اس ہستی کو نظر انداز کر دے جس نے ہمیں عملی زندگی کا نمونہ پیش کیا تھا---ہمیں ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جنت کے مسافر اس دنیا میں راستے کی رنگینیوں میں الجھ کر کبھی اپنی منزل کھو یا نہیں کرتے۔ وہ ہر گھڑی اپنے نفس کا مقابلہ کرتے ہیں اور پھر وہ اپنے نفس کو پاک کر لیتے ہیں۔اور نفس کی پاکیزگی کسی کو غار میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔شاہراہ زندگی کو چھوڑ کر مسائل زندگی سے فرار اختیار کر کے یہ پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی۔ یہ پاکیزگی تو زندگی میں پیش آنے والے ہر اچھے اور برے حالات میں تقویٰ اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ پاکیزگی ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے جڑے رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے مانگنے کے لیے کسی کو نیکوکار ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نہ ماضی کی وفاداری کا کوئی ریکارڈ پیش کرنا ہوتا ہے۔صرف اور صرف یہ یقین کہ صرف وہ ہی دینے والا ہے، تو ہی دے سکتا ہے، اور وہ ہی دے سکتا ہے۔اور صرف یہ عزم کے مالک میں ہمیشہ تیرا شکر گزار رہوں گا۔اسے مستحق بنانے کے لیے کافی ہے۔تو سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسان کو یہ احساس ہو جائے کہ میرا مالک و خالق مجھے دیکھ رہا ہے- میرا کوئی عمل اس سے پوشیدہ نہیں-

بات یہ ہے کہ اگر تمنا حاصل سے زیادہ ہو تو اضطراب پیدا ہوتا ہے، انتشار پیدا ہوتا ہے۔اگر حاصل تمنا سے زیادہ ہو تو سکون کا باعث بن جاتا ہے۔اسلئے کم آرزو والے انسان ہمیشہ مطمئن رہتے ہیں۔ بلکہ کثرت پرست سوچ، تفکر اور تدبر سے محروم ہو جاتے ہیں۔انسان کی پہچان کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو آسمان اور زمین کے حوالے سے ظاہر کیا ہے۔انسان اپنی ہستی کا سفر زمین پر شروع کرتا ہوں اور یہ سفر زمین پر ہی ختم ہو جاتا ہے-----انسان کے اردگرد پھیلی ہوئی یہ زندگی اس کے علم کے وسیع اسباب ہیں۔انسان کو علم الاسماء عطا کیا گیا ہے۔وہ " آسماء" اشیاء کو پہچانتا ہے۔ پھر اشیاء سے مفاہم تلاش کرتا ہے۔انسان رب کائنات کی بہترین تخلیق ہے۔اس لیے انسان کی مختصر سی ہستی میں لامحدود امکانات موجود ہیں۔سب سے بڑی بات یہ کہ علم کی کمند پھینک کر تماشائے صفات باری تعالیٰ کے ساتھ ساتھ مشاہدہ ذات بھی کر سکتا ہے۔تماشہ صفات اس آنکھ کا کام ہے جس میں علم سے نور پیدا ہو۔جب کہ مشاہدہ ذات اس آنکھ کا کام ہے جو صرف اور صرف عشق سے کھلتی ہے۔

انسان کو شرف عطا کرنے والے نے انسان کو علم عطا کیا، کائنات کی اشیاء کا علم، اس کائنات کی زندگی اور اس کائنات کے حسن کا علم۔یہ کائنات ایک آئینہ ہے۔ اس میں ہر طرف انسان کی اپنی صفات پھیلی ہوئی ہیں۔ہمیں رب تعالیٰ پر نظر رکھنی چاہیے پھر اگر یہ بات نہ بن پائے تو یہ یقین کامل ہونا چاہیے کہ میرا مالک مجھے دیکھ رہا ہے۔وہ مجھے کچھ کہہ رہا ہے مجھے اس کو نظر انداز نہیں کرنا ہے۔ مجھے اس کی ہر بات کو ماننا ہے اس میں میری بھلائی اور میری عافیت ہے۔ مالک کا حکم نہ مانے تو بڑے بڑے حکم ماننے پڑتے ہیں۔اس کی اطاعت نہ کرنے سے بڑی بڑی اطاعتیں کرنی پڑتی ہیں۔لیکن افسوس! اس کو سجدہ کرنے کے بجائے ہم اپنی آرزوؤں کے آگے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔انسان اگر غور کرے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ فنا کے دیس میں بقا کا مسافر ہے۔انسان غور کرے سوچے تو سہی کے مالک نے کس کس طرح اس پر کیا کیا احسانات کئے ہیں؟ مالک نے یہ دنیا کسی کے لیے بنائی ہے؟ یہ دنیا کی تمام اشیاء کس کے استعمال کے لیے بنائی ہیں؟ یہ دریا رواں کیسے ہیں؟ یہ چشمے کیوں ابل رہے ہیں؟ یہ سمندر ساکن کیوں ہے؟ آنکھ بنانے والا خود کتنا بصیر ہو گا؟ ہر ایک کو بنانے والا خود کیسی سماعت رکھتا ہو گا؟ کسی انسان کی شکل دوسرے انسان سے نہیں ملتی۔ کسی ایک درخت کا ایک پتہ دوسرے درخت کے پتے سے نہیں ملتا۔ ہاتھی کو بنانے والا ہی چیونٹی کو بنانے والا ہے۔ دماغ کو بنانے والا خود کیسی عقل رکھتا ہو گا؟ اس ایک لامحدود عقل جس کا

تصور ہی محال ہے۔خالق کائنات ہم تیری عظمت کی گہرائیوں کو پا ہی نہیں سکتے ہم زمین پر رہتے ہیں ہم اپنی پیشانی زمین پر رکھتے ہیں اور ہمیں جواب آسمان سے آتا ہے۔ وہ خالق اور مالک تو ہماری شاہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے۔ایک ہم ہیں کہ بس ہمیں دنیا مانگنے کا ہی سلیقہ آتا ہے۔اور جب ہمیں دنیا میں تھوڑی بہت تنگی پیش آتی ہے تو ہم اللہ تعالی سے شکایت کرنا شروع کر دیتے ہیں- یاد رکھیں! مایوس لوگ وہ ہیں جو اللہ تعالی کی رحمت پر یقین نہیں رکھتے اور محروم لوگ وہ ہیں جو اللہ رحیم وکریم کی نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے -اگر ہم ذرا سا بھی غور کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے کہ ہم اللہ تعالی کی کتنی بے بہا نعمتوں میں گھرے ہوئے ہیں پھر ہماری زبان سے شکر ادا ہو سکتا ہے-

تمثیل:- ایک شخص رات کے وقت عبادت میں مصروف تھا اس نے ایک نورانی ہالہ اپنے قریب محسوس کیا۔اس کے دل نے کہا" یہ فرشتہ ہے "-اس شخص نے بلند آواز سے کہا"اگر تم فرشتے ہو تو میری کچھ دعائیں اللہ تعالی تک پہنچا دو"۔فرشتے نے جواب دیا''بتاؤ''۔اس آدمی نے اپنی دعائیں بتانی شروع کیں ۔فرشتہ کچھ دیر تو خاموش رہ کر یہ دعائیں سنتا رہا آخر اس نے کہا''بس بس میں سمجھ گیا''۔اس آدمی نے کہا" کیا سمجھ گئے میں نے تو ابھی اپنی دعائیں پوری بتائی ہی نہیں ہیں "؟ فرشتے نے کہا''میں رب تعالی سے کہہ دونگا مالک تیرا فلاں بندہ تیرے سوا دنیا کی ہر چیز کی تمنا کرتا ہے''۔

تو ہم مانگتے ہیں تو دنیا ہی مانگتے ہیں۔خواہشات کا انبار اپنے سامنے رکھتے ہیں اور پھر شکوہ کرتے ہیں کہ باری تعالی ہمیں سکون عطا فرما۔

زمین والے آسمان والے سے اگر تعلق نہ رکھیں تو آسمان کی گرفت میں ہیں۔یہی زمین والے اگر اسکے ہو جائیں تو آسمان کی وسعتیں ہمارے گرد و پا ہو جائیں۔اللہ کے محبوب زمین پر ہوں تو آسمان ان پر نثار اور اگر اللہ تعالی کے باغی چاند پر بھی پہنچ جائیں تب بھی گرفت میں ہے شدید گرفت میں۔

اس دنیا کا ہر رنگ عارضی ہے۔ہر حال میں ختم ہونے والا ہے۔ہر حاصل محرومی اور ہر ہونا نہ ہونا۔یہ دنیا اور اس دنیا کا ہر روپ عارضی ہے۔زندگی کا یہ قافلہ ٹھہر نہیں سکتا۔یہ راج ان انسانوں پر آشکار ہوتا ہے جو یہ جان لیں گے رب ہمیں دیکھ رہا ہے پھر وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ''اول وآخر فنا ظاہر و باطن فنا''۔**رب تعالی سے ڈرنے والا اس کی ذات کو ہر وقت اپنی نگاہ میں رکھنے والا اس حقیقت کو پالیتا ہے کہ یہ دین صرف اور صرف سچے انسانوں کا ہے۔یہ سچ کا راستہ ہے۔اسی راستے کو قرآن پاک میں صراط مستقیم کہا ہے۔**

اعمال صالح ہی ہمارے خوبصورت اثاثے ہیں۔اعمال صالح رکھنے والا انسان خوبصورت دل رکھتا ہے۔وہ اپنے ہر ہر عمل کو اللہ کی رضا،اس کی خوشنودی،اور اس کی عظمت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کرتا ہے۔وہ عبادت اور خدمت کے مفہوم سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے۔عبادت اللہ کی اور خدمت اللہ کے بندوں کی پھر یہ خوبصورت احساسات کا مالک ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالی سے ڈرنے والا،اللہ کی ذات کو اپنی زندگی بنا لینے والا ہی اللہ کی نگاہوں کو ہر دم اپنی ذات پر فوکس محسوس کرنے لگتا ہے۔وہ یہ جان لیتا ہے کہ کتاب قانون ہے پہچان کا۔لیکن پہچان کتاب کی نہیں کتاب بھیجنے والے کی ہونی چاہیے۔ہمیں علم کی پہچان نہیں علم بھیجنے والے کی پہچان درکار ہے۔ہمیں نورانی علم چاہیے سراسر رحمان کا علم۔ وہ علم جو ہماری نگاہوں اور ہمارے دل کو مالک کائنات کی ذات پر مرکوز کر دے۔ہمیں خود آگاہی نصیب کر دے۔علم اگر خود آگاہی کے قریب کر دے تو نور ہے ورنہ حجاب۔ زیادہ جاننے کا غرور اگر نہ جاننے کی عاجزی میں بدل جائے تو حجاب اٹھ جاتا ہے۔علم کا منشاء اگر رضائے حق ہے،حصول حق ہے تو نور ہے بلکہ نور علی نور ہے۔

اللہ کی حضوری میں ہر وقت جینے کا نام ایمان،اور اللہ تعالی کو ہر وقت نگاہوں میں رکھنے یا اللہ کی نگاہوں کو ہر وقت اپنے اوپر محسوس کرنے کا نام''احسان''ہے۔

حضرت حسن بصریؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو ایک خط لکھا جس میں حمد و صلواۃ کے بعد تحریر فرمایا:

''امیر المومنین یہ دنیا کوچ کا گھر ہے یہ رہنے کا گھر نہیں ہے-حضرت آدم علیہ السلام کو اس میں سزا کے طور پر بھیجا گیا تھا کہ جنت میں ان سے ایک لغزش ہو گئی تھی۔اس لئے اس دنیا سے اور اس کے مال ومتاع سے ڈرتے رہیں-اس کا توشہ اس کو چھوڑ دینا ہے۔اس میں غنی وہی شخص ہے جو ظاہر میں فقیر ہے- یہ ہر وقت کسی نہ کسی کو ہلاک کرتی رہتی ہے۔جو اس کو عزیز سمجھے یہ اس کو ذلیل کر دے گی۔اور جو اس کو جمع کرنے کا ارادہ کرے یہ اس کو محتاج بنا دے گی۔یہ ایک زہر ہے جس کو انجان لوگ کھاتے ہیں۔پھر وہ مرجاتے ہیں۔اس میں اس طرح زندگی گزاریں جیسے ایک زخمی بیمار ہر ایک چیز سے احتیاط کرتا ہے تا کہ صحت مند ہو جائے اور کڑوی دوا اس لئے استعمال کرتا ہے کہ مرض طول نہ پکڑے-آپ اس مکار،دغا باز اور فریبی سے بہت احتیاط کریں- جو محض دھوکا دینے کے لئے بنتی سنورتی ہے۔اور پھر دھوکے سے لوگوں کی مصیبت میں پھنسا دیتی ہے۔یہ اپنی امیدوں کے ساتھ لوگوں کے ہاں آتی ہے۔پس یہ ایک ایسی بنی ٹھنی نئی نویلی دلہن کا روپ دھارتی ہے کہ آنکھیں اس پر ٹکٹکی لگا دیتی ہیں۔اور آدمی اس کے جانثار بن جاتے ہیں۔لیکن یہ کمبخت سب کے ساتھ دشمنی ہی کرتی ہے۔حیرت ہے کہ نہ تو رہنے والے جانے والوں سے عبرت پکڑتے ہیں اور نہ بعد کے آنے

والے پہلے والوں کا حال سن کر اس سے احتراز کرتے ہیں۔ اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے ارشادات کو جاننے والے اس کے ارشادات سے کچھ نصیحت پکڑتے ہیں۔ اور پھر اس دھوکے کے گھر میں پڑ کر آخرت کو بھول جاتے ہیں۔ دل! دنیا اور دنیا کے مال ومتاع میں مشغول ہو جاتا ہے اور قدم آخرت کے راستے سے پھسل جاتے ہیں پھر ندامت اور حسرت کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ آخر میں موت اور نزع کے کرب کی بے چینی ان کو گھیر لیتی ہے۔ اور ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر جانے کی حسرتیں ان پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ دنیا اور دنیا کے مال ومتاع میں رغبت کرنے والا اپنے مقصد کو کبھی بھی پورا نہیں کر سکتا۔ اور مشقت سے کبھی راحت نہیں پا سکتا۔ امیر المومنین اس سے بچتے رہیے گا۔ اور اس کے نہایت خوشی کے ایام میں بھی بہت زیادہ ڈرتے رہیں اس پر اعتماد کرنے والا جب بھی خوش ہوتا ہے۔ یہ اس کو کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس میں خوش رہنے والا دھوکے میں پڑا ہے۔ اور اس میں ضرورت سے زیادہ نفع اٹھانے والا نقصان میں پڑا ہے- امیر المومنین اس کی راحتیں تکلیفوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس میں دل لگانے اور رہنے کا منتہا فنا ہے- اس میں دل لگانے والے کی خوشی رنج میں بدل جاتی ہے۔ جو کچھ گزر گیا وہ واپس آنے والا نہیں اور جو آنے والا ہے اس کا حال معلوم نہیں کہ کیا ہو؟ اس کی آرزوئیں جھوٹی ہیں، اس کی امید سب باطل، اس کی صفائی میں گدلا پن ہے۔ اس کے عیش میں مشقت اور وقت کا ضائع کرنا ہے۔ آدمی اس میں ہر وقت خطرے کی حالت میں رہتا ہے۔ اس کی نعمتیں خطرناک، اس میں بلاؤں کا ہر وقت خوف رہتا ہے۔ اگر حق تعالیٰ شانہ جو اس کے خالق ہیں وہ اس کی برائیوں کی اطلاع نہ بھی فرماتے تب بھی اس مکار کی اپنی حالت ہی سوتوں کو جگانے کے واسطے اور غافلوں کو ہوشیار کرنے کے واسطے کافی تھی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو خود اس پر خبردار کیا ہے۔ اور اس دنیا کو دھوکے کا گھر اور کھیل تماشہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوئی قدر نہیں۔ حق تعالیٰ شانہ نے اس کو پیدا فرما کر کبھی بھی اس کی طرف نظر نہیں فرمائی۔ امیر المومنین یہ دنیا اپنے سارے خزانوں کے ساتھ حضور کریم خاتم النبیین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے اس کو قبول نہ فرمایا۔ اس لئے کہ حضور کریم خاتم النبیین ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے منشاء کے خلاف پسند نہیں فرمایا۔ اور جس چیز سے آپ خاتم النبیین ﷺ کے خالق نے بغض رکھا۔ اس سے آپ خاتم النبیین ﷺ نے محبت نہیں کی۔ اور جس چیز کی اللہ تعالیٰ نے قیمت گرادی آپ خاتم النبیین ﷺ نے اس کو پسند کر کے اس کا درجہ بلند نہیں کیا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں سے اس کو قصداً ہٹا دیا۔ اور اپنے دشمنوں پر اس کی وسعت کر دی ہے۔ بعض دھوکے میں پڑے ہوئے لوگ اس کی وسعت کو جو حسرت سے دیکھتے ہیں وہ اس وسعت کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بہت کرم کیا ہے اور وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ نے یہ معاملہ رکھا کر پیٹ پر پتھر باندھے پڑے ہیں''۔ فقط وسلام

حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد ہے'' مجھے دنیا سے کیا لینا ہے۔ میری مثال تو اس سوار کی سی ہے جو سخت گرمی میں سفر کر رہا ہو۔ گرمی کی شدت میں کوئی سایہ دار درخت پر نظر پڑ جائے اور اس کے سائے میں دوپہر میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے ٹھہر جائے۔ پھر اس درخت کو چھوڑ کر آگے چلا جائے۔'' (مسند احمد)

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا'' دنیا دار کی مثال اس شخص کی سی ہے جو پانی پر چل رہا ہو- کیا کوئی شخص اس کی طاقت رکھتا ہے کہ پانی میں چلے اور اس کے پاؤں نہ بھیگیں؟'' (مشکوۃ)

ایک حدیث میں حضور کریم خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد ہے'' جو شخص لا الہ الا اللہ کی گواہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ملتا ہے وہ سیدھا جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ جب تک اس کے ساتھ کسی دوسری چیز کو خلط نہ کر دے'' (گڈمڈ نہ کر دے) حضور کریم خاتم النبیین ﷺ نے تین مرتبہ یہ ارشاد فرمایا۔ مجمع میں سے ایک شخص نے عرض کیا'' میرے ماں باپ آپ خاتم النبیین ﷺ پر قربان دوسری چیز خلط کرنے کا مطلب کیا ہے''؟ حضور کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا'' دنیا کی محبت اس کی ترجیح، اس کے لئے مال کا جمع کرنا، دنیا کی چیزوں سے خوش ہونا اور متکبر لوگوں کا سا عمل کرنا''- (درمنثور)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسلام اور کفر

اسلام کیا ہے؟ اسلام کے معنی عربی زبان میں اطاعت اور فرمانبرداری کے ہیں۔

مذہب اسلام کا نام ''اسلام'' اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔

اس کائنات کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے حکم پر رواں دواں ہیں۔ گویا یہ سب اللہ تعالیٰ کی فرمانبردار ہیں۔ چاند، سورج اور تارے سب ایک زبردست قاعدے میں بندھے ہوئے ہیں۔ اور اس کے فرماں بردار ہیں۔

جمادیات، نباتات اور حیوانات میں سے ہر ایک کے لئے جو قانون مقرر ہے اسی کے مطابق سب پیدا ہوتے ہیں بڑھتے ہیں، جیتے اور مرتے ہیں۔ اگر انسان کی حالت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جو قاعدہ اس کی زندگی کے لئے مقرر کیا گیا ہے اس کے مطابق سانس لیتا ہے۔ پانی، غذا، حرارت اور روشنی حاصل کرتا ہے۔ انسان کے دل کی حرکت، خون کی گردش، سانس کی آمدورفت ایک ضابطے کی پابند ہے۔ انسان کا دماغ، اس کا معدہ، اس کے پھیپھڑے، اس کے اعصاب، ہاتھ، پاؤں، زبان، آنکھ، کان غرض کہ جسم کا ایک ایک حصہ وہی کام کرتا ہے جس کے لئے وہ بنایا گیا ہے۔

اس لحاظ سے ساری کائنات اللہ تعالیٰ کی فرمانبردار ہے اور ساری کائنات کا مذہب اسلام (فرمانبرداری) ہے۔

اب ایک اور پہلو دیکھتے ہیں۔

انسان کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ دیگر مخلوقات کی طرح قانون قدرت کے زبردست قاعدوں میں جکڑا ہوا ہے۔ ہمارے اندرونی اعضاء ہمارے کنٹرول میں نہیں یہ اللہ کے فرمانبردار ہیں۔ دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ عقل رکھتا ہے۔ سوچنے، سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی قوت رکھتا ہے اور اپنے ارادہ اور اختیار سے ایک بات کو مانتا اور دوسری بات کو نہیں مانتا۔ اس حیثیت میں وہ دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح کسی مقرر قانون کا پابند نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کو اپنے خیال، اپنے ارادے اپنی رائے اور عمل میں انتخاب کی آزادی دی گئی ہے---انسان کی زندگی میں یہ دو حیثیتیں الگ الگ پائی جاتی ہیں۔

پہلی حیثیت میں وہ دنیا کی تمام دوسری چیزوں کی طرح پیدائشی مسلم ہے اور مسلم (فرمانبردار) ہونے پر مجبور ہے۔

دوسری حیثیت میں مسلم ہونا یا نہ ہونا اس کے اختیار میں ہے اور اسی اختیار کی وجہ سے انسان دو طبقوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

(1) ایک انسان وہ ہے جو اپنے خالق کو پہچانتا ہے اس کو اپنا آقا و مالک تسلیم کرتا ہے اور اپنی زندگی کے اختیاری کاموں میں بھی اللہ تعالیٰ کے پسند کئے ہوئے قانون کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ یہ ہے پورا مسلم۔ اس کا اسلام مکمل ہو گیا۔ کیونکہ اب اس کی زندگی سراسر اسلام ہے۔ اب اس کی ساری زندگی میں راستی ہی راستی ہے۔ کیونکہ وہ اختیار اور بے اختیار دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کے قانون کا پابند ہے اب وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ (نائب) ہے۔ ساری دنیا اس کی ہے اور وہ خود اللہ کا ہے۔

(2) دوسرا انسان وہ ہے جو مسلم پیدا ہوا اور اپنی زندگی بھر بغیر جانے بوجھے مسلم رہا مگر اپنے علم اور عقل کی قوت سے کام لے کر اس نے اللہ کو نہ پہچانا۔ اور اپنے اختیار کی حد میں اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیا یہ شخص منکر ہے یعنی اللہ کی اطاعت کا انکار کرنے والا۔

بندہ صحیح معنوں میں وہ ہے جو اللہ سے راضی ہو، اس کے افعال سے بھی راضی ہو، یعنی اس کے دینے پر اور چھیننے پر راضی ہو، اس کے انعام پر بھی راضی ہو اور اس کے انتقام اور سزا پر بھی اتنا ہی راضی ہو جتنا نعمت پر تھا۔ اس لیے کہ نعمت اور مصیبت بھیجنے والا اللہ ہے اور حکمت کے ماتحت بھیجتا ہے، بندے پر شفقت کے ماتحت بھیجتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس کی دی ہوئی نعمت پر راضی ہو جائیں اور بھیجی ہوئی مصیبت پر راضی نہ ہوں۔ دونوں پر یکسانی کے ساتھ رضامندی ہونی چاہیے۔ ایسے بندے جو اللہ کی ذات سے ہی نہیں، بلکہ افعال سے بھی راضی ہو۔ اس کی تقدیرات پر بھی راضی ہو، اس کے معاملات سے بھی راضی ہو اور جب بندہ اتنا راضی ہو گیا کہ نعمت میں بھی راضی اور مصیبت میں بھی راضی، نعمت آتی ہے جب بھی اس کا نام لیتا ہے، مصیبت آتی ہے جب بھی اس کا نام لیتا ہے۔ تو پھر ادھر سے یہ رضا شروع ہو جاتی ہے کہ یہ بندہ پسندیدہ ہے۔ ہر حالت میں اپنا ہے۔ لہٰذا ہم بھی اس کے۔ اگر یہ ہم سے راضی ہو تو ہم بھی اس سے راضی۔ اسے نہ عیش کا دھیان، نہ مصیبت کا دھیان۔ اسے تو عیش اور مصیبت بھیجنے والے کا دھیان ہے۔ نہ یہ عیش میں الجھا ہوا ہے نہ مصیبت میں اس کا دھیان تو ہماری طرف ہے۔

تو آدمی وہ ہے کہ عیش میں بھی اللہ کو نہ بھولے اور طیش میں بھی۔ نعمت میں بھی نہ بھولے، مصیبت میں بھی نہ بھولے، دنیا میں نعمت بھی آزمائش کیلئے ہے، مصیبت

بھی آزمائش کے لیے ہے، بندہ وہ ہے کہ دونوں حالتوں میں پورا اترے۔ اسے کہیں گے کہ یہ اللہ سے راضی ہے، اس لیے کہ رضا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم سب اللہ کے قائل ہو گئے اور ہم اس کی ذات سے راضی ہیں، اس طرح تو مومن اور غیر مومن دونوں راضی ہیں، مومن کے راضی ہونے کا مطلب ہے کہ اس کے افعال سے اس کی تقدیرات سے اور اللہ اپنے بندے کے ساتھ جو معاملہ کرے اس سے راضی۔ اگر وہ نعمت بھیج کے بادشاہ بنادے تو کہے ''اے اللہ میں راضی تیرا بندہ ہوں اور اگر یوں کہے کہ اس تخت کو چھوڑ کر جا اس وقت جنگ کر وہ کہے میں اس پر بھی راضی ہوں، میں جا کر جنگ کرونگا۔ اور اگر کہے کہ جان دے دو، تو بندہ کہے میں اس پر بھی راضی ہوں اور اگر کہے کہ ہم سب مال چھیننا چاہتے ہیں، کہے میں اس پر بھی راضی ہوں، اس لیے کہ آپ جو کچھ بھی کریں گے میری مصلحت سے کریں گے، آپ کے افعال میں کوئی غرض نہیں ہوسکتی، اب غنی عن العالمین ہیں حق تعالیٰ اپنے کسی نفع کے لیے بندے کو نہ نعمت دیتے ہیں نہ مصیبت۔ ان کا نفع نقصان سے کیا تعلق؟

اگر سارے بندے مل کر ایک جیسے اتقی قلب بن جائیں، سب کا قلب ایسا بن جائے جیسے انبیاء کرام کا قلب ہوتا ہے تو میری ملک میں ذرہ برابر اضافہ نہیں کر سکتے، اللہ کو نہ نفع کی پرواہ ہے، نہ نقصان کی نہ وہ نفع کا محتاج ہے نہ نقصان کا، اس لیے کہ جو کچھ ہے بندے کی مصلحت کیلئے ہے، اور اگر بندہ اس پر ہر طرح سے راضی ہے، اس کو راضیہ کہا گیا ہے، اس حالت میں تو ہمارے پاس آ رہا ہے کہ تو راضی تھا۔ دنیا میں ہم نے جو معاملہ تیرے ساتھ کیا تو نے اس پر رضا کا اظہار کیا، ہر حالت اور ہر تقدیر پر راضی رہا، اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تجھ سے راضی نہ ہوں؟ ہم تجھ سے راضی ہیں۔

کسی نے کسی بزرگ سے پوچھا تھا کہ آپ کا کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو، جس کی مرضی پر دونوں جہاں کے کارخانے چل رہے ہیں، لوگوں نے کہا آپ کیا اس درجے کے ہیں کہ دونوں جہاں کے کارخانے آپ کی مرضی پر چل رہے ہیں؟ فرمایا الحمد اللہ میں اسی درجے کا ہوں۔ لوگوں نے کہا آخر یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ فرمایا یہ اس طرح ہوسکتا ہے اور میرے اندر ہو گیا ہے کہ دونوں جہان کے کارخانے اللہ کی مرضی پر چل رہے ہیں میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے جو اس کی مرضی وہ میری مرضی۔ تو کوئی چیز میری خلاف طبع اس دنیا میں ہوتی ہی نہیں، کوئی پیدا ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں الحمد اللہ، یہی ہونا چاہیے تھا، کوئی دنیا سے گزرتا ہے تو میں کہتا ہوں الحمد اللہ یہ ہونا چاہیے تھا۔ میں کون ہوں کہ اللہ کوئی کام کرنا چاہے میں کہوں کہ یہ نامناسب ہے، نہیں ہونا چاہیے تھا۔

اگر کوئی شخص اپنے بارے میں یہ دیکھنا چاہے کہ اللہ تعالیٰ کا تعلق میرے ساتھ کیسا ہے؟ تو وہ یہ دیکھ لے کہ میرا تعلق اللہ کے ساتھ کیسا ہے؟ اس پر قیاس کرے، ویسا ہی اُس کا تعلق ہے۔ اگر ہماری طبیعت میں اللہ کی طرف سے بُعد ہے تو ادھر بھی بُعد (دوری) ہے، اور اگر ہماری طبیعت میں رجحان ہے اور جھک رہے ہیں ادھر سے بھی رحمت جھکی ہوئی ہوگی۔ یہ کسوٹی ہے ہر شخص، پہچان سکتا ہے کہ اللہ کا میرے ساتھ کیا معاملہ ہے؟۔ وہ اپنا معاملہ دیکھ لے اپنا آپ قطع نظر کر کے اللہ کے معاملات کو دیکھا تو۔ مسئلہ کبھی حل نہیں ہوگا، شکایت پیدا ہو جائے گی۔ کوئی برائی آئی اور شکایت پیدا ہو کہ مصیبت کیلئے کیا میرا ہی گھر رہ گیا تھا، مجھ پر ہی مصیبت بھیجنی تھی حالانکہ میں مومن ہوں۔ یہ شکوہ کیوں پیدا ہوا؟ اس لیے کہ اپنے معاملات پر نگاہ نہیں۔ جب بندہ یہ دیکھے گا کہ میں کتنی عبادت کر رہا ہوں کتنی اطاعت کر رہا ہوں اور اللہ سے کتنا راضی ہوں تو جتنی کوتاہی اپنے اندر ہوگی، سمجھ لے کہ اتنی رحمت کی ادھر سے کمی ہو جائے گی۔ اگر یہ پوری طرح سے متوجہ ہے تو یہ ناممکن ہے کہ ادھر سے بُعد ہو، غرض اللہ کے معاملات کو پہچاننے کی کسوٹی یہ ہے کہ آدمی اپنے معاملات کو (اللہ سے) دیکھ لے۔ حدیث پاک میں ہے کہ ''بعض صحابہ کرامؓ نے عرض کی یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ہم کیسے پہچانیں کہ اللہ ہم سے راضی ہے یا یہ کہ ہم حق تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہیں۔ فرمایا کہ اپنے عمل کو دیکھو اگر عمل کر رہے ہو تو فضل متوجہ ہے۔

تو کسوٹی بیان کر دی گئی کہ آدمی اپنے معاملے کو دیکھ کر اللہ کے معاملے کو پہچان لے اس لیے اگر ہم خود اللہ سے راضی ہیں اور صبح سے شام تک ہمارے قلب کا رخ یہ ہے کہ جو پیش آ جائے، ہم مطمئن ہیں کہ میں راضی ہوں، بس ٹھیک ہے میں شکر گزار ہوں، سمجھ لو کہ حق تعالیٰ بھی ہمارے ہر فعل سے راضی ہیں۔

کفر کیا ہے؟

کفر کے اصل معنی چھپانے اور پردہ ڈالنے کے ہیں۔ ایسے شخص کو کافر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی فطرت پر نادانی کا پردہ ڈال رکھا ہے۔ تمام دنیا کی اور خود اپنی فطرت اس سے چھپ گئی ہے کفر ایک جہالت ہے۔ بلکہ اصلی جہالت کفر ہی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا جہالت ہوگی کہ انسان اللہ سے ناواقف ہو۔ ایک شخص کائنات کے اتنے بڑے کارخانے کو رات دن چلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مگر جاننا ہی نہیں چاہتا کہ اس کارخانے کو بنانے اور چلانے والا کون ہے؟

ایک شخص دنیا میں ہر طرف ایسی چیزیں اور ایسے کام دیکھتا ہے۔ جن میں بے نظیر انجینئرنگ، ریاضی دانی، کیمیا دانی اور ساری دانائیوں کے کمالات نظر آتے ہیں مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ علم و حکمت اور دانش مندی والی ہستی کون سی ہے؟ جس نے کائنات میں سارے کام انجام دیئے ہیں؟

غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ ایسے شخص کے لئے صحیح علم کے دروازے کیسے کھل سکتے ہیں جس کو علم کا پہلا سرا ہی نہ ملا۔ جس کو شروع میں جہالت کا اندھیرا نظر آئے گا وہ آخیر میں بھی اندھیرے کے سوا کچھ نہ دیکھ پائے گا۔

کفر ایک ظلم ہے۔ بلکہ سب سے بڑا ظلم کفر ہی ہے۔ کفر ظلم ہی نہیں بلکہ یہ بغاوت، ناشکری اور نمک حرامی ہے۔ اگر انسان غور کرے تو انسان کے پاس خود اپنی چیز ہے کیا؟ اپنے دماغ کو اس نے بنایا یا اللہ نے، اپنا دل، اپنی آنکھیں، اپنی زبان، اپنے ہاتھ پاؤں تمام اعضاء کا وہ خود مالک ہے یا اللہ کی ذات؟ جب اصل حقیقت اللہ کی ذات ہے تو ایسے انسان سے بڑا باغی کون ہوگا؟ اگر کوئی سرکاری افسر حکومت کے دیئے ہوئے اختیارات کو خود حکومت ہی کے خلاف استعمال کرتا ہے تو اسے باغی کہتے ہیں۔ اور یہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

انسان پر سب سے بڑا حق اس کے ماں باپ کا ہے مگر ماں باپ کے دل میں اولاد کے لئے محبت کس نے پیدا کی؟ ماں کے سینے میں دودھ کس نے اتارا؟ باپ کے سینے میں یہ بات کس نے ڈالی کہ اپنے خون پسینے کی کمائی گوشت پوست کے ایک بے کار لوتھڑے پر خوشی خوشی لٹادے اور اس کی پرورش اور تعلیم وتربیت میں اپنا وقت، اپنی دولت، اپنی آسائش سب کچھ قربان کردے۔ اب دیکھیں کہ جو انسان کا اصلی محسن ہے۔ حقیقی بادشاہ ہے۔ سب سے بڑا پروردگار ہے اگر اسی کے ساتھ انسان کفر کرے۔ اس کو اپنا رب نہ مانے اس کو اپنا معبود نہ مانے اس کی بندگی سے انکار کرے اور اس کی اطاعت سے منہ موڑے تو یہ کیسی سخت بغاوت ہے؟ کتنی بڑی احسان فراموشی اور نمک حرامی ہے؟ کفر اور نافرمانی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان ہمیشہ کے لئے ناکام اور نامراد ہوجائے۔ ایسے شخص کو علم کا سیدھا راستہ کبھی نہ مل سکے گا۔ کیونکہ جو علم خود اپنے خالق کو نہ جانے وہ کس چیز کو جان سکتا ہے؟ اس کی عقل ہمیشہ ہی ٹیڑھے راستے پر چلے گی اور وہ کبھی آخرت کی کامیابیوں کی راہ نہ پا سکے گا۔

اس کے برعکس دوسرا شخص ہے جس نے علم اور عقل سے صحیح کام لے کر اللہ کی ذات کو جانا اور پہچانا۔ حالانکہ وہ ایسا کرنے پر مجبور نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے ارادے اور اختیار سے یہ راستہ منتخب کیا۔ اس نے نیک اور بد کی تمیز میں غلطی نہیں کی اور اپنے آزاد انتخاب سے نیکی کو ہی پسند کیا۔ اس نے اپنی فطرت کو جانا اپنے اللہ کو پہچانا اور نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری ہی اختیار کی۔ اس نے حق کو پہچان کر یہ ثابت کردیا کہ وہ حق شناس ہے اور حق کے آگے سر جھکا کر یہ بھی دکھا دیا کہ وہ حق پرست ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص میں یہ صفات موجود ہوں اس کو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب ہونا ہی چاہیے۔ ایک مسلم کے اخلاق میں حق شناسی اور راست بازی ہوتی ہے۔ ایک مسلمان دنیا میں یہ سمجھ کر رہتا ہے کہ سب چیزوں کا مالک اللہ ہے۔ اور انسانوں کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ہی دیا ہوا ہے۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی معزز نہ ہوگا کیونکہ اس کا سر اللہ کے سوا کسی کے سامنے جھکنے والا نہیں اور اس کا ہاتھ اللہ کے سوا کسی کے آگے پھیلنے والا نہیں۔

اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی طاقت ور نہ ہوگا کیونکہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا خوف نہیں۔ وہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا معبود نہیں جانتا اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی غنی اور دولت مند نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ عیش پرست نہیں، خواہش نفس کا بندہ نہیں، حریص اور لالچی نہیں۔ قناعت پسند اور حلیم ہے اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی محبوب اور ہر دل عزیز نہ ہوگا کیونکہ وہ ہر شخص کا حق ادا کرنے والا ہے اور کسی کا حق نہیں مارتا۔ کسی کا دل نہیں دکھاتا۔ اس سے بڑھ کر دنیا میں کسی کا اختیار بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ امانت میں خیانت نہیں کرتا صداقت سے منہ نہیں موڑتا۔ وعدے کا سچا اور معاملے کا کھرا ہوتا ہے۔ ہر ایک کی دل جوئی کرتا ہے اس کے کام آتا ہے ایک مسلم کی سیرت کو اچھی طرح دیکھ لیں تو یقین آجائے گا کہ مسلم کبھی دنیا میں ذلیل، محکوم اور مغلوب بن کر نہیں رہ سکتا۔ وہ ہمیشہ غالب اور حاکم ہی رہے گا۔ کیونکہ اسلام نے جو صفات اس میں پیدا کردی ہیں ان پر کوئی قوت غالب نہیں آسکتی۔

اس طرح دنیا میں عزت اور بزرگی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے بعد جب وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوگا تو اس پر اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں اور رحمتوں کی بارش کرے گا۔ کیونکہ جو امانت اس کے سپرد کی گئی تھی اس کا حق اس نے ادا کردیا۔ اور جس امتحان میں اللہ تعالیٰ نے اسے ڈالا تھا اس میں وہ کامیاب ہوگیا۔ یہ ابدی کامیابی ہے۔ جو دنیا سے لے کر آخرت تک چلی جاتی ہے اور اس کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

یہ ہے اسلام۔ انسان کا فطری مذہب۔ یہ کسی قوم اور کسی ملک کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ہر زمانے اور ہر قوم اور ہر ملک میں جو خدا شناس اور حق پرست لوگ گزرے ہیں ان سب کا یہی مذہب تھا۔ وہ سب مسلم تھے۔ خواہ ان کی زبان میں اس مذہب کا نام اسلام ہو یا کچھ اور ہو۔ ہماری زبان میں اس کا نام ''اسلام'' ہے۔

****

عابداور معبود کے درمیان رشتہ (عبادت)

عبادت کیا ہے؟ عابداور معبود کے درمیان رشتہ عبادت ہے۔

معبود کے احکامات کی بجا آوری عبادت ہے۔ یہ احکامات امرونواہی کی شکل میں ہمیں پیغمبر کی ذات اقدس اور قرآن حکیم کے وسیلہ سے معلوم ہوتے ہیں ان کی تعمیل بغیر عذر اور تردد کے عبادت کی اصل ہے۔

مسلمانوں کو عبادت کے مفہوم سے کماحقہ آگاہ کرنے کے لئے حضور اکرم خاتم النبیین ﷺ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں عملی کردار ادا فرمایا۔ عبادت کے اس مفہوم میں نہ اضافے کی گنجائش ہے۔ نہ تحقیق کی۔ نماز فرض ہے تو سب کے لئے سب زمانوں میں فرض ہے۔ اسی طرح باقی عبادات ان میں نہ کوئی کلام ہے نہ کسی بحث کی ضرورت۔ احکامات جاری ہو چکے ہیں ان کی تعمیل پیغمبر خاتم النبیین ﷺ کے زمانے سے آج تک من وعن جاری ہے۔ ملت اسلامیہ کا عبادت کا طریقہ کار وہی ہے جو حضور اکرم خاتم النبیین ﷺ کے زمانہ میں آپ خاتم النبیین ﷺ کا تھا۔ معبود کا حکم ہے کہ حرام نہ کھایا جائے اب حرام مال سے اجتناب عبادت ہے۔ ماں باپ کا اس حد تک ادب کیا جائے کہ ان کے آگے اف تک کا لفظ نہ کہا جائے پس والدین کی خدمت عبادت ہے۔ غرضیکہ جو کچھ بھی معبود نے فرمایا اس پر یقین اور عمل عبادت ہے۔

جو کچھ کرنے کے لئے کہا گیا وہ کیا جائے اور جس سے بچنے کے لئے کہا گیا۔ اُس سے بچا جائے یہی عبادت ہے۔ **عبادت عقیدہ بھی ہے اور عمل بھی**۔ ایک بات جو اس ضمن میں قابل غور ہے وہ یہ کہ ہمارا معبود ہمارا خالق بھی ہے۔ خالق نے مخلوق کے لئے تخلیق کے حوالے سے فرائض عائد فرما رکھے ہیں۔ ان کی بجا آوری بھی عبادت ہے۔ مثلاً خالق نے ہمیں انسان پیدا کیا۔ انسان کے تحفظ کے لئے جو اعمال ضروری ہیں انہیں ادا کرنا عبادت ہے۔ اگر سانس لینا فرض ہے تو ہمارا دامن فرائض کا انبار لیے ہوئے ہے ان فرائض کو پورا کرنا ہے۔ مثلاً رزق کمانا ضروری ہے۔ اس لئے رزق کمانا عبادت ہے۔ رزق کمانے کے بعد اس کی مناسب تقسیم عبادت ہے۔ اللہ کا حصہ اللہ کو دیا جائے۔ دنیا کا حصہ دنیا کو دیا جائے۔ اپنا حصہ استعمال میں لایا جائے یہ عبادت ہے۔ اپنے استعمال میں آنے والے رزق کو مناسب استعمال کرنا بھی عبادت ہے۔ مطلب یہ کہ **زندگی کو اپنے ماحول میں پرسکون بنانے کے ساتھ ساتھ اسے دین کے تابع رکھنا ہی عبادت ہے۔**

نیت بدل جائے تو نیک عمل نیک نہیں رہتا۔ انسان اگر اندر سے منافق ہو تو اس کا کلمہ توحید کلمہ توحید نہ ہوگا۔ ہر چند کہ کلمہ توحید ہے۔ قرآن بیان کرنے والے اور قرآن سننے والے اگر متقی نہ ہوں تو قرآن فہمی سے وہ نتائج کبھی پیدا نہ ہوں گے جو قرآن کا منشا ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر منافق حضور پاک خاتم النبیین ﷺ کی نبوت کی گواہی دیں تو یہ بیان ہر چند کے سچا ہے لیکن منافق جھوٹ بول رہے ہیں، اسلام کے دشمن اگر مسجد بنائیں تو وہ مسجد گرادی جائے اس سے مسجد کا احترام مجروح نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برعکس یہ مساجد کے احترام ہی کا عمل ہے۔ **اگر مساجد میں عبادت جاری ہے۔ اور اہل محلہ کی معاشرتی زندگی میں اصلاح کا عمل نہیں پیدا ہوتا تو ایسی عبادت قابل غور ہے۔ نماز کا مقصد صرف نماز ادا کرنا ہی نہیں ہے۔ بلکہ نماز کے انداز اور نماز کے مفہوم کو اپنی زندگی میں رائج کرنا ہے** اگر زندگی سماجی قباحتوں میں بدستور گرفتار ہے اور نماز بھی برابر ادا کی جاری ہے تو ایسی صورت حال بہت ہی غور طلب ہے۔ مثلاً ایک عابد ڈاکٹر مریضوں کے حق میں ٹھیک نہیں تو اس کے لئے اس کی عبادت منفعت نہ لائے گی۔ اسی طرح اگر ہم تمام شعبۂ حیات میں زندگی کے فرائض ادا نہ کریں۔ اور معبود کی عبادتیں جاری رکھیں۔ تو یہ منشائے عبادت نہیں منشائے **عبادت یہ ہے کہ فرائض حیات بھی ادا کئے جائیں اور معبود کی عبادت بھی جاری رہے۔**

اگر اولاد کی پرورش فرض ہے تو اولاد کے لئے صحت مند ماحول مہیا کرنا عبادت ہے ایک دوسرے کا احترام عبادت ہے۔ خالق کے احکام کا احترام عبادت ہے۔ خالق نے یہ کائنات تخلیق فرمائی۔ انسان تخلیق فرمائے، کافر، مومن، کالے، گورے، صحت مند، بیمار، محتاج، غریب وغیرہ ان کا احترام تخلیق کے حوالے سے فرض ہے اور دین کے حوالے سے ان کی اصلاح عبادت ہے۔ کافر کو دعوت اسلام دینا عبادت ہے۔ یہ دعوت محبت سے دی جائے یا قوت سے دی جائے مفہوم کافر کی اصلاح ہے۔ منشائے اصلاح عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے دعوت عمل صرف اللہ ہی کے لیے ہو تو عبادت اگر اس میں انا یا نفس شامل ہو جائے تو عبادت نہ رہے گی۔

غور طلب بات یہ ہے کہ جب عبادت وہی ہے معبود بھی وہی ہے تو نتیجہ وہی کیوں نہیں؟

آج مسلمانانِ عالم اپنی عبادت کے باوجود اقوام عالم میں پسماندہ ہیں کیوں؟ اگر اللہ کا پسندیدہ دین اسلام ہی ہے اور اس میں شک نہیں ہے اور ہم مسلمان ہیں۔ اسلام قبول کرنے والے ہیں۔ اور ہماری زندگی ہمارے مالک سے قریب ہونے کے دعویٰ کے باوجود آسانیوں سے محروم ہے تو ہمیں سوچنا پڑے گا کہ کچھ نہ کچھ کہیں

نہ کہیں بگاڑ ہے پانی کہیں مر رہا ہے۔

مسجد اقصیٰ مسلمانوں کے لیے ایک پسندیدہ جگہ ہے اور بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول ہے۔ یہودیوں کے قبضے میں ہے ہم بے بس ہیں۔تو کیا اللہ بے بس ہے؟ (نعوذ باللہ) لیکن کچھ نہ کچھ ہے، کہیں نہ کہیں ہماری طرف سے کوتاہی ہو رہی ہے۔اللہ تعالی اسرائیل کو پکڑ کیوں نہیں رہا؟ اسرائیل کو اللہ تعالی نے اتنی چھوٹ کیوں دے رکھی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ 90 فیصد لوگ صبح کی نماز نہیں پڑھتے۔ پوری دنیا میں تقریباً 200 کروڑ مسلمان ہیں ان میں سے اگر 10 فیصد فجر پڑھتے ہیں اور 90 فیصد نہیں پڑھتے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ 180 کروڑ لوگوں نے فجر نہیں پڑھی---تو کیا اللہ ان کو پکڑ رہا ہے؟ نہیں پکڑ رہا۔اسی طرح اسرائیل کو بھی نہیں پکڑ رہا- ہم میں سے پچانوے فیصد لوگ اپنی بیٹیوں کو جائیداد میں حصہ نہیں دیتے، وراثت بچیوں کو نہیں دی جاتی---اللہ دیکھ رہا ہے۔لیکن کیا ہمیں پکڑ رہا ہے؟ اسی طرح اسرائیل کو بھی نہیں پکڑ رہا- اب اس کی مثال ایسی ہے جیسے بچہ جب امتحان دیتا ہے تو غلط بھی لکھتا رہتا ہے، استاد ٹہلتا رہتا ہے، اسی استاد نے اس کو پڑھایا ہے،، اسی نے پرچہ بنایا ہے، اسی نے چیک بھی کرنا ہے- وہ دیکھ رہا ہے، مسکرا رہا ہے اور خاموش رہتا ہے کیوں؟ اس نے دل میں متعین کر لیا ہے کہ میں جب اس بچے کا رزلٹ بتاؤں گا تو اسے خود پتہ چل جائے گا- اس کے مسکرانے سے کوئی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔اللہ تعالی نے قرآن مجید میں عذاب کے لیے خوشخبری کا لفظ استعمال کیا ہے-

فَبَشِّرۡهُم بِعَذَابٍ اَلِيمٍ ترجمہ:"ان کو عذاب کی خوشخبری سنا دو"۔(سورہ الانشقاق، آیت نمبر 24)

یہ کون سی خوشخبری ہے؟ یہ خوشخبری تو نہیں ہے یہ کمنٹ ہے- سمجھنے کی کوشش کریں--- ہر مسکراہٹ خوش کرنے والی نہیں ہوتی - بہت سی مسکراہٹ خطرناک ہوتی ہیں- تو اللہ بھی ہمیں دیکھ رہا ہے اس نے طے کر رکھا ہے کہ یہ اب امتحان دے رہے ہیں اب میں کسی کو کچھ نہیں کہوں گا- ان کو آنا تو میرے ہی پاس ہے- جب یہ آئیں گے تو اپنا رزلٹ معلوم کر لیں گے- اس لیے ہمیں عبدیت کی ضرورت ہے- پوری دنیا کو فتح کرنے سے بھی زیادہ بڑی کامیابی یہ ہے کہ فجر کی نماز وقت پر ادا کی جائے- اپنے دن کی شروعات اللہ تعالی کی رضا سے کی جائے- یہ وہ پہلی کامیابی ہے جو شیطان کے منصوبے کو ناکام بنا دیتی ہے- یہ سجدہ ہمارے دل کو سکون، روح کو تازگی اور زندگی کو برکت سے بھر دیتا ہے- اللہ کے حضور اس وقت جھکنے والا کبھی ناکام نہیں ہوتا-

ہم عبادت کرتے ہیں دعائیں مانگتے ہیں۔نیک عمل کرتے ہیں۔لیکن زندگی مشکلات سے باہر نہیں نکلتی کیوں؟ مسلمانوں کے پاس سب سے زیادہ دولت ہے اور مسلمان ہی سب سے زیادہ غریب ہیں اور پھر بھی وہ مسلمان ہیں اخوت کا درس اور چیز ہے اور اخوت کا عمل اور چیز--مسلمانوں کے لئے، تیل کے چشمے ہیں، اور مسلمانوں کے پاس ہی چراغ کے لئے تیل نہیں۔اگر اعمال یہودیوں کے سے ہوں اور عبادت مسلمانوں کی سی تو نتیجہ کیا ہوگا؟؟؟

محمد بن قاسم نے حملہ اس لئے کیا کہ مسلمان خواتین کی بے حرمتی کی گئی تھی۔محمد بن قاسم جلال خداوندی بن کر ناموس ملت کے تحفظ کے لئے تشریف لائے۔آج اگر مسلمان مرد ہی مسلمان خواتین کی بے حرمتی کریں۔تو محمد بن قاسم کہاں سے آئے اور کیا کرے؟ بے بسی ہے۔عبادت کے مفہوم کی وضاحت میں علامہ اقبال نے کیا خوبصورت اشعار فرمائے ہیں۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

کتنا روح پرور منظر ہوگا غزنوی و ایاز ایک ہی دربار میں یکساں حالت میں موجود ہیں آقا و غلام کی تقسیم ختم ہو گئی۔یہ عبادت کی اصل ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔کہ اگر منشائے عبادت آقا و غلام کی تقسیم ختم کرنا ہے تو کتنی دیر کے لئے؟ صرف نماز میں؟ صرف مسجد کے اندر؟

یہی عبادت کی اصل ہے اور یہی عبادت سے محرومی ہے کہ ہم صرف نماز میں بندہ و صاحب کی تقسیم ختم کرتے ہیں اور زندگی میں یہ فرق جاری رکھتے ہیں۔اگر عبادت کی حالت زندگی میں رائج ہو جائے۔تو عبادت کے نتائج حاصل ہو سکتے ہیں غزنوی اور ایاز کی تقسیم ختم کرنے کے لئے عبادت فرض کی گئی اور ہم نے محمود و ایاز کے درجے کو قائم رکھ کر عبادت کی۔اسی لئے عبادت کی برکت زندگی میں شامل نہ ہو سکی۔ایک آدمی آٹے میں ملاوٹ کرتا جا رہا ہے اور عبادت بھی کرتا جا رہا ہے۔ایک آدمی عبادت بھی کرتا جا رہا ہے اور سودی کاروبار بھی کرتا جا رہا ہے، تو نہ یہ برے کام چھوڑے جائیں گے اور نہ ہی عبادت کا نتیجہ و انعام سامنے آئے گا۔ایک انسان جھوٹا ہے اور سچا کلام پڑھ رہا ہے۔نتیجہ کیا ہوگا؟ متقی نہ ہو تو انسان قرآن سے فلاح نہیں پا سکتا۔کافر اگر قرآن پڑھ بھی لے تو مومن نہیں ہو جاتا۔ہدایت کے لئے تقویٰ شرط ہے۔

حضور پاک خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہمارے سامنے ہے آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ اس کائنات کے تمام مراتب سے بلند ہے آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی باعث تخلیق کائنات ہے۔آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر کروڑوں درود و سلام ہو آپ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منصب کی بلندیوں کے

باوجود اپنی زندگی کو اپنے جانثاروں کی زندگی کے برابر رکھا آپ خاتم النبیین ﷺ اللہ تعالیٰ کے پاس تشریف لے جاتے ہیں اور لباس میں پیوند ہے۔ آپ خاتم النبیین ﷺ نے کبھی اپنے پاس مال جمع نہیں کیا۔ بلکہ آپ خاتم النبیین ﷺ نے دو وقت کا کھانا بھی اپنے پاس محفوظ رکھنا پسند نہ فرمایا عبادت کی تاثیر حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عابدوں پر زندگی کی نوازشیں یکساں ہوں۔ اگر ناہموار معاشی، ساجی اور معاشرتی زندگیاں ایک جگہ یکساں عبادت کے لئے مصروف رہیں اور سال ہا سال رہیں تو بھی نتیجہ یکساں نہ نکلے گا بلکہ کچھ نتیجہ ہی نہ نکلے گا۔

ہماری عبادت ثواب سے محروم ہے۔ اس لئے ہماری زندگی یکساں مواقع سے محروم ہے۔ یتیم کا مال چھین کر حج کرنے والا ظالم۔ حج کے ثواب سے کیوں نہ محروم رہے گا؟؟؟

مسلمانوں کا حج مسلمانوں کے لئے وہ نتیجہ پیدا نہیں کر رہا اس لئے کہ حج کے موقع پر تمام خرید و فروخت اس مال کی ہوتی ہے جو یہودیوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ جہاز ان کے بنے ہوئے، سامان ان کا بکتا ہے۔ یعنی حج ہمارا اور ثواب ان کا۔ ہم غیر مسلم معاشرے کی اشیا خریدنے سے کیوں گریز نہیں کرتے؟ عبادت کے ثواب کو مسلمانوں کے لئے وقف کر دینا بھی عبادت ہے۔ لیکن اگر دل مومن نہیں تو عبادت کیسی؟ دل سے اللہ کو ماننا ہی عبادت ہے مشکلات پر صبر کرنا عبادت ہے۔ نعمتوں پر شکر ادا کرنا عبادت ہے۔ **اپنی منشا کو منشائے الٰہی کے تابع کرنا عین عبادت ہے۔ محروم اور مظلوم کو اس کا حق دلانا عبادت ہے۔ اپنی زندگی کو بے ضرر بنانا عبادت کی ابتدا اور اپنی زندگی کو منفعت بخش بنانا اس کی انتہا ہے۔ یہی عبدیت ہے۔ یہی وہ رشتہ ہے جو ہم نے اپنے معبود کے ساتھ استوار کرنا ہے۔** جہاں اور جتنا ہو سکے لوگوں کا بھلا کیا جائے کسی کا حوصلہ بڑھا کر، کسی کو تسلی دے کر، کسی کی مالی امداد کر کے، کسی کی عیادت کر کے اور کسی کو راستہ دکھا کر۔ جب تک ہمارے ہاتھ سے خیر تقسیم ہو رہی ہے ہمارے اوپر زوال نہیں آ سکتا۔ خیر کا مطلب قرض حسنہ، علم نافع، اچھا مشورہ، دکھ میں دلاسہ، دل آزاری میں احتیاط، مسکرا کر سلام کا جواب دینا، بلا حسد مبارک باد دینا اور اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جس سے مخلوق خدا کو خوش کیا جاتا ہے۔

انسان جتنا اللہ تعالیٰ کے قریب ہوگا۔ اتنا ہی مخلوق پر مہربان ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جو اللہ کے حبیب ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے انتہائی قریب ہیں۔ وہ ہی کائنات میں سب کے لئے رحمت ہیں۔ اللہ کی عبادت ہمیں مخلوق پر شفیق بناتی ہے۔ مخلوق پر ظلم کرنے والا، ان سے دھوکا کرنے والا، ان کی خوراک میں ملاوٹ کرنے والا چاہے جتنی بھی عبادت کر لے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کسی کا حق چھیننے والا اگر تقرب الٰہی کا دعویٰ کرے تو یہ دعویٰ دلیل سے محروم ہوتا ہے۔

تقرب الہی دراصل انسانوں کی خدمت ہی کا نام ہے۔ وہ شخص جھوٹا ہے جو انسانوں سے نفرت کرے اور اللہ سے پیار کا دعوی کرے۔ اللہ تعالی جب کسی بندے سے ناراض ہوتا ہے تو اسے پاکیزہ لوگوں کی عیب جوئی میں مشغول کر دیتا ہے۔ فطرت کا ایک قانون ہے کہ وہ ڈھیل دیتا ہے پھر کوئی متکبر بن جاتا ہے اور کوئی عاجزی اختیار کر لیتا ہے۔ اللہ کو ماننا چاہیئے، اللہ کو جاننا مشکل ہے۔ ہمارے ذمہ تسلیم ہے، تحقیق نہیں ہے۔ تحقیق دنیا کی کرو اور تسلیم اللہ کو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم دنیا کو تسلیم کر لیں اور تحقیق اللہ کی شروع کر دیں۔

کہنے لگے کہ ہم کو تباہی کا غم نہیں   ہم نے کہا کہ وجہِ تباہی یہی تو ہے
اے بے خبر! عذاب الٰہی سے بے خبر   ہم لوگ ہیں عذاب الٰہی یہی تو ہے

عبادت اجتماعی فلاح کے لئے ایک حقیقی اور اسلامی راستہ ہے۔ عبادت انفرادی یا امتیازی نہیں اگر کشتی کنارے لگی تو سب ہی کنارے لگیں گے۔ ورنہ مشکل ہو جائے گی کسی معمولی حیثیت والے انسان کی عزت کرنا عبادت ہے۔ اور انسانیت کی شرافت کا ثبوت اور کسی معمولی نظر آنے والے انسان کو ذلیل کرنا گناہ ہے اور یہ انسانیت کے فنا ہونے کا ثبوت ہے۔ بے تکلفی کے لمحات ہوں یا کمزوروں کے ساتھ ہمارے معاملات، یہی وہ فیصلہ کن لمحات ہیں جو عبادت ہیں اور یہ ہی وہ فیصلہ کن لمحات جو اللہ تعالیٰ کی نظر میں ہمارا مقام طے کر دیتے ہیں۔

ظالم انسان کی آواز اونچی ہوتی ہے جو مظلوم انسان کو خاموش کروا دیتی ہے لیکن مظلوم انسان کی خاموشی ظالم انسان کی بنیاد ہلا دیتی ہے۔ انسان مال جمع کرتا رہتا ہے اس کے بینک بھرتے رہتے ہیں لیکن دل خالی رہتا ہے۔ انسان سے محبت وہی کر سکتا ہے جس پر رب مہربان ہو۔

یہ وہ تمام چیزیں ہیں جنہیں لوگ عبادت ہی نہیں سمجھتے۔ عام لوگوں کی نظر میں صرف نماز، روزہ، زکوۃ اور حج عبادت ہے۔ ان تمام چیزوں کو سمجھنا بہت ہی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھ، عقل اور فہم عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شب بیداری

شیطان کی خباثت:- حدیث شریف میں ہے کہ ''جب انسان سوجاتا ہے تو شیطان اس کے سر پر تین گرہیں لگا تا ہے پھر جب وہ سوکر اُٹھتا ہے اور اللہ کا ذکر کرتا ہے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے، جب وضو کرتا ہے تو دوسری گرہ کھل جاتی ہے، اور جب نماز پڑھتا ہے تو آخری گرہ بھی کھل جاتی ہے اس صورت میں صبح کو آدمی ہشاش بشاش ہوتا ہے ورنہ دوسری صورت میں سست اور چڑ چڑا رہتا ہے''۔(بخاری شریف)

قرآن پاک میں تہجد کی نماز کی فضیلت:- ترجمہ:''وہ رات میں کم سویا کرتے اور پچھلی رات میں استغفار کرتے''۔ (سورۃ الذاریات،آیت نمبر-17،18)

ترجمہ''ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے اور وہ خوف اور امید سے اپنے رب کو پکارتے''۔(سورۃ السجدہ،آیت نمبر-16)

ترجمہ:''کیا وہ جس نے فرمانبرداری میں رات کی گھڑیاں سجود اور قیام میں گزاریں ،اور وہ آخرت سے ڈرتا اور اپنے رب کی رحمت کی آس لگائے ہوئے ہے''۔(سورۃ الزمر،آیت نمبر-9)

ترجمہ:''وہ لوگ اپنے رب کے لئے سجدے اور قیام میں رات گزارتے ہیں''۔ (سورۃ الفرقان،آیت نمبر-64)

ترجمہ:''اور رات کے کچھ حصے میں تہجد پڑھا کرو، یہ خاص نماز تمہارے لئے ہے قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں ایسی جگہ کھڑا کردے جہاں سب تمہاری حمد کریں''۔(سورۃ الِاسراء،آیت نمبر-79)

ترجمہ:"اسی نے (اللہ نے) رات اور دن کو ایک دوسرے کا قائم مقام بنایا ہے اس کے لئے جو ذکر کرا ور شکر کا ارادہ کرے"-(سورہ الفرقان،آیت نمبر62)

نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) کی شب بیداری:- حضرت کریبؓ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک رات حضرت میمونہؓ کے گھر تھا، میں بچھونے کی چوڑائی کی طرف لیٹ گیا نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) اور آپ (خاتم النبیین ﷺ) کی زوجہ مطہرہ لمبائی کی طرف آرام فرما ہوگئے، جب آدھی رات یا اس سے پہلے یا کچھ بعد کا وقت ہوا تو نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) بیدار ہوئے، آپ (خاتم النبیین ﷺ) اٹھ بیٹھے اور ہاتھوں سے رآنکھوں کو مل کر نیند کے اثرات ختم کئے، پھر سورہ آل عمران کی آخری دس آیات تلاوت فرمائیں اس کے بعد ایک لٹکے ہوئے مشکیزے کی طرف کھڑے ہوئے اور اس سے نہایت عمدہ وضو فرمایا، اور پھر آپ (خاتم النبیین ﷺ) نے نماز ادا فرمائی، حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ میں بھی کھڑا ہوا اور اسی طرح کیا جو حضور پاک (خاتم النبیین ﷺ) نے کیا تھا۔ پھر آپ (خاتم النبیین ﷺ) کے بائیں پہلو میں کھڑا ہوگیا، حضور پاک (خاتم النبیین ﷺ) نے اپنا دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھا اور پھر میرا دایاں کان مروڑا، (اور مجھے دائیں طرف کردیا) چنانچہ آپ (خاتم النبیین ﷺ) نے دو دو رکعتیں کر کے دس رکعت نماز ادا فرمائی پھر وتر پڑھ کر لیٹ گئے۔ یہاں تک کہ مؤذن آ گیا اس کے بعد آپ (خاتم النبیین ﷺ) نے دو مختصر رکعتیں ادا کیں (فجر کی سنتیں) پھر مسجد کی طرف تشریف لے گئے اور صبح کی نماز ادا فرمائی"۔(صحیح بخاری)

حضور پاک (خاتم النبیین ﷺ) کا عمل:- حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) سے پوچھا گیا کہ کونسا عمل بہتر ہے؟ آپ (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا جو ہمیشہ کیا جائے اگر چہ کم ہو، آپ (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا ''رات کو نماز پڑھ، چاہے بکری کا دودھ دھونے کے برابر ہو''۔ کبھی یہ چار رکعت کا اندازہ ہوتا، کبھی دو رکعت کا اندازہ۔ نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا بندہ رات کے وقت جو دو رکعتیں نماز پڑھتا ہے وہ دنیا سے بہتر ہیں۔ اگر میں انہیں اُمت کے لئے باعث مشقت نہ سمجھتا تو ان پر فرض کر دیتا۔ آپ (خاتم النبیین ﷺ) نے یہ سب کچھ اس لئے اختیار فرمایا کہ اُمت کے لئے قیام اور عبادت میں آسانی رہے۔ ان پر بوجھ نہ پڑے تاکہ وہ عبادت سے اکتا کر بیزار نہ ہو جائیں۔ لیکن آپ (خاتم النبیین ﷺ) نے رات کو قیام کی ہدایت بھی فرمائی اس کی فضیلت اور قیام کے ثواب کا ذکر بھی فرمایا تاکہ اُمت صرف فرضوں اور سنتوں پر ہی اکتفا نہ کرے۔

نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) کی حضرت ابوہریرہؓ کو تین وصیتیں:- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) نے تین باتوں کی وصیت فرمائی، ''سونے سے پہلے وِتر پڑھنا، ہر مہینے کے تین روزے رکھنا، اور چاشت کی نماز کی دو رکعتیں پڑھنا، خاص طور پر ہر اس شخص کو جسے یہ ڈر ہو کہ طلوع فجر سے پہلے نہ جاگ سکے گا، اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ وِتر پڑھ کے سوئے"۔(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ وِتر پڑھنے کی تین صورتیں ہیں اگر چاہو تو رات کے پہلے حصے میں پڑھ لو، اگر چاہو تو دو رکعت پڑھ لو، اور رات کے آخری حصے میں

اس کو وِتر بنالو۔اگر چاہوتو رات کے آخری حصے تک موخر کروتا کہ وِتر تمہاری آخری نماز ہو۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا ''جس آدمی کو یہ ڈر ہو کہ وہ رات کے آخری حصے میں نہ جاگ سکے گا،اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ وِتر پڑھ کے سوئے۔اور جو آخری حصے میں جاگنے کی امید رکھتا ہو وہ وِتر کو موخر کردے کیونکہ رات کے آخری حصے میں قیام کے وقت فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور یہ افضل ہے"۔(صحیح مسلم،جامع ترمذی)

ایک روایت ہے کہ "نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) فجر کی اذان کے وقت وِتر ادا فرماتے اور فجر کی نماز کی اقامت کے قریب فجر کی سنتیں ادا فرماتے"۔(مسند احمد)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) کو بڑھاپا آنے تک رات کی نماز میں کچھ بھی بیٹھ کر پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا (آخری عمر میں جب) آپ (خاتم النبیین ﷺ) بیٹھ کر نماز پڑھتے تو تیس یا چالیس آیات رہ جاتیں تو آپ کھڑے ہوجاتے قرأت کرتے اور رکوع کرتے۔(سنن ابی داؤد)

رسول پاک (خاتم النبیین ﷺ) نے حضرت جبرائیلؑ سے سوال کیا" رات میں دعا کس وقت سنی جاتی ہے؟ حضرت جبرائیلؑ نے جواب دیا سحر کے وقت عرش میں لرزہ آتا ہے (سحری کا وقت فجر کی اذان سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے) یہی وجہ ہے کہ صحابہ اکرامؓ رات کے آخری حصے میں نماز کو مستحب سمجھتے تھے۔

نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا ''نماز شب کو لازم کرلو، یہ تم سے پہلے گزرنے والے صالحین کا طریقہ تھا، قیام شب قرب الٰہی کا ذریعہ، گناہوں کو ساقط کرنے (ختم کرنے ، روکنے) اور جسم سے بیماری کو دور کرنے کا واسطہ ہے''۔

شیخ ابونصرؒ نے اپنے والد سے چند سندوں سے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا کہ ''رات میں ایک ایسی ساعت ہے کہ ٹھیک اس ساعت میں اگر بندہ اللہ سے کچھ مانگتا ہے تو اللہ بزرگ و برتر اسے ضرور عطا فرمادیتا ہے اور یہ ساعت ہر رات میں موجود ہے''۔(مسلم)

علماء نے فرمایا" جس طرح رمضان المبارک میں شب قدر ہے اور جمعہ میں قبولیت کی ایک ساعت ہے، اسی طرح ہر رات میں قبولیت کی ایک ساعت ہے شاید یہ وہی ساعت ہے جس کے لئے حضرت عمرو بن عقبہؓ سے روایت حدیث میں ہے " آخری شب کی نماز کا اہتمام کیا کرو، یہ نماز شہودہ ہے یعنی شاہد (گواہی دینے والی) رات اور دن کے ملائکہ اس وقت حاضر اور موجود ہوتے ہیں"۔

نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) نے ارشاد فرمایا ''قیامت کے دن (جب لوگ اکٹھے ہوں گے) جب اللہ تعالیٰ پہلوں اور پچھلوں کو جمع فرمائے گا اور ایک منادی پکارے گا" وہ لوگ کھڑے ہوجائیں جن کے پہلو رات کے وقت بستروں سے الگ ہوتے تھے اور وہ اپنے رب کو خوف اور امید سے پکارتے تھے"۔ چنانچہ وہ کھڑے ہوں گے اور ان کی تعداد تھوڑی ہوگی۔ پھر دوبارہ اعلان ہوگا" وہ لوگ کھڑے ہوں جن کو ان کی تجارت اور خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کے ذکر سے باز نہیں رکھتی تھی"، چند لوگ کھڑے ہوں گے۔اس کے بعد پھر دوبارہ اعلان ہوگا" وہ لوگ کھڑے ہوں جو خوشی اور تکلیف کی حالت میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرتے تھے"، چنانچہ تھوڑے لوگ اور کھڑے ہو جائیں گے۔اس کے بعد باقی تمام لوگوں کا حساب کتاب شروع کیا جائے گا''۔

نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا" سردیوں کا موسم مومن کی بہار کا موسم ہے اس کے چھوٹے دنوں میں روزے رکھے اور اسکی طویل راتوں میں قیام کرے"۔(مسند احمد، مسند ابویعلی، شعب الایمان)

حضرت عبداللہ ابن ابی اوفیؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا کہ ''جس شخص نے مغرب کی نماز کے بعد الم سجدہ اور سورہ ملک پڑھی تو اس نے اس شب کا حق ادا کردیا۔قیامت کے دن اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح منور ہوگا''۔(جامع ترمذی، مسند احمد)

شیخ ابونصرؒ نے اپنے والد سے بالا اسناد حضرت جابر بن عبداللہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول پاک (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا ''اگر آدمی دو رکعتیں رات کے درمیانی حصے میں پڑھ لے تو وہ دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے اگر میں اپنی اُمت پر اس کو بار نہ سمجھتا تو ان دو رکعتوں کو فرض قرار دیتا"۔(مشکوۃ المصابیح)

حضرت ابومسلمؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے پوچھا" رات کی کونسی نماز بہتر ہے"؟ انہوں نے فرمایا" میں نے نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) سے پوچھا تھا آپ (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا'' آدھی رات کی نماز۔اور ایسا کرنے والے لوگ بہت کم ہیں''۔(صحیح مسلم)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اور شب بیداری:۔ 1-حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں" درمیان شب میں پابندی کے ساتھ قیام کرنے والا اور راہِ الٰہی میں مال خرچ کرنے والے سے بڑھ کر کوئی بندہ کوئی عمل کرنے والا نہیں، اس عمل سے بڑھ کر بندے کا کوئی عمل آنکھوں کی ٹھنڈک، پیٹھ کو ہلکا رکھنے والا اور دل کو خوش کرنے والا نہیں"۔

2- حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں "اے لوگو میں تمہارا خیر خواہ اور تمہارا شفیق ہوں۔ درمیان شب میں پابندی کے ساتھ قیام کیا کرو۔ قبر کی وحشت کو دور کرنے کے لئے، قیامت کی گرمی کو دور کرنے کے لئے روزہ رکھو، سخت دن کی سختی دور کرنے کے لئے صدقہ دیا کرو، اے لوگو میں تمہارا خیر خواہ ہوں"

3- حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ''جب رات کا تہائی حصہ باقی رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ (اپنی شان کے مطابق) آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور اعلان کرتا ہے کون ہے جو مجھے پکارے؟ کہ میں اس کی دعا قبول کروں، کون ہے جو مجھ سے بخشش مانگے میں اسے بخش دوں، کون ہے جو مجھ سے رزق مانگے میں اس کو رزق عطا کروں، کون ہے جو تکلیف کا ازالہ چاہے میں اس کی تکلیف دور کروں، صبح تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے''۔ (صحیح مسلم، صحیح بخاری)

4- حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول پاک (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کسی نے سوال کیا" رات کے کس حصے میں دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں"-فرمایا ''آخری رات میں اور فرض نمازوں کے بعد''۔ (مسند احمد)

5- حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا" میں رات کے تین حصے کرتا ہوں پہلی تہائی میں سوتا ہوں، دوسری تہائی میں نماز پڑھتا ہوں اور تیسری تہائی میں رسول پاک (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث (فرمودات نبوی (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)) یاد کرتا ہوں''۔

6- حضرت ابن مسعودؓ کا ارشاد ہے "رات کی نماز کو دن کی نماز پر ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسے پوشیدہ طور پر خیرات دینے کو ظاہری طور پر خیرات دینے کو"۔

7- حضرت عمرو ابن العاصؓ کا ارشاد ہے "رات کی ایک رکعت نماز دن کی دس رکعت نمازوں سے افضل ہے"۔

8- حضرت مسروقؒ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "حضور نبی (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہر عمل پر مداومت (ہمیشگی) بہت پسند تھی، میں نے دریافت کیا کہ "حضور پاک (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رات کے کس حصے میں اٹھتے تھے"؟ فرمایا" جب صبح کو مرغے کی بانگ سن لیتے تھے"۔ (صحیح بخاری)

9- حضرت ابوسلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا" اللہ تعالیٰ نبی کا خوش الحانی سے قرآن پاک پڑھنا جس طرح سنتا ہے اس طرح کسی اور چیز کو نہیں سنتا"۔ (صحیح بخاری)

10- حضرت عمرؓ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ''رسول پاک (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رات کی نماز میں ایک شخص کی قرات سماعت فرمائی، تو ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ اس پر رحمت فرمائے، اس نے مجھے فلاں فلاں آیت یاد دلا دی جو میں نے فلاں سورت سے حذف کر دی تھی''۔ (سنن ابی داؤد)

شب بیداروں کے دلوں پر اللہ کی نظر:-1- بعض اہل عرفان کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ سحر کے وقت شب بیداروں کے دلوں پر نظر فرماتا ہے اور ان کو نور سے بھر دیتا ہے۔ جس کے باعث ان کے دلوں پر روحانی فوائد کا نزول ہوتا ہے اور وہ منور ہو جاتے ہیں، پھر یہ روشنی ان منور دلوں سے غافلوں کے دلوں تک پہنچتی ہے۔

2- ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض صدیقین کو الہام کے ذریعے خبر دی کہ میرے کچھ بندے ایسے ہیں جو مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ وہ میرے مشتاق ہیں اور میں ان کا مشتاق ہوں۔ وہ مجھے یاد کرتے ہیں اور میں ان کو یاد کرتا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھتے ہیں اور میں ان کی طرف دیکھتا ہوں۔ اگر تم بھی وہی طریقہ اختیار کر لو تو میں تمہیں بھی محبوب رکھوں گا۔ اگر ان کے طریقے سے منہ موڑ و گے تو میں بھی تمہاری طرف توجہ نہ کروں گا۔ ایک نیک بندے نے عرض کیا اے رب ان کی علامات کیا ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ دن کے سایوں (اوقات نماز) کی اس طرح حفاظت کرتے ہیں جس طرح شفیق چرواہا اپنی بکریوں کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ غروب آفتاب کا اس قدر شوق رکھتے ہیں جس طرح پرندے غروب آفتاب کے وقت اپنے گھونسلوں میں جانے کے لئے بیتاب ہوتے ہیں۔ جب رات ہو جاتی ہے اندھیرا چھا جاتا ہے، بستر لگا دیئے جاتے ہیں اور ہر محب اپنے محبوب کے پاس تنہائی میں چلا جاتا ہے، تو اس وقت وہ میرے لیے قیام کرتے ہیں۔ اور میرے کلام (قرآن پاک) کے ساتھ مجھ سے ہم کلام ہوتے ہیں، اور میرے انعامات کا ذکر کر کے مجھ سے عاجزی کا اظہار کرتے ہیں، کچھ روتے ہیں کچھ زاری کرتے ہیں، کچھ آہیں بھرتے ہیں کچھ قیام کرتے ہیں، کچھ رکوع کرتے ہیں کچھ قعدہ کرتے ہیں، اور کچھ سجود میں ہوتے ہیں۔

1- سب سے پہلا انعام جو میں انہیں عطا کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اپنے نور سے ان کے دلوں کو بھر دیتا ہوں۔ پھر وہ میرے بارے میں لوگوں کو بتاتے ہیں جیسے میں ان کو خبر دیتا ہوں۔

2- دوسرا انعام یہ ہے کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمین اور جو کچھ ان میں ہے اس کو ترازو میں رکھ دیا جائے تب بھی میں انکے لئے اس کو قلیل سمجھتا ہوں۔

3- تیسرا انعام یہ ہے کہ میں خود اپنی کریم ذات کے ساتھ ان کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، سوچو کہ جس کی طرف میں توجہ کروں (رحمت کی) تو کون جانتا ہے کہ اس کو کیا کچھ دینا چاہتا ہوں؟؟۔

شب بیداری کے لئے ضروری چیزیں:- شب بیداری کے لئے جو چیزیں معاون ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں رزق حلال، توبہ پر استقامت، عذابِ الٰہی کا خوف، گناہوں سے گریز، موت کی یاد، دنیاوی فکر سے آزادی، (زیادہ توجہ نہ کرنا) موت کے لئے تیاری کی فکر، اہل دنیا کی محبت سے دل کا خالی ہونا، اللہ تعالیٰ کے ثواب کے وعدوں کے حصول کا شوق، مشتبہ چیزوں سے پرہیز اور آخرت کی فکر۔

قیامِ شب کی قضاء:- اگر نیند یا کسی اور وجہ سے رات کا قیام ترک ہو جائے (نماز ادا نہ کی ہو) تو طلوع آفتاب سے زوال آفتاب کے درمیان اس کی قضاء کرنا ایسا ہی ہے جیسے رات کے وقت اس کو وقت پر پڑھنا (یعنی چاشت کے وقت)

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ’’جو شخص اپنا رات کا وظیفہ ادا کئے بغیر سوتا رہا، اور نیند سے اُٹھ نہ سکا (ادا کرنا رہ گیا) تو اسے چاہئے کہ نماز فجر اور ظہر کے درمیان اس کو ادا کرے تو گویا اس نے اس کو رات ہی میں پڑھ لیا تھا"۔ (جامع ترمذی، سنن نسائی)

زیارت رسول (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لئے خاص تحفہ اور عمل:- حضرت عبدالرحمٰن بن حبیب بصریؒ نے حضرت سعید بن سعدؓ سے انہوں نے ابوطیبہ کرز بنؒ پرہ حارثیؒ جو کے ابدال میں سے تھے روایت کی ہے کہ ملک شام سے میرا بھائی میرے پاس ایک تحفہ لایا، اور مجھ سے کہا کہ اس کو قبول فرمائیے کیونکہ یہ ایک بہت عمدہ تحفہ ہے۔ کرزؒ نے ان سے دریافت کیا کہ یہ تحفہ کہاں سے لائے ہو؟ انہوں نے کہا کہ مجھے یہ تحفہ ابراہیم تیمیؒ نے دیا ہے، کرزؒ نے اپنے بھائی سے دریافت کیا کہ کیا تم نے ابراہیم تیمیؒ سے دریافت کیا تھا کہ ان کو یہ تحفہ کہاں سے ملا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں میں نے دریافت کیا تھا کہ یہ تحفہ آپ کو کہاں سے ملا ہے؟ تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میں خانہ کعبہ کے سامنے بیٹھا تسبیح و تحمید و تحلیل میں مصروف تھا کہ ایک صاحب تشریف لائے اور سلام کر کے میرے دائیں طرف بیٹھ گئے، وہ بہت زیادہ خوبرو تھے عمدہ صاف اور معطر لباس پہنا ہوا تھا۔ میں نے ان سے دریافت کیا اللہ کے بندے تم کون ہو؟ انہوں نے جواب دیا میں خضرؑ ہوں اور تمہیں سلام کرنے آیا ہوں۔ چونکہ تم اللہ کے محبوب ہو اس لئے تم کو ایک تحفہ پیش کرتا ہوں، میں نے دریافت کیا کہ وہ کونسا تحفہ ہے؟ میرے پوچھنے پر حضرت خضرؑ نے بتایا کہ تم سورج نکلنے اور دھوپ پھیلنے سے پہلے اور اسی طرح غروب آفتاب سے پہلے (یعنی فجر کی نماز کے بعد اور مغرب کی نماز سے پہلے) سات مرتبہ تیسرا کلمہ، سات مرتبہ درود شریف، ، سات مرتبہ سورہ فاتحہ، ، سات مرتبہ آیت الکرسی، ، سات مرتبہ سورہ اخلاص، ، سات مرتبہ سورہ فلق اور سورہ الناس سات مرتبہ اپنے اور اپنے والدین اور جملہ مومنین اور مومنات کی طرف سے سات مرتبہ استغفار پڑھو پھر یہ دعا کرو، اَللّٰھُمَّ یَا رَبِّ افْعَلْ بِیْ وَبِھِمْ عَاجِلاً وَّ اٰجِلاً فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ مَا اَنْتَ لَہٗ اَھْلٌ وَ لَا تَفْعَلْ بِنَا یَا مَوْلَانَا مَا نَحْنُ لَہٗ اَھْلٌ اِنَّکَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ جَوَادٌ کَرِیْمٌ رَؤُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝ ترجمہ: اے میرے رب میرے ساتھ اور جلدی بلا تاخیر دنیا اور آخرت میں وہی کر جو تیری شایانِ شان ہے، اور ہمارے ساتھ وہ نہ کر جس کے ہم لائق نہیں ہیں بے شک تو ہی بخشنے والا بردبار، سخی، کریم اور رحم کرنے والا ہے۔

یہ ورد صبح شام برابر کرتے رہا کرو، اس کو کبھی ترک نہ کرنا چونکہ جس نے مجھے یہ تحفہ دیا ہے اس نے مجھ سے کہا تھا خواہ عمر بھر میں صرف ایک ہی بار پڑھنا لیکن اس کو ضرور پڑھنا۔ میں نے حضرت خضرؑ سے دریافت کیا کہ آپ کو یہ تحفہ کس نے دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا مجھے یہ تحفہ سیدنا دو عالم (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عطا فرمایا۔ پھر میں نے عرض کیا مجھے بھی ایسی چیز عطا فرما دیجئے کہ اگر میں اسے پڑھوں تو رسول پاک (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دیدار سے خواب میں مشرف ہو جاؤں اور میں خود حضور پاک (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دریافت کرلوں کہ وہ تحفہ کیا ہے جو آپ (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت خضرؑ کو دیا تھا؟ حضرت خضرؑ نے کہا کیا تم مجھ کو جھوٹا سمجھتے ہو اور مجھ پر جھوٹ کی تہمت رکھتے ہو؟ میں نے کہا ’’نہیں اللہ کی قسم ایسا نہیں ہے میں تو بس رسول پاک (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زبان مبارک سے سننا چاہتا ہوں ‘‘۔ حضرت خضرؑ نے کہا کہ اگر تم خواب میں رسول پاک (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دیدار اور ان کی زیارت کے خواہاں ہو تو اچھی طرح سمجھ لو اور یاد کر لو کہ مغرب کی نماز کے بعد عشاء تک بغیر کسی سے بات کئے کھڑے ہو کر نفل پڑھو، اور حضور قلب اور پوری توجہ سے یہ نماز پڑھو۔ دو رکعت اور ہر رکعت میں سورہ فاتحہ ایک بار، سورہ اخلاص سات بار پڑھ کر سلام پھیر لو، پھر نماز کے بعد سجدہ کرو، سجدے میں سات مرتبہ استغفار، سات مرتبہ تیسرا کلمہ، پھر سجدے سے سر اٹھا کر اچھی طرح بیٹھ کر دونوں ہاتھ اٹھا کر،

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ یَا ذُوْ الْجَلَالِ وَ الْاِکْرَامِ یَا اِلٰہَ الْاَوَّلِیْنَ وَ الْاٰخِرِیْنَ یَا رَحْمٰنَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ وَ رَحِیْمَھُمَا یَا رَبِّ یَا رَبِّ یَا رَبِّ یَا اللّٰہُ یَا اللّٰہُ یَا اللّٰہُ

پھر کھڑے ہو جاؤ اور قیام میں پہلے والی سورتیں پڑھ کر اگلی دو رکعتیں مکمل کرو، اس طرح تمام نماز پڑھو۔ اور پھر جس جگہ چاہو قبلہ رُخ ہو کر درود پاک پڑھتے ہوئے سو جاؤ۔ یہاں تک کہ تم نیند سے مغلوب ہو جاؤ۔ میں نے کہا کہ میری خواہش تو یہ ہے کہ جس ہستی سے آپ نے یہ دعا سنی ہے وہی مجھے بھی اس کی تعلیم دیں، حضرت خضرؑ نے کہا کیا تم مجھ کو جھوٹا سمجھتے ہو اور مجھ پر جھوٹ کی تہمت رکھتے ہو؟ میں نے کہا نہیں اللہ کی قسم جس نے محمد (خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو نبی بنا کر بھیجا ہے۔ میں آپؑ پر

جھوٹ کی تہمت نہیں لگا رہا۔ پھر میں نے حضرت خضرؑ سے کہا کہ آپؑ مجھے اس نماز کا ثواب بتایئے ؟ حضرت خضرؑ نے کہا کہ ''اب تم خود ہی سرکار دو عالم (خاتم النبیین ﷺ) سے دریافت کر لینا''۔

حضرت ابراہیم تیمیؒ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت خضرؑ کے ارشاد کے مطابق نماز پڑھی، دعائیں پڑھیں اور بستر پر لیٹ کر درود شریف پڑھتا رہا۔ حضرت خضرؑ کی ملاقات اور حضور پاک (خاتم النبیین ﷺ) کے دیدار کی آرزو سے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میری نیند اُڑ گئی، جاگتے جاگتے صبح ہو گئی میں نے فجر کی نماز پڑھی اور اپنے محراب میں بیٹھا رہا یہاں تک کہ دن چڑھ آیا، پھر میں نے اشراق کی نماز پڑھی۔ لیکن میں اپنے دل سے ہمکلام تھا کہ اگر آج رات تک زندگی برقرار رہی تو سابقہ شب کی طرح ان دعاؤں کو ضرور پڑھوں گا یہ خیال کرتے کرتے میں سو گیا۔ نیند میں کچھ فرشتے آئے اور مجھے سوار کر کے اپنے ہمراہ لے گئے اور مجھے جا کر جنت میں داخل کر دیا۔ میں نے وہاں جا کر کچھ محل دیکھے، ان میں سے بعض یاقوت سرخ اور بعض سبز زمرد کے تھے، اور بعض سفید موتیوں کے تھے۔ شہد، دودھ اور شراب کی نہریں دکھائیں دیں۔ ایک محل میں ایک حسین عورت پر نظر پڑی جو مجھے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے نور سے سورج کی روشنی مانند پڑ رہی تھی۔ میں نے فرشتوں سے پوچھا کہ یہ محل کس کا ہے؟ اور یہ عورت کون ہے؟ انہوں نے کہا تیرے عمل کی طرح جو بھی یہ عمل کرے یہ اس کے لئے ہے۔ پھر فرشتوں نے مجھے جنت کے پھل کھلائے اور وہاں کا شربت پلایا، اس کے بعد فرشتوں نے مجھے اس جگہ پر پہنچا دیا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا اتنے میں میں نے دیکھا کہ نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) ستر انبیاء کرام علیہ السلام کے ساتھ فرشتوں کی ستر قطاروں کے ساتھ تشریف لائے ہیں، نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) تشریف لائے، اسلام وعلیکم سے نوازا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (خاتم النبیین ﷺ) حضرت خضرؑ نے مجھے یہ فرمایا ہے۔ آپ (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا ''خضر نے جو کچھ کہا سچ کہا اور وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں حق ہوتا ہے۔ وہ اہل زمین میں سب سے بڑے عالم ہیں، وہ رئیس الابدال ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لشکریوں میں سے ہیں''۔ میں نے کہا یا رسول اللہ (خاتم النبیین ﷺ) جو ایسا عمل کرے گا اس کا کیا ثواب ہوگا ؟ انہوں نے فرمایا کہ ''جو کچھ تو نے دیکھا اور جو کچھ تجھے دیا گیا اس سے بڑھ کر اور کیا ثواب ہوگا''؟۔ تو نے جنت میں اپنی جگہ دیکھی جنت کے پھل کھائے، جنت کا شربت پیا، انبیاء کرامؑ کو دیکھا، حوریں دیکھ لیں، (اس سے بڑھ کر اور کیا ثواب ہوگا) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (خاتم النبیین ﷺ) اگر کوئی شخص میرے اس عمل کی طرح عمل کرے اور جو کچھ میں نے مشاہدہ کیا ہے اس میں سے کچھ نہ دیکھ پائے، تو ان چیزوں کے بدلے میں اسے کچھ ثواب ملے گا؟ حضور پاک (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا اس ذات کی قسم جس نے مجھے نبی بنا کر بھیجا ہے، ایسے شخص کے تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس پر غضب نہیں فرمائے گا اور نہ اس سے ناخوش ہوگا۔ اور اگر وہ جنت کو خواب میں نہیں بھی دیکھے گا، تب بھی اس کو وہی کچھ ملے گا جو کچھ تجھ کو دیا گیا ہے۔ اور ایک منادی آسمان سے اعلان کرتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے اس عامل کو اور مشرق سے لے کر مغرب تک کے تمام مومن مردوں اور عورتوں کے گناہوں کو بخش دیا ہے۔ بائیں طرف والے فرشتے کو کہا جاتا ہے کہ آئندہ سال تک اس بندے کے گناہ نہ لکھنا۔ یہ سُن کر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (خاتم النبیین ﷺ) میرے ماں باپ آپ (خاتم النبیین ﷺ) پر قربان، قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے آپ (خاتم النبیین ﷺ) کے جمال سے مشرف وسرفراز فرمایا، کیا اس شخص کے لئے بھی اس قدر ثواب ہے ؟ آپ (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا ہاں یہ سب انعام اس کو بھی دیا جائے گا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ (خاتم النبیین ﷺ) تب تو تمام مومن مردوں اور عورتوں کے لئے یہ ضروری ہے اس عمل میں تو بڑی فضیلت اور ثواب ہے۔ یہ سن کر نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا ''قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے نبی برحق بنا کر بھیجا ہے، اس عمل کو وہی شخص کرے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے سعید پیدا کیا، اور اس کو وہی ترک کرے گا جو پیدائشی طور پر بدبخت ہوگا''۔

میں نے عرض کیا کہ کیا ایسا کرنے والے کو کچھ اور بھی ملے گا؟ حضور پاک (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا ''قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے نبی برحق بنا کر بھیجا ہے جو شخص یہ عمل ایک رات بھی کرے گا، تو اس کے لئے کائنات کی پیدائش سے لے کر صور پھونکے جانے تک آسمان سے برسنے والے ہر قطرے کے برابر نیکیاں لکھ دی جائیں گی، اور زمین سے پیدا ہونے والے دانوں کے برابر اس کی برائیاں اور بدیاں دور کر دی جائیں گی خواہ وہ مرد ہو یا عورت''۔

دیدار رسول (خاتم النبیین ﷺ) کے لئے ایک اور عمل:- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم (خاتم النبیین ﷺ) نے فرمایا ''جو شخص شب جمعہ میں دو رکعت نماز اس طرح پڑھے کہ ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد آیت الکرسی ایک بار اور سورہ اخلاص پندرہ بار پڑھے، پھر نماز سے فارغ ہو کر ایک ہزار بار یہ درود شریف پڑھے (اللھم صَلِ علیٰ محمد النبی الامی) تو وہ میرا دیدار خواب میں ضرور کرے گا اور جس نے مجھے دیکھا اس کے لئے جنت ہے''۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تواضع

تواضع کا مفہوم اور معنی:- تواضع کے لغوی معنی، عاجزی وانکساری کے ہیں۔

انسان کا اپنے جاہ، منصب اور بزرگی کے تقاضوں کو نظرانداز کرنا اور اپنے مصاحبین میں خود کو ہیچ سمجھنا تواضع کہلاتا ہے۔

تواضع کے پیکر رسول کریم خاتم النبیین ﷺ:- حضور خاتم النبیین ﷺ دین ودنیا کے بادشاہ ہونے کے باوجود بے حد متواضع اور سادہ مزاج تھے۔ مجلس میں کبھی پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے، چھوٹا ہو یا بڑا اسے سلام کرنے میں سبقت کرتے تھے، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور غریب سے غریب آدمی کی عیادت کو تشریف لے جاتے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے ساتھ گھل مل کر بیٹھ جاتے، کسی امتیازی نشست یا نشانی کی ضرورت نہ ہوتی۔ بازار سے خود سودا خرید کر لاتے، اپنے جانوروں کو خود چارہ ڈالتے ان کے بدن پر تیل ملتے اور گھر کے دوسرے کام بھی ہاتھ سے کرنے میں خوشی محسوس فرماتے۔

1- حدیث: ایک شخص حضور خاتم النبیین ﷺ سے ملاقات کرنے کے لیے آیا لیکن آپ خاتم النبیین ﷺ کو دیکھ کر رعب نبوت سے کانپنے لگا۔ حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''گھبراؤ نہیں میں بادشاہ نہیں ہوں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی''۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3312)

2- حدیث: ترجمہ: حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی نازل فرمائی'' تم تواضع کرو اور کوئی شخص ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے''۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4214)

3- حدیث: ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے اللہ کے لئے تواضع اختیار کی اللہ اسے بلند کر دے گا''۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 9251- السلسلۃ الصحیحۃ، حدیث نمبر 178)

جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ　ترجمہ: ''محبوب فرما دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو''۔ تو اس وقت حضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا ''یہ اتباع نیکی، تقویٰ، خوف اور تواضع کے ساتھ ہو''۔ (سورۃ آل عمران، آیت نمبر 31)

حضرت شعیبؒ فرمایا کرتے تھے'' تواضع کی بنیاد یہ ہے کہ جس سے ملو اسے پہلے سلام کرو اور جو تمہیں سلام کرے اس کا جواب دو۔ محفل میں کم درجہ کی نشست پسند کرو اور یہ نہ چاہو کہ کوئی تمہاری تعریف، توصیف کرے یا تم پر احسان کرے"۔ مزید فرمایا "وہ شخص کتنا اچھا ہے جو اپنی کوتاہی یا برائی کے بغیر تواضع اختیار کئے اور محتاجی کے بغیر اپنے آپ کو عاجز سمجھے''۔

حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ سے تواضع کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا '' تم حق کے سامنے سر تسلیم خم کرو اور جو حق بات سنو تو اسے قبول کرو جس نے اپنی قدر و قیمت کو محسوس کیا تو اس کا تواضع سے کوئی تعلق نہیں''۔

شیخ ابو حفصؒ کا قول ہے، '' جو یہ چاہتا ہو کہ اس کا دل تواضع کرے وہ نیک بندوں کی صحبت اختیار کرے اور ان کی عزت کرے۔ اس طرح ان کی بے حد تواضع کی وجہ سے وہ ان کی اتباع کرے اور تکبر نہ کرے''۔

حضرت لقمانؒ کا قول ہے'' ہر چیز کی سواری ہوتی ہے اور عمل کی سواری تواضع ہے''۔

شیخ نوریؒ فرماتے ہیں " دنیا میں معزز ترین انسان پانچ قسم کے ہیں۔ (1) زاہد عالم (2) فقیر صوفی (3) متواضع دولت مند (4) شکر گزار درویش (5) روشن ضمیر شریف

شیخ جلاءؒ فرماتے ہیں'' اگر تواضع کی قدر نہ ہوتی تو ہم اکڑ کر چلتے''۔

شیخ یوسف بن اسباطؒ سے پوچھا گیا" تواضع کی حد کیا ہے "؟ فرمایا '' جب اپنے گھر سے نکلو اور کسی سے ملاقات کرو تو اسے اپنے سے بہتر سمجھو''

حضرت شیخ جریریؒ فرماتے ہیں'' اہل معرفت کا یہ صحیح خیال ہے کہ دین اسلام کا سرمایہ پانچ ظاہری اصول اور پانچ باطنی اصول ہیں ظاہری اصول یہ ہیں۔

(1) سچ بولنا (2) سخاوت (3) جسمانی طور پر تواضع کرنا (4) دوسروں کو تکلیف اور اذیت سے بچانا (5) کسی انکار کے بغیر خود تکالیف برداشت کرنا اور باطنی اصول یہ ہیں: (1) اپنے آقا کے وجود سے محبت کرنا (2) آقا سے جدائی کا خوف (3) اپنے آقا کے وصال کی توقع (4) اپنے فعل پر ندامت (5) اپنے پروردگار سے حیا کرنا۔

حضرت یحیٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں'' تواضع ہر ایک کے لیے اچھی ہے مگر دولت مندوں کے لیے زیادہ اچھی ہے۔تکبر ہر ایک کے لیے برا ہے مگر درویش کے لیے تکبر کرنا بدترین ہے''

حضرت ذوالنونؒ فرماتے ہیں'' تواضع کی تین نشانیاں ہیں:

1۔عیب کو معلوم کرنے کے لیے نفس کو کم تر سمجھنا　　2۔توحید کی حرمت کے لیے لوگوں کی تعظیم کرنا۔　　3۔حق بات اور نصیحت کو ہر ایک سے قبول کرنا"

شیخ ابو یزیدؒ سے پوچھا گیا" آدمی متواضع کب ہوتا ہے"؟ فرمایا'' جب اپنے نفس کا کوئی حق نہ سمجھے کیونکہ وہ اس کی شرارت اور عیب سے واقف ہے۔اور یہ نہ خیال کرے کہ مخلوق میں اس سے بدتر کوئی ہے''-----کسی دانشمند سے پوچھا گیا" تم کسی ایسی نعمت سے واقف ہو جس پر حسد نہ کیا جائے اور ایسی مصیبت سے واقف ہو جس پر رحم نہ کیا جائے''؟ اس نے کہا" ہاں وہ نعمت تواضع ہے اور وہ مصیبت تکبر ہے"۔

حضرت ترمذی رحمتہ اللہ علیہ کا قول ہے کہ'' تواضع کی دو قسمیں ہیں۔

1۔انسان اللہ کے احکام و نواہی میں تواضع کرے کیونکہ نفس آرام طلبی کی وجہ سے اس کے حکم سے غافل ہوتا ہے اور ممنوعہ شے کی خواہش کرتا ہے۔لہٰذا اگر وہ اس کے حکم و ممانعت کے مطابق عمل کرتا ہے تو یہ بھی تواضع ہے۔

2۔اپنے نفس کو اللہ کی عظمت کے تابع کردے چنانچہ اگر اس کا نفس کسی جائز چیز کی خواہش کرے تو وہ اسے روک دے یعنی وہ اپنے ارادے کو مشیت ایزدی کے تابع کردے''۔

متواضع اللہ کے ہاں مقبول ہیں:- اس لئے وہی انسان اللہ کے نزیک بہتر ہوگا جس میں عاجزی، انکساری، نیازمندی اور تواضع ہو۔ جو بڑا بنے گا اس کو نیچا کردیا جائے گا۔اللہ کو تکبر پسند نہیں۔جو خود کو بلند کرتا ہے اس کو پٹخ دیا جاتا ہے۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا:'' جس شخص نے اللہ کے لئے تواضع اختیار کی اللہ اسے بلند کردے گا''۔(مسند احمد، حدیث نمبر 9251-السلسلۃ الصحیحۃ، حدیث نمبر 178)

اگر کوئی بندہ عمل کر کے نماز پڑھ کے روزے رکھ کر شیخی بگھارے اور یوں کہے یا یوں سمجھے کہ میں تو نماز پڑھنے والا، روزہ رکھنے والا اور تہجد وغیرہ پڑھنے والا ہوں اور ان کو اپنے لئے بڑی چیزیں سمجھے تو اللہ کی طرف سے یہ جواب ہوتا ہے کہ نالائق تو نے کیا کیا ہے؟۔ یہ تو میرا فضل تھا کہ تجھے صحت دی، وقت پر اٹھایا، توفیق دی، ہدایت دی تو یہ تو میرا فضل تھا تو نے کیا کیا ہے؟ یہ اترانا کیسا؟

اور اگر کوئی یہ کہتا ہے" باری تعالیٰ میں تو کچھ بھی نہ کر سکا جو کچھ کیا تو نے کیا تیرے فضل نے کیا نہ میرے اندر طاقت اور نہ میں کچھ کرنے کے قابل ہوں"۔تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" تو نے ہی تو سب کچھ کیا۔اس لئے اس کے سوا کچھ نہیں کہ آدمی شکر کرتا رہے اور یہی کہتا رہے کہ یا اللہ میں عاجز ہوں میں تیرا شکر ادا نہیں کر سکتا"۔

ہم خود محدود ہیں، ہماری عقل و طاقت محدود ہے۔محدود ہو تو لامحدود افعال کیسے انجام دے؟ تو دینے والے نے نعمتیں لامحدود دی ہیں اور شکر محدود ہے تو لامحدود نعمتیں اور محدود شکر پورا نہیں ہوسکتا۔تو شکر ادا کرتے ہوئے اللہ سے اس بات کا اقرار کرنا کہ یا اللہ تیرا شکر ادا کرنے تیری ثناء کرنے کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتا کہ عطا زیادہ ہے اور توانائی محدود ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا'' اے اللہ میرا فرض ہے کہ میں تیرا شکر ادا کروں لیکن جب نعمتوں پر شکر ادا کرتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ اس شکر کی توفیق بھی تو تو نے ہی دی ہے۔پھر اس توفیق پر شکر ادا کرتا ہوں۔اس لئے میں تو یہ نہیں سمجھ سکتا کہ تیرا شکر کس طرح ادا کروں؟۔ کیونکہ ہر شکر کے بعد ایک اور شکر نکلتا ہے''۔حق تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا۔" اے داؤد اگر تو نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تو شکر ادا کرنے سے عاجز ہے تو شکر کی ادائیگی یہی ہے کہ اپنا عجز مان لو۔اپنی ناتوانی کو تسلیم کرلو۔کون ہے جو ہمارا شکر ادا کر سکے؟ اور ہماری اطاعت کا حق ادا کر سکے"۔ اس لئے بندے کا کام یہی ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد اس چیز کا اقرار کرے کہ باری تعالیٰ میں کچھ نہیں کر سکا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل دامن گیر نہ ہو تو ہماری نجات بھی نہیں ہوسکتی۔عمل بھی مقبول نہیں ہوسکتا۔ یہ ہماری نمازیں، وسوسے بھری ہوئی ہیں۔خیالات اِدھر اُدھر، نمازیں تو انبیاء کرامؑ، اولیاء کرام کی تھیں، تو بس یہ اللہ کا فضل ہی ہوگا کہ اللہ ان بے جان نمازوں کو قبول کرلے۔

حضرت جلال الدین سیوطیؒ نے ایک کتاب آخرت کے احوال پر لکھی ہے۔اس میں پچھلی امتوں میں سے بنی اسرائیل کا ایک بڑا عجیب واقعہ لکھا ہوا ہے۔بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا۔اللہ کی بہت زیادہ عبادت کرتا تھا۔گھر بار تھا، بیوی بچے تھے۔اس کو یہ گوارا نہ ہوا کہ میں بچوں اور گھر بار میں اتنا وقت ضائع کروں اس نے بیوی بچے، رشتہ دار وغیرہ سب چھوڑے اور ایک ٹیلہ جو سمندر کے بیچ میں تھا اس پر چلا گیا۔وہاں چوبیس گھنٹے عبادت میں مشغول رہتا۔یہ رہبانیت ہے۔اس زمانے میں رہبانیت جائز تھی۔اسلام

نے اس کو ختم کر دیا۔ وہاں اس نے ایک چھپر ڈال لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فضل کیا۔ اس کے قریب ہی ایک انار کا درخت اُگ آیا اور اس پر انار لگ گئے اور اس کڑوے پانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے اسی پہاڑ کے بیچ میں سے ایک میٹھے پانی کا چشمہ نکال دیا۔ اس عابد کا کام یہ تھا کہ ایک انار روز کھاتا اور ایک کٹورہ پانی کا پیتا اور پورے وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتا۔ پانچ سو برس اس نے اسی طرح عبادت کی پانچ سو برس کے بعد جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے کہا" باری تعالیٰ مجھے نماز عزیز ہے مجھے نماز کی حالت میں موت آئے "۔ تو سجدے کی حالت میں اس کی روح قبض کی گئی اور حضور پاک خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" آج تک اس کی لاش سجدے ہی کی حالت میں محفوظ ہے''۔

آپ خاتم النبیین ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب اس کی روح نکل گئی اور بارگاہ حق میں پیش ہوئی تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اے میرے بندے میں نے اپنے فضل وکرم سے تجھے بخش دیا اور تجھے جنت کا مقام رفیع عطا کیا ہے۔ اب تو ابد تک چین میں رہ اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو جنت میں لے جاؤ میرا مقبول بندہ ہے میں نے اس کو اپنے کرم وفضل سے نجات دے دی ہے"۔ اس عابد کے دل میں یہ بات (خیال میں) آئی کہ پانچ سو برس میں نے عبادت کی، بیوی بچے، رشتہ دار، عزیز واقارب، عیش وآرام سب ختم کیا اب بھی اللہ نے مجھے اپنے فضل وکرم سے بخشا ہے۔ میری تسلی کے لئے اگر اللہ تعالیٰ یہ کہہ دیتے کہ تو نے گھر بار چھوڑا، نمازیں پڑھیں، دنیا کا عیش ختم کر دیا اس عمل کے طفیل تجھے بخشا تو میرا دل خوش ہو جاتا۔ میں نے کس قدر محنت کی ساری دنیا کو میں نے ترک کیا اور اب بھی بخشا تو اپنے ہی فضل وکرم سے بخشا۔ گویا میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔ یہ وسوسہ ذراسی دیر میں اس کے دل میں گزر گیا۔ اللہ تعالیٰ تو دلوں کے کھٹک کو جانتے ہیں ''وَاللہُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الْصِدورِ۔'' اللہ سینوں کے خیالات کو جانتا ہے۔'' اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو فرمایا کہ اس بندے کو جنت کے بجائے جہنم کے راستے پر لے جاؤ۔ لیکن جہنم میں ڈالنا نہیں ہے جہنم سے پانچ سو میل کی مسافت پر لے جا کر اس کو کھڑا کر دو۔ اس کو وہاں پہنچایا گیا۔ وہاں جو جہنم کی لو اور لپٹ آئی سر سے پیر تک یہ عابد خشک ہو گیا۔ اس کو کانٹے چبھنے لگے اور پیاس پیاس چلانے لگا۔ جہنم کا ایک جھونکا لگا تو اس کی ساری روح خشک ہو گی۔ حدیث میں ہے "ایک ہاتھ غیب سے نمایاں ہوا جس میں ٹھنڈے پانی کا کٹورا تھا۔ یہ عابد دوڑتا ہوا گیا کہ اے اللہ کے بندے یہ پانی مجھے دے دے"۔ یہ آگے گیا ہاتھ پیچھے ہٹ گیا اور آگے گیا ہاتھ اور پیچھے ہٹتا گیا۔ اس نے التجا کی ''خدا کے لئے یہ پانی مجھے دے دو''۔ جواب ملا ''اس پانی کی قیمت ہے''۔ اس عابد نے فوراً پوچھا کہ ''اس کی کیا قیمت ہے؟'' جواب آیا" پانچ سو برس کی خالصتاً کی گئی عبادت"۔ اس نے کہا" میرے پاس پانچ سو برس کی عبادت ہے یہ لے لو"۔ اس کے ساتھ ہی اس ہاتھ سے کٹورا لیا اور جلدی جلدی پیا کچھ دم میں دم آیا۔ حق تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا" اس عابد کو لوٹا کر ادھر لے آؤ اور پھر ہمارے سامنے پیش کرو"۔ پھر پیشی ہوئی حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا ''اے بندے تیری پانچ سو برس کی عبادت سے تو ہم چھوٹ گئے۔ اس کی قیمت ایک کٹورا پانی تجھے مل گیا اور وہ قیمت کی ادائیگی تو نے خود تجویز کی"۔ تو نے خود کہا" میں اپنی پانچ سو برس کی عبادت دیتا ہوں۔ اب ان لاکھوں کٹوروں کا حساب دے جو دنیا میں تو نے پیئے۔ ان کے بدلے میں کیا کیا عمل لے کر آیا ہے؟ اور وہ جو تو نے دنیا میں لاتعداد اناروں کے دانے کھائے ہیں ایک ایک دانے کا حساب دے۔ ان کے بدلے میں کتنے سجدے کئے، کتنے رکوع کئے؟ کتنی عبادات کیں؟ اور اس کے بعد وہ جو تیری آنکھوں میں روشنی تھی جس سے تو صورتیں دیکھ پاتا تھا اس ایک ایک تارنگاہ کا حساب دے۔ اور جو تو سانس لیتا تھا جس کے ذریعے تیری زندگی قائم تھی اس سانس کا اس ہوا کا حساب دے کہ ان کے بدلے کتنی عبادات کیں ہیں اور وہ جو چشمہ اور انار کا درخت تیرے لئے رکھا تھا؟ اور جو ہماری دنیا کے ذرے ذرے سے تو نے فائدہ اٹھایا ہے اس کا حساب دے"۔ عابد بیچارا تھرا گیا۔ اس کی عقل ٹھکانے آ گئی۔ اس نے فوراً کہا ''اے اللہ بے شک نجات صرف اور صرف تیرے فضل ہی سے ہے۔ عمل کی قیمت تو ایک کٹورا پانی کا تھا۔ اور وہ بھی آپ نے اپنے فضل ہی سے دے دیا اگر آپ فرما دیتے کہ اس پانی کے کٹورے کی قیمت ایک لاکھ برس کی عبادت ہے تو میں اس سے بھی محروم رہ جاتا۔ یہ تیرا فضل تھا کہ تو نے اتنی قیمت رکھی جو میں ادا کر سکتا تھا۔ باری تعالیٰ نجات فضل ہی سے ہے عمل سے نہیں ہے''۔ اَب حکم ہوا" لے جاؤ میرے اِس بندے کو میرے فضل وکرم کے طفیل جنت میں "۔ تو متواضع اللہ کے ہاں مقبول ہوتے ہیں۔ اللہ کو عاجزی اور انکساری ہی پسند ہے۔

تواضع بزرگی کی سب سے بڑی علامت ہے:۔ بہر حال قلب وہ ہے جس کے اندر بزرگی ہو۔ لباس کیسا بھی ہو۔ بزرگی کی سب سے بڑی علامت یہی ہے کہ اپنے نفس کی حقارت دل میں جمی ہوئی ہو اور دوسرے کی بزرگی جمی ہوئی ہو۔ اگر ایک شخص دوسرے کی تحقیر کرتا ہے اور وہ مدعی ہے کہ میں بہت زیادہ بڑا ہوں یہ دعویٰ ہی علامت ہے کہ بزرگی نشان کو بھی اس میں موجود نہیں ہے۔ بزرگی میں نہ دعویٰ ہوتا ہے نہ شیخی ہوتی ہے۔ ترک دعویٰ اور ترک شیخی کا نام بزرگی ہے جب یہ حالت پیدا ہو، کہا جائے گا بزرگی ہے۔

تواضع آدمیت کی علامت ہے:۔ انسان کے اندر جب تک کہ تواضع، خدمت اور خدمت گزاری نہ ہو اس وقت تک صحیح معنوں میں آدمی کے اندر بندگی نہیں پیدا ہوتی

مخلوق کی تذلیل وتحقیر سے آدمی خود اپنی ذلت کے راستے ہموار کرتا ہے۔

بہر حال خدمت خلق کا جذبہ تب موجود ہوگا جب دل میں تواضع کا جذبہ موجود ہو۔ منکسر المزاج ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے آدم علیہ السلام کا بیٹا ہو تو ضرور تواضع کرے گا اور اگر اپنا نسب نامہ شیطان سے ملالے گا تو کبھی تواضع نہیں کرے گا۔ اس واسطے کہ دونوں سے لغزشیں ہوئیں۔ آدم علیہ السلام سے بھی ہوئی اور ابلیس سے بھی ہوئی۔ آدم علیہ السلام نیت کے پاک تھے مگر بھول کر ایک لغزش ہوگئی حکم دیا گیا تھا کہ پھل مت کھاؤ، بھول کر کھالیا حالانکہ وہ نافرمانی نہیں تھی، نافرمانی کہتے ہیں جان بوجھ کر حکم کی خلاف ورزی کرنا یہ نہیں ہوا تھا، جانتے تھے کہ اللہ نے روکا ہے، مگر مشکل کیا پیش آئی ؟ ایک تو کم بخت شیطان نے آ کے قسم کھائی: وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ ترجمہ: ''قسم کھا کے کہا کہ میں تمہارا خیر خواہوں''۔ (سورۃ الاعراف، آیت 21) آدمؑ کا سچا قلب آپ کسی فریب سے واقف نہیں، مقام جنت میں ہے، جو کریم مقام ہے یہ شبہ بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ اللہ کا نام لے کر کوئی جھوٹ بولے، جب دل میں ایمان ہوتا ہے تو حسن ظن دل میں ہوتا ہے، دوسرے کو بھی آدمی یہی سمجھتا ہے کہ یہ بھی اچھا ہے۔ یہ خدا کا نام لے کر قسم کھا رہا ہے، بھلا خدا کا نام لے کر جھوٹ بولنے کی جرات کیسے ہوسکتی ہے؟ آدمؑ نے نافرمانی کی حقیقت میں آدمؑ جلیل القدر پیغمبر بھی ہیں مگر ہیں تو اللہ کی بارگاہ کے بندے ہی اور مقرب بندے، مقربین سے اگر ذرا سی لغزش ہوتی ہے تو ان پر شدت تعلق کی بناء پر زیادہ سختی کی جاتی ہے، اگر کوئی دشمن آپ کو گالی دے، آپ برا نہیں مانیں گے کہ دشمن کا کام یہی ہے لیکن اگر آپ کا بیٹا ذرا ترچھی نگاہ سے بھی دیکھ لے فوراً مارنے کو تیار ہوجائیں گے کہ اپنا ہوکر یہ کام کرتا ہے۔ تو شدت تعلق کی بناء پر تھوڑی سی بات بھی بڑی محسوس ہوتی ہے۔ آدم علیہ السلام مقربان بارگاہ حق میں سے ہیں، پیغمبر ہیں انہوں نے لغزش کر کے درخت کا پھل کھالیا تو سختی سے خطاب کر کے فرمایا گیا کہ تم نافرمانی کر رہے ہو یعنی اتنے مقرب ہوکر کیوں تم سے لغزش سرزد ہوئی ؟ تمہارے حق میں یہ لغزش بھی عصیان کا نام پائے گی۔ مگر حقیقتاً وہ عصیان نہیں تھا، خطاء فکری اور خطاء اجتہادی تھی۔ تو ایک طرف ابلیس سے خطاء سرزد ہوئی فرمایا گیا تھا کہ تو آدم علیہ السلام کو سجدہ کر اس نے نہیں کیا اور آدم علیہ السلام سے بھی خطا ہوئی، مگر فرق کیا تھا ؟ آدم علیہ السلام نے خطا کے بعد کہا سورۃ الاعراف آیت 23 میں کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا ''اے اللہ ! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا'' وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ''اگر آپ میری مغفرت نہیں کریں گے اور مجھ پر رحم نہیں کریں گے تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوجاؤں گا۔ تو اعتراف خطا کیا تو خلافت کا تاج سر پر رکھ دیا گیا۔ ابدالآباد کیلئے مقبول بنائے گئے۔ ان کی اولاد میں لاکھوں کروڑوں بندگان مقبول الٰہی ہوئے اور ان سے جنت آباد ہوگی۔

شیطان نے گناہ کر کے یہ نہیں کہا کہ مجھ سے غلطی ہوئی بلکہ اللہ کے حکم میں اور نکتہ چینی کی۔ سورہ الاعراف، آیت نمبر 12 میں ارشاد خداوندی ہے:

ترجمہ: ''فرمایا کس چیز نے تجھے روکا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جب میں نے تجھے حکم دیا تھا؟ بولا میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے مٹی سے بنایا''۔

ابلیس نے نہ صرف نافرمانی کی بلکہ نافرمانی کی مزید مہلت مانگی۔

ترجمہ: ''فرمایا تو یہاں سے اُتر جا تجھے نہیں پہنچتا کہ یہاں رہ کر غرور کرے نکل تو ہے ذلت والوں میں۔ بولا مجھے مہلت دے اس دن تک کہ لوگ اٹھائے جائیں، فرمایا تجھے مہلت ہے۔ بولا تو قسم اس کی کہ تو نے مجھے گمراہ کیا میں ضرور تیرے سیدھے راستہ پر ان کی تاک میں بیٹھوں گا۔ پھر ضرور میں ان کے پاس آؤں گا ان کے آگے اور ان کے پیچھے اور ان کے داہنے اور ان کے بائیں سے اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ فرمایا یہاں سے نکل جا ردکیا گیا راندہ ہوا، ضرور جواُن میں سے تیرے کہے پر چلا میں تم سب سے جہنم بھر دوں گا''۔ (سورہ الاعراف، آیت نمبر 18-13)

گویا پورا مقابلہ ٹھانا تو ابدالآباد کیلئے ملعون بنا دیا گیا۔ تو آدم علیہ السلام نے غلطی کا اعتراف کیا، تواضع وانکساری سے پیش آئے تو خلافت مل گئی، شیطان کبر وریاء سے پیش آیا۔ ابدالآباد کیلئے ملعون بن گیا۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ بندہ حق تواضع کی حقیقت اسی وقت معلوم کرسکتا ہے جب مشاہدہ حق کے نور کا جلوہ اس کے دل میں نظر آئے۔ اس موقع پر اس کا نفس پگھل کر کبر وخود پسندی کی کھوٹ سے صاف ہوجاتا ہے اور نرم ہوکر حق تعالیٰ کی اطاعت اور مخلوق کی خدمت کرتا ہے کیونکہ اس وقت اس کے نفس کے آثار محو ہوجاتے ہیں اور اس کی شورش اور غبار ختم ہوجاتے ہیں۔ پس تواضع اختیار کرنے والے انسان میں چار خوبیوں کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

(1) اللہ سے قربت　(2) نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے نسبت　(3) اولیاءاللہ سے تربیت　(4) مخلوق کی خدمت۔

****

اخلاص

اخلاص بہت بڑی دولت ہے۔ کیونکہ جس نے اخلاص حاصل کر لیا۔ اس نے نفس پر قابو پا لیا اور جس نے نفس پر غلبہ پا لیا گویا اس نے اللہ کو راضی کر لیا تو جس سے اللہ راضی ہو گیا تو اس نے دنیا کی ہر چیز کو پا لیا۔ یعنی اخلاص اللہ کی قربت حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

قرآنی آیات:- 1- ترجمہ: ''اور انہیں یہی حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبادت کریں ایک طرف ہو کر اور اس کے دین میں اخلاص کریں اور نماز قائم رکھیں اور زکوٰۃ ادا کریں چونکہ یہی قائم رہنے والا دین ہے"۔ (سورہ البینۃ، آیت نمبر 5)

2- ترجمہ: ''البتہ جو لوگ توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں اور اللہ کی رسی کو تھام لیں اور اپنے دین کو خالص اللہ کے لیے کر لیں۔ تو ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور عنقریب اللہ بہت بڑا اجر دے گا"۔ (سورۃ انساء، آیت نمبر 146)

منافق کی ایک علامت یہ ہے کہ ان کے اعمال اور عبادت میں اخلاص نہیں ہوتا اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں دعوت دی کہ وہ اپنے طرز عمل کو ترک کر کے خالص اللہ کے لیے اپنے اعمال سرانجام دیں، اپنی ہر قسم کی وفاداری اسلام کے ساتھ وابستہ کریں تو جب ان کا اخلاص اسلام کے مطابق ہو جائے گا تو پھر وہ مسلمانوں میں شمار کئے جائیں گے۔

3-ترجمہ: ''تم فرماؤ کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے عمل تمہارے لیے ہیں اور ہم اس کے لیے مخلص ہیں"۔ (سورۃ البقرہ، آیت نمبر 139)

4-ترجمہ: ''ان کی اکثر سرگوشیوں میں کچھ بھلائی نہیں مگر جو حکم دے خیرات یا اچھی بات یا لوگوں میں صلح کرنے کا اور جو رضائے الٰہی کی خاطر ایسا کرے۔ اسے عنقریب ہم عظیم اجر دیں گے"۔ (سورۃ النساء، آیت نمبر 114)

5-ترجمہ: ''کہ مجھ کو حکم ملا ہے کہ میں خالص خدا ہی کی فرماں برداری کروں اسی کی عبادت کروں"۔ (سورۃ الزمر، آیت نمبر 11)

6-ترجمہ: ''فرمایئے کہ میں تو خدا ہی کا فرماں بردار ہو کر اسی کی عبادت کرتا ہوں"۔ (سورۃ الزمر 14)

7-ترجمہ: ''ہم تمہیں خالص خدا کے لیے کھلاتے ہیں ہمیں تم سے کچھ بدلہ درکار نہیں اور نہ شکر گزاری کے خواستگار ہیں"۔ (سورۃ الدھر، آیت نمبر 9)

8-ترجمہ: ''خدا تک نہ تو ان کے گوشت ہی پہنچتے ہیں اور نہ ان کے خون بلکہ اس تک تمہاری پرہیزگاری پہنچتی ہے "۔ (سورۃ الحج، آیت نمبر 37)

9-ترجمہ: ''کہہ دیجیئے کہ بیشک میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہیں جو سارے جہاں کا پروردگار ہے"۔ (سورۃ الانعام، آیت نمبر 162)

احادیث اخلاص:- اخلاص کے بارے میں رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کے ارشادات حسب ذیل ہیں:

1۔ اچھی نیت اخلاص ہے:- حضرت عمرؓ سے روایت ہے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے ارشاد فرمایا "تمام اعمال نیت کے ساتھ ہیں جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے تو اسے اسی کا ثواب ہے اور جس شخص کی ہجرت دنیا یا کسی عورت کی خاطر ہے تو اس کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی"۔ (بخاری)

2۔ جہاد میں اخلاص کو پیش نظر رکھنے کی تاکید:- حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں رسول اکرم خاتم النبیین ﷺ سے پوچھا گیا "ایک آدمی شجاعت دکھانے، دوسرا قومی غیرت اور تیسرا ریاکاری کی غرض سے لڑتا ہے۔ ان میں سے کون اللہ کی راہ میں جہاد کر رہا ہے"؟ رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "جو صرف اس غرض سے لڑے کہ اللہ کا کلمہ ہی بلند ہو وہ اللہ کے راستے میں مجاہد ہے"۔ (بخاری شریف)

نبی کریم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "قیامت کے دن ایک شخص کو حساب کے لیے لایا جائے گا اس سے پوچھا جائے گا کہ ''تو نے کونسی عبادت کی'' وہ شخص عرض کرے گا'' میں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا میں نے اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کر دی۔ میدان جنگ میں شہید ہوا'' اللہ کا ارشاد ہو گا'' تو نے جھوٹ بولا۔ یہ سب تو نے اس لیے کیا تھا کہ لوگ تجھے بہادر کہیں۔ لوگوں نے تجھے بہادر کہہ دیا۔ پھر حکم ہو گا کہ اسے جہنم میں ڈال دو'' پھر ایک دوسرے شخص کو حساب کے لیے پیش کیا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا'' تو نے کونسی عبادت کی''؟ وہ عرض کرے گا'' یا اللہ میں نے تیری راہ میں اپنا مال خرچ کیا تھا۔ میں زکوٰۃ دیتا رہا۔ صدقہ خیرات کرتا رہا''۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو گا'' تو نے جھوٹ بولا۔ تو نے مال اس لیے خرچ کیا تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں اور تیری تعریف کریں تو لوگوں نے تجھے سخی کہا اور تعریف بھی کی'' پھر حکم ہو گا'' اسے جہنم میں ڈال دو'' تو اسے منہ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر ایک شخص کو حساب کے لیے پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا'' تو نے دنیا میں کونسی نیکی کی؟'' وہ

عرض کرے گا'' یا اللہ میں نے قرآن کا علم حاصل کیا اور بہت تکالیف برداشت کیں، لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتا رہا'' اللہ تعالی کا ارشاد ہوگا'' تو جھوٹ کہتا ہے تو نے علم اس لیے سیکھا کہ لوگ تجھے عالم کہیں اور تیری تعریف کریں۔ پس لوگوں نے تجھے عالم کہا اور تیری تعریف کر دی'' پھر حکم ہوگا کہ'' اسے جہنم میں ڈال دو''۔(صحیح مسلم،سنن نسائی)

3۔قیامت کے روز لوگ اپنی نیتوں پر اٹھائے جائیں گے:۔ ام المومنین ام عبداللہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا'' ایک لشکر کعبۃ اللہ پر چڑھائی کرے گا۔جب وہ چٹیل میدان میں پہنچے گا تو ان کے اگلوں پچھلوں کو زمین میں دھنسا دیا جائے گا'' ام المومنین فرماتی ہیں میں نے عرض کیا'' یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ان تمام کو کیسے دھنسایا جائے گا جبکہ ان میں سے بعض دوکاندار ہونگے اور کچھ ان میں سے نہیں ہوں گے'' آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" ان کے اول و آخر کو دھنسایا جائے گا۔پھر وہ اپنی اپنی نیتوں کے مطابق اٹھائے جائیں گے"۔(بخاری شریف)

4۔اچھی نیت والوں کے لیے فرشتے دعا مانگتے ہیں:۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" نماز با جماعت کا ثواب، بازار یا گھر میں پڑھی جانے والی نماز کے ثواب سے 25 اور کچھ درجے زائد ہے اور یہ اس لیے کہ تم میں سے جب کوئی ایک اچھی طرح وضو کر کے صرف نماز کی نیت سے مسجد میں جاتا ہے، کوئی دوسرا مقصد پیش نظر نہیں ہوتا تو وہ جو قدم بھی اٹھاتا ہے اس کے بدلے میں اس کا درجہ بلند ہوتا ہے اور اس سے ایک گناہ مٹایا جاتا ہے۔یہاں تک کہ وہ مسجد میں داخل ہوجاتا ہے۔مسجد میں داخل ہونے کے بعد جب تک نماز کا انتظار کرتا ہے نماز میں شمار ہوتا ہے اور جب تم میں سے کوئی نماز کی جگہ پر ہی بیٹھا رہتا ہے تو فرشتے اس کے لیے رحمت کی دعا مانگتے ہیں جب تک کہ وہ کسی کو ایذا نہ دے یا بے وضو نہ ہوجائے۔فرشتے کہتے ہیں '' یا اللہ اسے بخش دے'' یا اللہ اس کی توبہ قبول کر''۔(صحیح بخاری شریف)

5۔ایمان اور اعمال کے لیے اخلاص ضروری ہے:۔ ایمان کے لیے اخلاص بہت ضروری ہے کیونکہ اخلاص ہی سے ایمان میں پختگی پیدا ہوتی ہے---ایک صحابی نے رسول اکرم خاتم النبیین ﷺ سے پوچھا'' اے اللہ کے رسول خاتم النبیین ﷺ ایمان کیا ہے"؟ تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا'' اخلاص''۔(بیہقی)

6۔برکات اخلاص:۔ اخلاص میں بہت برکت ہے اس کے بارے میں رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا'' اللہ تعالی اس امت کو ان کے ضعیفوں کی دعاؤں اور ان کی نمازوں، اور ان کے اخلاص کی برکت سے امداد کرتا ہے"۔(نسائی شریف)-----ایک اور حدیث میں رسول اکرم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا کہ:'' اخلاص والوں کے لیے خوشخبری اور مبارک ہو جو ہدایت کے چراغ ہیں انکے ذریعے تمام سیاہ فتنے دور ہوجاتے ہیں''(بیہقی)

اخلاص کی برکت کا ایک واقعہ:۔ رسول اکرم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" پہلے زمانے کے تین آدمی کہیں جا رہے تھے۔رات کا وقت ہوا تو، بارش ہونے لگی ان تینوں نے بارش سے بچنے کے لیے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ اختیار کی، اتفاقاً اوپر سے ایک چٹان پتھر کی گری، جس سے غار کا منہ بند ہوگیا تو ان لوگوں نے کہا" ہم اپنے نیک اور خالص عملوں کے وسیلہ سے اللہ سے دعا کرتے ہیں"۔تو ان میں سے ایک نے کہا" خدایا! میرا گزارہ صرف بکریوں پر تھا، بکریاں چراتا تھا اور ان ہی کے دودھ سے تمام گھر والوں کی پرورش کرتا تھا، چونکہ میرے ماں باپ بہت بوڑھے ہو چکے تھے، اس لیے میں ان سے پہلے کسی گھر والے کو دودھ نہیں پلاتا تھا، بلکہ پہلے ان کو پلاتا پھر بال بچوں کو پلاتا، اتفاق سے ایک روز مجھے درختوں کے پتے لینے کے لیے دور جانا پڑا اور میں اتنی دیر میں واپس آیا کہ والدین سو چکے تھے میں نے حسب دستور دودھ دھویا، والدین کے حصہ کا دودھ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا، تو وہ دونوں سو گئے تھے ادب کیوجہ سے جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ دودھ کا کٹورا میں ان کے سرہانے لے کر کھڑا ہو گیا کہ جب ان کی آنکھ خود بخود کھلے گی تو دودھ خدمت میں پیش کردوں گا۔اس انتظار میں صبح ہوگئی اور میرے بچے رات بھر بھوکے رہے۔جب میرے والدین صبح کو بیدار ہوئے تو دودھ پیا، اے اللہ! اگر میں نے اس کام کو تیری خوشنودی اور تیری رضا کے لیے کیا تو اس چٹان کو ہٹا دے"، چنانچہ اس اخلاص کیوجہ سے وہ چٹان صرف اتنی ہٹی کہ وہ باہر نہیں نکل سکتے تھے۔اب دوسرے کی باری آئی اور دوسرے نے کہا" اے اللہ تو خوب جانتا ہے کہ مجھ کو اپنے چچا کی لڑکی سے محبت تھی اور میں اس سے اپنی خواہش پوری کرنا چاہتا تھا وہ بچتی رہی اور میرے قبضے میں نہیں آئی یہاں تک کہ ایک سال قحط سالی کے زمانے میں معاشی حالت خراب ہوگئی۔بہت مجبور ہوکر وہ میرے پاس آئی اور قرض کی درخواست کی۔میں نے اس کو ایک سو بیس دینار اس شرط پر دیئے کہ وہ پہلے اپنے آپ کو میرے حوالہ کردے اور میری مراد پوری کردے وہ اس کام پر رضامند ہوگئی جب میں ہر طرح اس پر قابو پا چکا اور اس برے کام کے لیے بالکل آمادہ ہوگیا تو اس نے کہا'' اِتَّقِ اللہ'' خدا سے ڈر۔اور ناحق اس مہر کو مت توڑ یہ تیرے لیے حلال نہیں۔میں اس سے ہٹ گیا حالانکہ مجھے اس سے محبت تھی اور ان اشرفیوں کو بھی بلا معاوضہ چھوڑ دیا۔الٰہی! اگر میں نے اس کام کو محض تیری رضامندی کے لیے کیا ہو تو اس چٹان کو ہم سے ہٹا دے جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں"، چنانچہ وہ چٹان کچھ اور ہٹ گئی لیکن نکلنے کے قابل راستہ نہ ہوسکا اب تیسرے کی باری آئی۔اس نے کہا" اے

اللہ میں نے ایک مرتبہ مزدوروں سے کچھ کام لیا سوائے ایک کے سب کی مزدوری دے دی وہ اپنی مزدوری کو چھوڑ کر چلا گیا میں نے اس کی مزدوری کو زراعت پر لگا دیا اور اس سے بہت ترقی ہوئی ایک زمانہ کے بعد وہ مزدور آیا اور اپنی مزوری طلب کی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ سب کچھ اونٹ، گائے، بیل، بکریاں اور غلام وغیرہ سب تیرے ہیں سب لے جا اس نے کہا "اے اللہ کے بندے مجھ سے مذاق نہ کر" میں نے کہا "میں مذاق نہیں کرتا جب اس کو یقین آ گیا تب وہ سب کچھ لے کر چلا گیا۔ اے اللہ اگر میں نے اس کام کو تیری رضامندی کے لیے کیا ہو تو اس چٹان کو ہٹا دے تا کہ ہم باہر نکل سکیں"۔ چنانچہ وہ چٹان ہٹ گئی اور سب باہر نکل آئے۔ (بخاری شریف)

7۔حالت مجبوری میں خلوص نیت کا اجر:- حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ فرماتے ہیں "ایک جنگ میں ہم نبی اکرم خاتم النبیین ﷺ کے ہمراہ تھے کہ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" بے شک مدینہ طیبہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ تم جہاں بھی سفر کرتے ہو کسی وادی سے گزرتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتے ہیں انہیں بیماری نے روک رکھا ہے"۔ ایک روایت میں ہے" مگر وہ ثواب میں تمہارے شریک ہیں"۔ (مسلم شریف)

بخاری نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ فرماتے ہیں ہم نبی اکرام خاتم النبیین ﷺ کے ہمراہ غزوہ تبوک سے واپس لوٹے تو آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" ہمارے پیچھے مدینہ طیبہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ ہم جس گھاٹی اور وادی کو عبور کرتے وہ ہمارے ساتھ ہوتے انہیں مجبوری نے روک رکھا ہے"۔ (بخاری شریف)

ایک غزوہ میں کچھ صحابہ بیماری کے باعث شریک نہ ہو سکے لیکن ان کی نیت تھی کہ اگر وہ تندرست ہوتے تو وہ ضرور شامل ہوتے تو ان کے بارے میں رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "انہیں جہاد میں شامل ہونے کی نیت کا ثواب مل جائے گا"۔

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" دنیا چار قسم کے لوگوں کے لیے ہے **ایک وہ بندہ** جس کو اللہ تعالیٰ نے مال اور علم دیا ہوا اور وہ اس میں اللہ سے ڈرتا ہوا اور صلہ رحمی کرتا ہو اور جانتا ہو کہ اس مال و علم میں اللہ تعالیٰ کا حق ہے (ان دونوں کے حق ادا کرتا رہے) تو یہ افضل المنازل بڑے مرتبے کے لوگوں میں سے ہے۔ **دوسرا وہ ہے** کہ جس کو اللہ نے علم تو دیا ہے لیکن مال سے محروم ہو مگر اس کی نیت سچی ہو کہتا ہو اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں بھی اس طرح اللہ کے راستے میں خرچ کرتا جس طرح فلاں شخص خرچ کرتا ہے تو یہ اپنی خالص نیت کی وجہ سے اور پہلا شخص خرچ کرنے والا دونوں ثواب میں برابر ہیں۔ **تیسرا وہ شخص ہے** جس کو اللہ نے مال دیا ہوا اور علم نہیں دیا تو وہ اپنا مال بے قاعدگی کے ساتھ بے سمجھے بوجھے خرچ کرتا ہو نہ اس میں خدا سے ڈرتا ہو اور نہ حق والوں کے حق ادا کر کے صلہ رحمی کرتا ہو اور نہ اس میں اللہ ہی کے حق کو جانتا ہو بلکہ نڈر ہو کر شراب و کباب، کھیل تماشا اور ناچ گانوں میں اڑاتا ہو تو یہ سب سے بُرے مرتبے والا ہے۔ **چوتھا وہ شخص ہے جس** کو خدا نے نہ تو مال دیا ہو نہ ہی علم وہ کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں فلاں شخص (قسم سوم) کی طرح خرچ کرتا تو وہ اپنی بری نیت کی وجہ سے خود اور اس سے پہلا شخص دونوں گناہ میں برابر ہیں"۔ (ترمذی)

8۔اخلاص کا تعلق دل سے ہے :- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ نہ تو تمہارے جسموں کو دیکھتا ہے اور نہ ہی تمہاری صورتوں کی طرف بلکہ تمہارے دلوں کو دیکھتا ہے"۔ (مسلم شریف)

حکایت :- ایک بزرگ کو کسی نے خواب میں دیکھا اور پوچھا" حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا"؟ بزرگ نے جواب دیا" جو جو کچھ میں نے خالص راہ خدا میں کیا تھا اسے نیکیوں کے پلڑے میں پایا اور جو عمل اخلاص سے خالی تھا اسے یا تو گناہوں کے پلڑے میں پایا یا کہیں نہ دیکھا۔ چنانچہ انار کا ایک دانہ میں نے ایک مرتبہ راہ میں پڑا دیکھ کر اٹھا لیا تھا، اس کو نیکیوں کے پلڑے میں پڑا ہوا دیکھا اور ایک بلی جو میرے گھر میں مر گئی تھی وہ بھی اسی پلڑے میں دھری تھی اور ایک ریشمی دھاگہ جو میں نے اپنی ٹوپی میں ٹانک لیا تھا گناہوں کے پلڑے میں رکھا ہوا پایا لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت سی ہوئی کہ میرا گدھا جس کی قیمت سو دینار تھی اور وہ بھی (بلی کیطرح) میرے گھر ہی مرا تھا مجھے نیکیوں کے پلڑے میں دکھائی نہ دیا۔ آخر میں نے فرشتوں سے پوچھ لیا کہ۔۔۔" کیا وجہ ہے کہ بلی تو نیکیوں کے پلڑے میں ہو اور گدھا کہیں بھی نہ ہو"؟ ارشاد ہوا ''جہاں تو نے بھیجا تھا وہیں پہنچ گیا۔ یاد رہے کہ تو نے اس کے مرنے پر کہا تھا ''لعنت اللہ'' اگر تو اس کی جگہ فی سبیل اللہ کہہ دیتا تو آج اسے بھی نیکیوں کے پلڑے میں دیکھتا" اسی طرح ایک مرتبہ میں نے خدا کی راہ میں صدقہ دیا تھا لیکن معلوم ہوا کہ وہ ضائع ہو گیا۔ کیونکہ نیکیوں کے پلڑے میں وہ بھی موجود نہ تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ ریا کاری میں ضائع ہو گیا۔ تب مجھے یاد آیا کہ ہاں ٹھیک ہے کیونکہ جب میں صدقہ دے رہا تھا تو لوگ دیکھ رہے تھے اور ان کا وہ دیکھنا مجھے بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ ریا کاری سے ضائع ہو گیا"۔ یہ باتیں جب سفیان ثوریؒ نے سنیں تو فرمایا" یہ تو دولت گراں نمایاں ہے جو اس کے ہاتھ آئی یعنی اسے نقصان زیادہ نہ پہنچا لیکن اخلاص ہے بڑی نادر و کمیاب جنس" اور کسی بزرگ کا قول ہے "علم تخم ہے عمل کھیتی ہے اور اخلاص اس کا پانی ہے"۔ (امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ---کیمیائے سعادت)

9۔قتل میں نیت کا انجام:- حضرت ابو بکر ثقفیؓ سے روایت ہے رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" جب دو مسلمان تلواریں لیے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے

ہیں تو قاتل ومقتول دونوں جہنمی ہیں"۔(راوی فرماتے ہیں) میں نے عرض کیا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ قاتل تو واقعی جہنم کا مستحق ہے۔مقتول کا کیا قصور ہے"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا"وہ بھی مقابل کو قتل کرنا چاہتا تھا"۔(مسلم شریف)

حکایت:۔ بنی اسرائیل میں ایک عابد تھا لوگوں نے اس سے کہا" فلاں جگہ پر ایک درخت ہے اور لوگ اس کی پرستش کیا کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے اسے خدا تصور کرلیا ہے"۔عابد کو یہ سن کر بڑا غصہ آیا۔فوراً تبرا اٹھایا اور اٹھ بیٹھا اور کہا" میں تو اس درخت کو جڑ سے اکھاڑ دوں گا"(جس کی وجہ سے لوگ گمراہ ہوئے جارہے ہیں) راستے میں ابلیس ایک بوڑھے کے بھیس میں اس سے ملا اور پوچھا" اے مرد عابد کہاں کے ارادے ہیں"؟ عابد نے کہا" اس درخت کو اکھاڑنے کے لیے جاتا ہوں"۔ابلیس نے کہا(یہ خوب کہی ارے بھائی)" تو عابد آدمی ہے جا اور حق تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہ۔تجھے وہی کام جچتا ہے اور اسی میں تیری بہتری بھی ہے"۔عابد نے کہا" خیر اس وقت تو میری عبادت یہی ہے کہ اس درخت کا نام ونشان مٹاؤں"۔ابلیس نے کہا"(اچھا یہ بات ہے) تو پھر میں دیکھتا ہوں کہ تو کیسے جاتا ہے"؟ یہ کہہ کر عابد سے گتھم گتھا ہو گیا۔عابد نے اسے زمین پر دے مارا اور اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھا۔ابلیس نے کہا" اگر تو مجھے چھوڑ دے تو ایک پتے کی بات تجھے بتاؤں"۔عابد نے اسے چھوڑتے ہوئے کہا" کہو کیا کہتے ہو"؟ ابلیس نے کہا" سنو اے مرد عابد! اگر اس درخت کو کٹوانا ایسا ہی ضروری ہوتا تو کیا پیغمبر وقت موجود نہیں؟ اور کیا حق تعالیٰ انہیں یہ حکم نہیں دے سکتا تھا کہ اس درخت کو اکھاڑ دیا جائے؟ یہ حکم ہوتا تو وہ ضرور اکھاڑ بھی چکے ہوتے۔تجھے اس بات کا حکم ہی کب دیا گیا ہے۔(جو اس قدر بے قرار ہوا جاتا ہے) پس اس ارادے سے باز آ"۔عابد نے کہا" ہرگز نہیں میں ضرور یہ کام کروں گا"۔ابلیس نے کہا" اچھا تو جانے میں بھی نہیں دوں گا"۔اور پھر لڑائی میں الجھ گئے۔عابد نے پھر اسے چاروں شانے چت گرادیا(اور اوپر ہو بیٹھا) ابلیس نے کہا" اگر اب کی بار چھوڑ دے تو ایک اور بات تجھے سمجھاؤں۔اگر پسند نہ آئے تو جو تمہارے دل میں آئے کرتے رہنا"۔عابد نے چھوڑ دیا تو ابلیس نے کہا" اے عابد اگر تو ایک درویش آدمی ہے۔لوگ تیری خدمت کرتے رہتے ہیں، تیرے پاس اگر کچھ مال پڑا ہوتو دوسرے عابدوں کے حوالے کر دے کہ ان کے کام آئے(اور تجھے مفت کا ثواب حاصل ہو) اس درخت کے کاٹنے میں کیا دھرا ہے؟ ان لوگوں کو تو درخت ہی کی پرستش کرنا ہے۔تو کاٹ دے گا تو ان کا کچھ نہ بگڑے گا وہ اور درخت لگالیں گے۔پس چھوڑ اس خیال کو اور میں تجھے قول دیتا ہوں کہ ہر روز تیرے سرہانے دو دینار رکھ جایا کروں گا"۔عابد نے یہ سن کر دل میں سوچا کہ ٹھیک ہی تو کہتا ہے" میں ایک دینار راہ خدا میں صدقہ کر دیا کروں گا اور دوسرا اپنے کام میں لاتا رہوں گا"۔یہ بات اس درخت کے کاٹنے سے واقعی بہتر اور معقول ہے۔اور پھر واقعی مجھے حق تعالیٰ کی طرف سے اس کام پر مامور بھی تو نہیں کیا گیا۔میں پیغمبر تھوڑا ہوں کہ اس درخت کا اکھاڑنا میرے فرائض میں شامل ہو۔سوچ بچار کے بعد عابد واپس گھر کی طرف چل دیا۔اگلے روز صبح ہی صبح دو دینار سرہانے سے مل گئے دوسرے دن بھی اور تیسرے دن بھی یہ سلسلہ جاری رہا اب تو بہت ہی خوش ہوا کہ اچھا ہوا اس درخت کے کاٹنے سے باز رہا۔لیکن (یہ خوشی دیرپا ثابت نہ ہوئی کیونکہ) چوتھے دن اسے کچھ نہ ملا۔اس پر وہ سخت طیش میں آیا، پھر کلہاڑا لے کر درخت کاٹنے چلا۔ابلیس پھر راستے میں آ گیا اور پوچھا" آج پھر کدھر جاتے ہو"؟ عابد نے کہا" درخت کاٹنے جاتا ہوں"(اور کہاں جاؤں گا) ابلیس نے کہا" تو جھوٹا ہے اور خدا کی قسم اس درخت کو اکھاڑنا تیری طاقت سے باہر ہے"، پھر دونوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔لیکن اس مرتبہ شیطان نے فوراً ہی عابد کو پچھاڑ دیا اور اسے اس طرح مغلوب کرلیا کہ عابد بیچارہ اس کے ہاتھ میں ایک چڑیا کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔تب ابلیس نے کہا" کہو اب واپس جاتے ہو یا ابھی بکری کی طرح تمہارا سر کاٹ کر پھینک دوں"؟ عابد نے کہا" مجھے چھوڑ دے میں واپس چلا جاتا ہوں۔لیکن مجھے اتنا بتا دے کہ اس سے پہلے دو مرتبہ میں کیوں اتنی جلدی تجھے مغلوب کرلیتا تھا اور اس مرتبہ اتنی آسانی سے تو غالب آ گیا"؟ ابلیس نے کہا" بات یہ ہے کہ پہلے دونوں مرتبہ تیرا غصہ حق تعالیٰ کے لیے ہوتا تھا اس لیے حق تعالیٰ مجھے تیرے ہاتھوں مغلوب کر دیتا تھا کیونکہ ایسے کسی بھی شخص پر مجھے قابو حاصل نہیں ہوتا جو خالص اللہ کی راہ میں کوئی کام کر رہا ہو لیکن جو شخص اپنی خواہش کی متابعت میں کوئی کام کرے وہ مجھ سے کیا مقابلہ کرے گا؟ چنانچہ اس مرتبہ تیرا غصہ تیری اپنی ذات کے لیے تھا اور دینار کی خاطر تو آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا، لہٰذا حق تعالیٰ نے تجھے میرا مسخر کر دیا"۔(امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ---کیمیائے سعادت)

10۔نیت کا ثواب:۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے نبی کریم خاتم النبیین ﷺ سے نقل کرتے ہیں" بے شک اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھ دیں پھر انہیں بیان کیا پس جو آدمی نیکی کا ارادہ کرے لیکن اس پر عمل پیرا نہ ہو۔اللہ تعالیٰ اس کے نامہ اعمال میں ایک پوری نیکی(کا ثواب) لکھتا ہے۔اور اگر ارادے کے ساتھ عمل بھی کرے تو دس سے سات سو گنا بلکہ اس سے بھی کئی گنا زیادہ نیکیوں کا ثواب لکھا جاتا ہے اور اگر برائی کا ارادہ کرے لیکن عملی جامہ نہ پہنائے تو اللہ تعالیٰ اپنے ہاں اس کے لیے ایک کامل نیکی(کا ثواب) لکھتا ہے اور اگر ارادہ کے بعد عمل بھی کرے تو اللہ تعالیٰ صرف ایک برائی تحریر فرماتا ہے"۔(بخاری شریف)

11۔اللہ کی رضا:۔ حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، فرماتے ہیں" حجۃ الوداع کے موقع پر رسول پاک خاتم النبیین ﷺ میری عیادت کے لیے

تشریف لائے مجھے سخت درد تھا۔ میں نے عرض کیا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ! میری بیماری (شدت اختیار کرچکی ہے) جیسا کہ آپ خاتم النبیین ﷺ ملاحظہ فرما رہے ہیں صاحب مال ہوں اور ایک لڑکی کے سوا میرا کوئی وارث نہیں کیا میں دو تہائی مال صدقہ کردوں"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''نہیں''، میں نے عرض کیا''یا رسول اللہ خاتم النبیین ﷺ نصف (کی اجازت ہے)"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا''نہیں''، میں نے عرض کیا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ ایک تہائی"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا"ایک تہائی ٹھیک ہے اور تہائی بھی زیادہ ہے۔ تمہارا اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑنا ان کو نادار چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے پھریں۔ بلاشبہ تم جو کچھ اللہ تعالی کی رضا جوئی کی خاطر خرچ کرو اس کا ثواب پاؤ گے۔ یہاں تک کہ بیوی کے منہ میں لقمہ ڈالو تو اس کا بھی اجر ہے فرماتے ہیں"- میں نے عرض کیا" یارسول اللہ خاتم النبیین ﷺ کیا میں اپنے دوستوں سے پیچھے رہ جاؤ نگا"؟ آپ خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا" اگر تم پیچھے رہو تو اس صورت میں اللہ کی رضا جوئی کے لیے جو عمل کرو گے اس سے تمہارا درجہ بلند ہوگا۔ امید ہے کہ تم پیچھے رہو گے اور لوگ تمہاری زندگی سے فائدہ اٹھائیں گے اور کچھ لوگ تکلیف سے دوچار ہوں گے"-(پھر دعا مانگی)" یا اللہ میرے صحابہ کرام کی ہجرت کو پورا فرما اور شکست سے دوچار نہ کر البتہ سعد بن خولہ کی حالت قابل رحم ہے''۔ نبی کریم خاتم النبیین ﷺ کا حضرت سعد بن خولہ کے لیے اظہار شفقت اس وجہ سے تھا کہ وہ مکہ مکرمہ میں فوت ہوئے۔(بخاری شریف)

حدیث:- سرکار دوعالم خاتم النبیین ﷺ نے فرمایا"ایک شخص اپنے دوست کی ملاقات کے لیے دوسرے گاؤں کو روانہ ہوا۔ راستے میں اسے ایک فرشتہ ملا۔ فرشتے نے پوچھا" کہاں جانے کا ارادہ ہے"؟ وہ شخص بولا''فلاں بھائی کی ملاقات کے لیے جارہا ہوں'' فرشتے نے پوچھا''کیا تجھے اس سے کوئی حاجت ہے"؟ اس نے کہا" نہیں"۔ فرشتہ بولا'' آیا تیری اس سے کوئی قرابت (رشتہ داری) ہے"- اس نے کہا" نہیں"۔ فرشتے نے دریافت کیا'' پھر تیرے اس کے پاس جانے کی کیا وجہ ہے''؟ اس نے کہا ''مجھے اس کے ساتھ محض اللہ کی خاطر محبت ہے (کہ وہ اللہ کا نیک بندہ ہے) اور میں اللہ (کی رضا کے لیے) جارہا ہوں''-فرشتے نے اسے بشارت دی''مجھے اللہ نے تیرے پاس بھیجا ہے تاکہ میں تجھے خوشخبری سناؤں کہ اللہ نے تجھے اپنا دوست بنالیا اور تجھے جنت عطا کردی''-(مسلم شریف)

حکایت:- حضرت جنید بغدادیؒ کا شمار اولیاء اللہ کے سرداروں میں ہوتا ہے۔ آپ علم شریعت وطریقت اور معرفت وحقیقت کے آداب واصول سے واقف تھے۔ ہزاروں گمراہوں نے آپ کے ذریعہ راہ ہدایت پائی اور اپنی زندگی کو احکام الٰہی کے مطابق بنایا۔ آپ کا دن دین کی تعلیم اور راتیں اللہ کی عبادت میں بسر ہوتیں۔ ایک رات تہجد کی نماز کے بعد اللہ سے دعا کی" یاالٰہی! مجھے بتادے کہ جنت میں میرا ساتھی اور مصاحب کون ہوگا"؟ جواب ملا" فلاں چرواہا"۔ حضرت جنید حیران رہ گئے۔ صبح ہونے کے بعد اس چرواہے کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور جب اس سے ملاقات ہوگئی تو دو تین دن اس کے ساتھ رہے اس کا حال دیکھنے کے بعد ایک دن حضرت جنید بغدادیؒ نے اس چرواہے سے دریافت کیا" بھائی میں نے تو دیکھا ہے کہ سوائے پنج وقتہ نماز پڑھنے کے تم ایسا کوئی کام نہیں کرتے جو اس قدر قبولیت کا باعث ہو۔ شاید یہ بلند درجہ تمہیں تمہارے کسی باطنی معاملے کیوجہ سے ملا ہے"؟ چرواہا مسکرایا اور کہا''خواجہ جنیدؒ میں ایک جاہل آدمی ہوں، میں نہیں جانتا کہ معاملہ کس کو کہتے ہیں؟ اور باطن کیا ہوتا ہے؟- میں تو ایک سیدھا سادہ مسلمان ہوں البتہ میرے اندر دو خصلتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر اللہ ان سب پہاڑوں کو سونے کا کردے اور انہیں میرے قبضے میں دے دے اور پھر یہ سب میرے ہاتھ سے جاتے رہیں تو مجھ کو ان کے چلے جانے کا کوئی رنج وغم نہ ہوگا۔ دوسرا یہ کہ کوئی میرے ساتھ وفا کرے یا جفا میں اس سے کوئی اثر قبول نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہو رہا ہے۔ بندہ بیچارہ تو صرف ایک ظاہری سبب ہے۔ خواجہ جنیدؒ میں نے اپنا کام اپنے محبوب رب کے حوالہ کردیا ہے۔ خواہ وہ مجھے اب زندہ رکھے یا مار ڈالے۔ اس کی مرضی پر راضی ہوں''۔ چرواہے کا جواب سن کر جنیدؒ کی سمجھ میں آ گیا کہ اسے کیوں جنت میں جنیدؒ کا مصاحب بنایا گیا ہے۔ کیونکہ جس کی نیت میں خلوص ہو اس کے سامنے صرف رضائے الٰہی ہوتی ہے۔

ابو یعقوبؒ موسیٰ کا قول ہے" جب تک لوگ اپنے اخلاص میں اخلاص دیکھتے رہیں گے یعنی (اخلاص کا دعویٰ رہے گا) انکا وہ اخلاص سدا خلوص کا محتاج رہے گا"۔ حدیث مسلم ہے کہ''بہت سارے نیک پاک لوگ جنت میں لے جائے جارہے ہوں گے پروردگار کہے گا" ان تمام مہماتماؤں کو جہنم میں پھینک دو"۔ ملائکہ بڑی انکساری سے عرض کریں گے''پروردگار ان کے نامہ اعمال میں نیکیاں لکھ لکھ کر ہم نے کاغذ ختم کردیئے ہیں''۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا''میرے اور بندے کا ایک معاملہ ہے جو صرف میں ہی جانتا ہوں اور وہ اخلاص ہے''۔ یاد رکھیں کہ: خلوص نیت کے ساتھ کام کرنے سے دین ودنیا میں کامیابی حاصل ہوتی ہے، اہل اخلاص سے ہر کوئی محبت کرتا ہے۔

اخلاص ہی وہ واحد قدر ہے کہ جو انسان کو یقین کے ساتھ ساتھ اللہ کی معرفت کی طرف آگے بڑھا سکتی ہے۔

****

مُصنِّفہ کی تمام کُتُب

خاتم النبیین ﷺ مِحبُوبِ ربُّ العٰلمین	خاتم النبیین ﷺ مُحسنِ اِنسانیت	مقصدِ حیات	عبدیّت کا سفر ابدیّت کے حصُول تک
تعلُّق مع اللہ	مُختصراً قُرآنِ پاک کے علُوم	راہِ نجات	فلاح
اہلِ بیت اور خاندانِ بنُو اُمَیّہ	ثواب و عتاب	تُو ہی مُجھے مِل جائے (جِلد۔۱)	تُو ہی مُجھے مِل جائے (جِلد۔۲)
مُختصِرتذکرئہ انبیاءکرامؑ، صحابہ کرامؓ و آئمہ کرامؒ	اولیاءکرامؒ	کتاب الصلوٰۃ وَ اوقاتُ الصّلوٰۃ	عشرہ مُبشرہؓ اور آئمہ اربعہؒ
حیاتِ طیّبہ	آگہی	اِسلام عالمگیر دِین	عقائد واِیمان
دِینِ اِسلام (بچّوں کےلئے)	کتابِ آگاہی (تصحیح العقائد)	تصوُّف یا رُوحانیت (جِلد۔۱)	تصوُّف یا رُوحانیت (جِلد۔۲)